

راجہ گدھ

بانو قدسیہ





یہ تیسرے پیریڈ کا واقعہ ہے

ایم اے کی ساری کلاس حاضر تھی۔ لڑکیاں ہم سے اگلی قطار میں بیٹھی تھیں۔۔۔۔۔
۔ ان چولستانی ہر نیوں میں وہ سب سے آخری تھی۔۔۔۔۔ اکتوبر کا دن تھا جس طرح
بھٹی سے نکل کر مکئی کے دانے سفید پھولے ہوئے بڑے اور ٹھنڈے نظر آتے ہیں
ایسے ہی اکتوبر کا یہ دن تھا، بڑا پھولا ہوا اور سفید۔۔۔۔۔ اس سے پہلے کے تمام دن بھٹی
دیدہ گرم تھے۔ لیکن یہ دن سفید سفید دھوپ میں کچھ پھولا پھولا بڑا بڑا نظر آتا تھا۔
کچھ دنوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ گھڑیوں کے تابع نہیں رہتے اپنی گنجائش اور
سمائی کے مطابق گزرتے ہیں

پرفیسر سہیل نے نئی کار جیسی اس لڑکی کی طرف نظریں اٹھا کر سوال کیا۔ ”اپنا
تعارف کرائیے!“

داخلے کے دن سے لے کر اب تک ہم اس کے نام کے متعلق کئی قیافے لگا چکے
تھے۔ چولستانی ہر نی اٹھی اس نے کرسی پر ایسے بازو رکھا جیسے موٹر سائیکل کے سہارے
کھڑی ہو۔

”سر میرا نام سیمی شاہ ہے، میں نے کنیر ڈکالچ سے بی اے کیا ہے اور میرے
سبکٹ سائیکولوجی اور ہسٹری تھے۔“

پہلی مرتبہ تمام طلبہ اپنے آپ کو باتنی کلاس سے باضابطہ طور پر متعارف کرا رہے
تھے، اس سے پہلے فرزانہ، انجیلا، طیبہ اور کوثر تعارف کر چکی تھیں۔ لیکن یہ تمام لڑکیاں
چہرے مہرے اور لباس سے اسی لگتی تھیں، جنہوں نے اخباری کاغذوں پر چھپے ہوئے
نوٹس رٹ رٹ کر بی اے کیا ہو۔ کوثر کے علاوہ ان لڑکیوں کی جنرل ناچ اور علمی
استعداد کو رس کی کتابوں تک محدود تھی۔

کوثر حبیب اور سیمی شاہ ہماری کلاس کی آنکھیں تھیں۔ جگہ گاتی روشن۔۔۔۔۔ دعوت

سے بھری ہوئی۔ لیکن کوثر حبیب متاثر کرنے سے پہلے بیک گنیر لگاتی تھی۔ پسپا کرنے سے پہلے خود ہار جانے کی عادی تھی۔ اس کے جسم اور ذہن کی بناوٹ ہی ایسی تھی، جیسے بہت خوبصورت بلب روشن ہو، لیکن بار بار بجلی کا فیوز اڑ جانے کی وجہ سے روشنی میں توازن نہ رہے

اور سیمی شاہ؟۔۔۔۔۔

وہ گلبرگی معاشرے کی پیداوار تھی۔ اس وقت اس نے موری بند جینز کے اوپر وائل کا سفید کرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں حائل مالا نمالاکٹ ناف کو چھو رہا ہے۔ کندھے پر لٹکنے والے کینوس کے تھیلے میں غالباً نقدی، لپ سٹک، ٹشو پیپر تھے۔ ایک ایسی ڈائری تھی، جس میں کئی فون نمبر اور برتھ ڈے کے دن درج تھے ایک دو ایسے قیمتی پن بھی شاید موجود ہوں گے جن میں سیاہی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بال پوائنٹ مانگ کر لکھا کرتی تھی اس کے سیاہ بالوں پر سرخ رنگ غالب تھا۔ اکتوبر کے سفید دن کی روشنی میں اس کے بال آگ پکڑنے ہی والے تھے۔ وہ بالکل میرے سامنے تھی اور اگر میں میں چاہتا تو اس کے کندھوں پر سلیقے سے جھے ہوئے بالوں کو چھو سکتا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح اس کے کرتے کے نیچے سے اس کی باڈس کا لاسٹک، ہک اور اوپر جانے والی طنابوں کو دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا۔

بھری پستول سے کبھی میں اس طرح خائف نہیں ہوا۔

لڑکوں کی قطار میں پہلا لڑکا آفتاب تھا

جب سیمی شاہ اپنا تعارف کروا چکی تو آفتاب اٹھا، امریکی فلوں کا چڑھتا سورج آہستہ آہستہ۔۔۔ موسیقی اور لے کے ساتھ۔۔۔ روشن کرتا ہوا۔۔۔ گرمی پھیلاتا ہوا۔۔۔ اس سکس ملین ڈالر مین نے بھاری آواز میں کہا۔۔۔ ”میرا نام آفتاب بٹ ہے سر۔ میں اس کالج کا ہی اولڈ سٹوڈنٹ ہوں آپ مجھے خوب جانتے ہیں سر۔“

پروفیسر سہیل نے اپنی آنکھوں پر سے چشمہ اتار کر کہا۔۔۔۔۔ ”لیکن تمہارے ہم جماعت شاید تمہیں نہیں جانتے۔“

آفتاب نے پہلے لڑکیوں کی قطار پر کرنیں ڈالیں پھر ڈسکس پھینکنے والوں کی طرح تھوڑا پاؤں پر گھوما اور لڑکوں کو مخاطب کر کے بولا۔۔۔ ”پچھلے سال میں یونین کا صدر تھا بی اے میں میرے سبکٹ سائیکالوجی اور سوشیالوجی تھے۔ میں اگر خود پسندی اور فلموں کا شوقین نہ ہوتا تو شاید بی اے میں ٹاپ کرتا۔ لیکن مجھے فیسٹ نہ آنے کا کچھ خاص افسوس بھی نہیں ہوا کیونکہ جوڑکی پنجاب میں فیسٹ آئی ہے وہ مجھ سے نوٹس لے کر پڑھتی رہی ہے ویسے میری Reputation والدین کے خوف سے اور اللہ کے فضل سے اچھی ہے۔“

ساری کلاس ہنس دی۔ لڑکوں میں سے کسی دل جلے نے نعرہ لگایا۔ ”میاں مٹھو میاں مٹھو۔۔۔۔۔“

تعارف جاری رہا۔۔۔۔۔

پانچ لڑکوں اور پندرہ لڑکے جب تعارف کروا چکے تو فضا حالات زندگی اور ناموں سے بوجھل ہو چکی تھی۔ شاید اس کے بعد کلاس ختم ہو جاتی اور جمائیاں شروع ہوتیں لیکن اس کے بعد ڈاکٹر سہیل نے میز پر سے چاک اٹھایا۔ بلیک بورڈ پر ایک بڑا ساسر بڑی بڑی مونچھیں چھوٹے دھڑ اور بڑے بڑے بوٹوں والا ایک کاکم فکر بنایا۔ پھر اس کی آنکھوں پر چوکور فریم کی عینک پہنائی۔ فریاد کے انداز میں پھیلے ہوئے بازو کھینچے۔۔۔۔۔ اور نیچے لکھا۔

”اٹ ازمی۔۔۔۔۔ ڈاکٹر سہیل۔۔۔۔۔ میں آپ کو شاید سوشیالوجی پڑھاؤں گا۔“

بلیک بورڈ پر تصویر بنانے والا پروفیسر ہم سے بمشکل پانچ چھ سال بڑا تھا لیکن کہیں اس کے پاس ایک ایسا ہنٹر موجود تھا جو شیروں کو سدھارنے والے استعمال کرتے

ہیں اسے کبھی کورس پڑھانا نہ آیا۔ لیکن وہ ذہنوں کا جوڈو کھیلنا جانتا تھا۔ نظریات کی کشتی کرانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے شاگردوں کی کھوپڑیاں کھولنا اور خالی پا کر انہیں جوں کی توں بند کر دینا اسے جی سے پسند تھا۔ الی ہوئی زبانیں آزاد کرا کے طوطے کی طرح باتیں کرانا اور ریڈیو کی مسلسل زبان بولنے والوں کو چپ کرانے کا فن بھی صرف اسے آتا تھا خوب آزادی برتا اور ہر طرح کی آزادی دیتا۔ کوئی بات کبھی اسے شک نہ کر سکی سوشیالوجی کے ساتھ ساتھ اسے دنیا کا ہر سبکٹ آتا تھا۔ سی لیے اس کی موجودگی میں فضا تعلیمی تفع سے ہمیشہ پاک رہتی اور طالب علم ایک دوسرے کی تشخیص میں زیادہ غلطیاں نہ کرتے۔

پروفیسر سہیل نے اپنی گدی پر دایاں ہاتھ رکھا اور میز پر ذرا سا چونتر اجماع کر بولا۔ ”میں عمر اور تجربے میں آپ لوگوں سے بہت بڑا نہیں ہوں لیکن چونکہ میری شادی نہیں ہوئی اس لیے مجھے پیار کرنے کے لیے صرف کتابیں ملی ہیں۔ ابھی تک میرا Passion کتابیں ہیں۔ کلاس میں کبھی کبھی آپ لوگ کچھ ایسے سوال کریں گے جن کا جواب مجھے نہیں آتا ہوگا۔ اور میں بد قسمتی سے اتنا متکبر ہوں کہ سب کچھ برداشت کرتا ہوں کسی اور کی علمی برتری برداشت نہیں کر سکتا اس لیے I warn you جب تک آپ میری کلاس میں رہیں ہمیشہ مجھے گرو سمجھیں۔ میرے علم کو زیادہ مانیں کبھی کبھی یہ بالکل Shallow ہوگا آپ خود بات کی تہہ کو بہتر سمجھتے ہوں گے لیکن مجھے اس بات کا احساس دلا کہ آپ کو نقصان ہوگا۔ میری چھاتی چھوٹی ہو جائے گی میں اپنی Whiskers منادوں گا اور میری بلٹ ڈھیلی ہو جائے گی۔ کون کون چاہتا ہے کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہو جاؤ ہاتھ اٹھائیے۔۔۔“ سوائے آفتاب کے کسی نے ہاتھ نہ اٹھایا۔

”بھلا کیوں مسٹر آفتاب آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں احساس کمتری میں مبتلا

ہوں۔“

”سراسر لیے کہ آپ پہلے سے احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ صرف ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“

قہقہوں میں سب سے اونچا قہقہہ پروفیسر ہیل کا تھا۔

اب کمرے میں تثلیث بن گئی لڑکیوں کی قطار کے آخر میں سیسی شاہ لڑکوں کی ٹکڑی کے سرے پر آفتاب بٹ۔۔۔۔ اور ان دونوں کے نقطۂ اتصال پر پروفیسر ہیل۔۔۔ گفتگو ان تینوں کے درمیان جاندار سرکٹ کی طرح چلنے لگی۔

ہنسی کے ختم ہونے پر پروفیسر ہیل پھر گویا ہوا۔۔۔۔ ”میرے پاس فی الحال موٹر سائیکل ہے کسی لڑکے کو ضروری کام ہو تو وہ مجھ سے چابی مانگ سکتا ہے۔ لیکن جو وعدے کے مطابق موٹر سائیکل واپس نہیں کرے گا وہ دوبارہ اپنے اس حق کو استعمال نہیں کر سکتا اگر کوئی لڑکی بس شاپ پر کھڑی ہو اور ہاتھ دے کر مجھے روکے میں سے لفٹ دوں گا لیکن اگر وہ مجھے موٹر سائیکل موڑنے کو کہے گی تو میں اسے اتار دوں گا۔۔۔۔ اب آپ سب مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے پاس کیا کچھ ہے؟۔۔۔۔ جو آپ دوسروں کے ساتھ Share کر سکتے ہیں اور کس حد تک۔۔۔۔“

”پن۔۔۔۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”سائیکل۔۔۔۔ کبھی کبھی۔۔۔۔“

”ٹشو پیپر۔۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔۔“

”نوٹس۔۔۔۔ امتحان کے بعد۔۔۔۔“

”لپ سٹک۔۔۔۔“ سیسی شاہ بولی۔

”فلائننگ کس۔۔۔۔“ آفتاب نے جواب دیا۔

”گڈ ویری گڈ۔۔۔۔“ مجھے پتا چلا کہ ہماری کلاس سوشیالوجی کی کلاس کا جی این

پ کافی ہے اور ہم اس اعتماد کر کے آسانی سے آگے چل سکتے ہیں۔ بانی دی وے کیا آپ لوگ کچھ سمجھتے ہیں فرد اور معاشرے کا آپس میں یا رشتہ ہے؟ فرد کی آواز بڑی

ضروری چیز ہے۔۔۔۔۔ لیکن کیا کبھی یہ بھی ممکن ہوگا کہ معاشرہ بھی اپنی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائی اور پھر بھی قائم رہے۔۔۔۔۔؟“

اب پروفیسر کی شکل بوڑھی ہو گئی۔۔۔۔۔ اپنے موٹر سائیکل جتنی پرانی۔۔۔۔۔ ہمیں معلوم بھی نہ ہو سکا کہ لیکچر شروع ہو گیا ہے۔

پروفیسر سہیل بڑی چابک دستی سے فرد اور معاشرے کے باہمی ربط کو زیر بحث لا رہا تھا۔ لیکن کچھ ایسے باری باری گیند ہم سب کے کورٹ میں پہنچتا کہ ہم اپنی پوری ذہنی قوت کے ساتھ اسے پروفیسر کے کورٹ میں لوٹا دیتے۔ دیکھتے دیکھتے چہرے متمنا نے لگے۔ آوازیں تیکھی ہو گئیں۔ ہاتھ ہوا میں چلنے لگے۔ لڑکیاں جو نمازیں نیت کر بیٹھیں ہوئی تھیں سوئے کے ساتھ برف توڑتی نظر آنے لگیں۔ بات فرد اور معاشرے سے ہو کر اب دور جانکی تھی۔ اور ہم سویڈن تھائی لینڈ، روڈیشیا، میکسیکو، یوگینڈا کے مختلف معاشروں کا مقابل کرتے کرتے کبھی فرد کی محرومی کے متعلق سوچ رہے تھے اور کبھی معاشرے کی بے چارگی پر افسوس کر رہے تھے۔

پھر سیسی شاہ اٹھی اور بولی۔۔۔۔۔ ”سر آپ کا کیا خیال ہے اگر معاشرہ Ideal ہو تو کیا کوئی فرد کبھی خودکشی کر سکتا ہے؟“

پروفیسر نے اپنے چہتے کیسے سر میں انگلیاں ڈبوئیں پھر سوال کو لڑکوں کی قطار میں پھینک دیا۔ لڑکوں کی قطار سے جب کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو پروفیسر نے کہا ”دراصل خودکشی ایک Symptom ہے کسی معاشرے کے اندر اگر کوئی ہیرو میٹر فٹ کیا جائے تو خودکشی اس کا آخری درجہ حرارت ہوگا۔ افسوس مس شاہ ابھی کوئی آدرشی سوسائٹی ایسی نہیں بن سکی اس لیے ہم تجربہ نہیں کر سکتے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کا پریشر پاگل پن کو جنم دیتا ہے اور پاگل پن ہی خودکشی کا باعث ہے۔“

اس کے بعد وہ ڈر خائم کے حوالے سے دیر تک بات کرتا رہا۔ ہم سب ایسی عمر میں تھے جب خودکشی سے ایک روحانی اور روحانی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے ایسی

وجوہات کا جائزہ لیا گیا جن کی وجہ سے فرد خودکشی پر مائل ہوتا ہے۔ اقتصادی معاشرتی شخصی، ذاتی وجوہات۔۔۔۔۔ بالآخر بار خودکشی سے کھسک کر داغی امراض اور پاگل پن کی طرف مڑ گئی۔ کیونکہ خودکشی نتیجہ تھی وجہ نہیں تھی۔ اصلی وجہ وہ دیوانہ پن تھا جس کی بنا پر انسان کئی احمقانہ اقدامات اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

انجیلا شروع سے آخر تک خاموشی سے بیٹھی رہی۔ پروفیسر سہیل کے ساتھ ساتھ فرزانہ طبیہ اور کوثر بہت گرم جوشی سے بحث میں حصہ لے رہی تھیں۔ لیکن یہاں پر ان کی بولتی بند ہو گئی۔

سہیل پروفیسر بولا۔۔۔۔۔ ”آپ لوگوں نے فرد اور معاشرے کی کشمکش کو بہت خوبی سے سمجھا ہے اور بہت سے صحیح نتیجے اخذ کیے ہیں۔ مس فرزانہ ٹھیک کہتی ہیں کہ معاشرے کا پھندا جب فرد کی گردن پر بہت تنگ ہونے لگتا ہے تو کبھی کبھی فرد موت سے پہلے خود اپنے فیصلے سے مرنا پڑتا ہے۔ کوثر نے خودکشی کی ان گنت وجوہات کو ایسے بیان کیا ہے کہ اس میں ایک نئی دریافت کی سی تازگی پیدا ہو گئی۔ لیکن اب میں آپ لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وچیں خودکشی کا فعل جسے آپ سب متفقہ طور پر پاگل پن پر۔۔۔۔۔ وجہ پر نتیجے پر نہیں پاگل پن کی اصلی وجہ کیا ہے۔۔۔۔۔ یاد رکھئے پاگل پن جس قدر ششدر کرنے والی حالت ہے اسی طرح پاگل پن پیدا کرنے کی وجہ کو بھی حیران کن ہونا چاہیئے۔“

اب ہماری لڑکوں کی ٹیم اس بحث میں لنگوٹے کس کر داخل ہوئی۔

”پاگل پن کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو Functional وجہ ہو سکتی ہے سر کہ بچہ پیدائشی طور پر نامکمل ہو۔۔۔۔۔ دوسری وجہ نفسیاتی ہو سکتی ہے۔“

”اور گہرا دیکھئے ان وجوہات کے علاوہ شاید کوئی اور وجہ بھی ہو۔“

اب تک آفتاب نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا تھا۔ یہ کشمیری بچہ سفید رنگ کی پیننگ میں برتھ ڈے گفٹ کی طرح سجا سجا یا پڑا تھا۔ آفتاب کی یہ عادت بعد میں

ہمیں پتہ چلی کہ جہاں مسکراہٹ سے کال چل جاتا وہاں وہ ایک لفظ نہ ضائع کرتا۔
 جہاں لفظ سے عندیہ پورا ہو جاتا وہاں وہ جملے کو استعمال نہ کرتا۔ جہاں مختصر بات
 کافی ہوتی وہاں وہ لمبی بحث میں نہ پڑتا۔ وہ عموماً پوائنٹس میں بات کرنے کا عادی
 تھا۔

انگلیوں پر گنتا جاتا۔۔۔ ایک۔۔۔ نمبر دو۔۔۔ نمبر تین۔۔۔ اور زیادہ
 وقت اسے نمبر تین سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایم اے کی کلاس میں
 آفتاب کی سب سے لمبی گفتگو تھی۔

آفتاب اٹھا اس نے اپنے دونوں بازو صلیب کی طرح اٹھائے آدھی آستین والی
 قمیض میں اس کے دونوں بازو سنہری گھاس سے اٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی
 سے آئے والی روشنی اس کی براؤن آنکھوں میں چمکتے شہد جیسی روشنی پیدا کر رہی تھی
 اور اس وقت وہ اولمپک کھیلوں میں آگ مشعل اٹھانے والے کھلاڑی کی طرح
 خوبصورت، کنوارہ اور مقدس نظر آ رہا تھا۔ شاید اسی لمحے یسی نے اس کی طرف دیکھنے
 کی غلطی کی اور دیوانی ہو گئی۔

”پاگل پن ہمیشہ نا آسودہ آرزوؤں سے پیدا ہوتا ہے سر۔۔۔ اور نا آسودہ
 آرزوئیں ان Taboos سے جنم لیتی ہیں۔ جو ہر کچھ میں موجود رہتی ہیں۔ جس کچھ
 میں ماموں زاد بہن سے شادی نہیں ہو سکتی وہاں ماموں زاد بہن کے عشق لا حاصل
 سے دیوانگی پیدا ہو سکتی ہے۔“

”فرائیڈ سے مستعار لینے کا شکریہ۔۔۔ یسی نے قینچی جیسی تیکھی انگریزی میں
 کہا۔“

”محترمہ۔۔۔ پاگل پن کی یہ وجہ میں نے Repression سے نہیں لی۔۔۔
 میں جس پاگل پن کا ذکر کر رہا ہوں وہ میری میر کا پاگل پن ہے۔۔۔ فرہاد کا پاگل
 پن ہے۔۔۔ پروفیسر سہیل تو دیوانے پن کی ایک سائیڈ دکھا رہے تھے خود کشی اور

موت میں دوسری سائیڈ پیش کر رہا ہو جہاں پہنچ کر دیوانہ پن مقدس ہو جاتا ہے۔
ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر لیتا ہے دودھ کی نہریں بہا دیتا ہے۔“

کسی لڑکے نے پیچھے سے نعرہ لگایا۔۔۔۔۔ ”بیٹھ جاؤ جناب فرہاد صاحب۔“
آفتاب نے پیچھے قہر کی نظر ڈالی اور بیٹھ گیا۔

”Thats a point“ پروفیسر سہیل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”یعنی ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاگل پن دو قسم کا ہے۔۔۔۔۔ ایک مثبت ایک منفی۔۔۔۔۔ ویری گڈ۔۔۔۔۔ اب اس مہینے آپ سب کی یہ Assignment ہوگی کہ آپ مجھے ایک نہ ایک وجہ ایسی بتائیں جس سے فرد میں پاگل پن پیدا ہوتا ہے۔
۔۔۔۔۔ یہ وجہ جلی نہیں ہونی چاہیے۔ Environmental نہیں ہونی چاہیے۔۔۔۔۔ کوئی آفاقی نظریہ لیکن بالکل نئی وجہ ہونی چاہیے میں سب سے زیادہ سے پھرے جواب پر
سب سے زیادہ نمبر دوں گا۔“

کلاس میں شور مچ گیا۔

”سردیوانے پن کی صرف ایک وجہ ہے ماحول۔۔۔۔۔ ماحول۔۔۔۔۔ ماحول“
ایک طرف سے آواز آئی۔

”سراسر انسان میں پیداہشی نقص ہوتا ہے Biological“

”Repression سر۔۔۔۔۔“

”مانے نہ مانے کوئی۔۔۔۔۔ اصلی پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے۔۔۔۔۔ صرف
ایک وجہ عشق لا حاصل۔۔۔۔۔ عشق لا حاصل۔۔۔۔۔ عشق لا حاصل۔۔۔۔۔“
بھنگڑا ڈالنے کی انداز میں آفتاب کرسی پر چڑھ کر چلایا۔

”آڈر آڈر۔۔۔۔۔“ پروفیسر سہیل نے کہا۔ ”دوستو میری Increment کا
سوال ہے اگر تم لوگ ایسے شور مچاؤ گے تو کالج والے میری رپورٹ کر دیں گے۔
پرنسپل صاحب کے پاس۔۔۔۔۔ اور میری تبدیلی مظفر گڑھ کر دیں گے۔“

اس کے بعد بحث بے پتوار کی کشتی بن کر چلنے لگی۔

کلاس کے کسی ہیں نوجوان نے گروپ شادی اور حشیش کا قصہ چھیڑ دیا۔ پھر مغرب کی آزادردی سی بات نیگرو مسئلے کی طرف گئی۔ سوڈن میں ابے سینا کے رفیوجی مسائل، ریڈ انڈین اور ان کے جادوگروں کی باتیں تو نا آبادیات اور جمہوریت کے بکھیڑے جاپان اور اس کی انڈسٹریل کامیابی۔۔۔۔۔ روس کا پلٹنا ہوا کمیونسٹ نظام، جو بھی بات کسی کو معلوم تھی اس نے کی۔۔۔۔۔ لیکن سیمی شاہ کو کرسی پر کھڑے آفتاب کے عشق لا حاصل نے سر کر لیا۔ وہ گلبرگ کی ساختہ تھی۔ اس کی ساری عمر کونونٹ سکولوں اور کالجوں میں گزری تھی۔ اپنے خالی اوقات میں وہ انگریزی موسیقی سنتی، ٹائم اور نیوز ویک پڑھتی، ٹی وی پر امریکی سیریز دیکھتی اس کی واڈروب میں گنتی کے شلوار قمیض تھے، وہ شمپو ہینر سپرے، ٹشو پیپر، کولون، اور سینٹ سپرے کے بل بوتے پر سنگار کرتی تھی۔ اس نے کبھی لوٹے بالٹی سے غسل نہ کیا تھا۔ بیک برش اور شاوور سے نہانے والی اس دختر گلبرگ کو نہ جانے کیا ہوا کہ ایک کشمیری بچے سے وہ بھی اندرون شہر کے رہنے والے سے جب وہ عشق لا حاصل کا نعرہ لگا رہا تھا مات کھا گئی۔ اس سے پہلے سیمی شاہ اور آفتاب نکلیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔ ایڈمیشن فیس داخل کرواتے وقت برآمدے میں آتے جاتے۔ لیکن اس تیسرے پیریڈ میں ان دونوں کی نگاہوں میں پہلے استعجاب ابھرا۔ پھر پہچان پیدا ہوئی اور ایک ہی سیشن میں سب کچھ اعتراف میں بدل گیا۔ کلاس کے بعد وہ دونوں اٹھے ایک انجانی قوت کے تحت ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ باہر پہنچ کر سیمی شاہ کچھ کہے بغیر آفتاب کی موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ آفتاب نے سوال نہ کیا کہ اسے کہاں جانا ہے اور وہ دونوں کسی فلمی منظر کی طرح آہستہ آہستہ سڑک پر فیڈ آؤٹ کر گئے۔ تعارفی تقریب میں تین افراد نے میرا پڑا کیا۔

آفتاب جسم کے اعتبار کے بالکل یونانی تھا۔۔۔ اگر وہ کلاس میں موجود نہ ہوتا تو

شاید میرا چراغ روشن سب سے روشن ہوتا، ایک خاص قسم کا بغض، حسد اور اللہ واسطے
کابیر میرے دل میں اس کے خلا پیدا ہو گیا۔

دوسرا دھکا مجھے پروفیسر سہیل سے لگا اس سے پہلے کورس کی کتابوں سے نوٹ بنا
کر رکھے ہوئے تھے ہر سال وہ ان ہی مختصر ناچجوں کے بل بوتے پر پڑھاتے آرہے
تھے۔ اور پنشن ملنے تک ان کی تعلیمی استعداد بڑھنے کے امکانات صفر تھے جو نظریات
انہوں نے سروس کے شروع میں مرتب کے لیے۔ ان کو بدلایا ان میں ترمیم کرنا ممکن
نہ تھا۔

سکول میں ہم ماسٹر عالم رسول کی پرورش میں رہے۔ ان کی ڈاڑھی زبان کی گھن
گرج اور وہ میز کبھی تبدیل نہ ہوئی جس پر وہ کلاس میں آتے ہی اپنی چھڑی رکھتے
تھے۔ ان کی ڈاڑھی ہمیشہ کاسی مائل سیاہ خضاب سے چمکتی نظر آتی جس طرح
تھانیدار ملزم کو لمبا ڈال کر ماں بہن کی گلیاں دیتے ہیں ایسے ہی وہ ہمیں بچ پر کھڑے
کر کے ہماری عزت افزائی کرے تھے۔ ان کی آواز کا دو لیوم۔۔۔ کنٹرول خراب
تھا اور صرف اونچے سروں پر کام کر سکتا تھا۔ گرمیاں سردیاں ان کی وہی بل دار سیاہ
چھڑی میز پر نظر آتی۔ چھڑی تک ہماری رسائی نہ تھی۔ اس لیے ہم میز سے بدلے لیا
کرتے تھے۔ پرکار سے گود گود کر نقطوں کی شکل میں اس کی چاروں ٹانگوں پر کئی
گالیاں کندہ تھیں۔ لیکن یہ میز بدسلوکی کے باوجود اور ماسٹر صاحب کی ہمدردی
بددعاؤں کے باوصف کبھی اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ اگر ان کے منہ سے نکل جاتا کہ
جنگ آزادی ۱۶۳۷ء میں ہوتی تھی۔ تو پھر تمام کتابوں کی تصدیق کے باوجود اپنی
رائے بدلنے پر رضامند نہ ہوتے، ان کی اس اٹل خاصیت کی وجہ سے ان کے تمام
شاگردوں ڈرپوک گھنے اور بزرگ دشمن تھے۔ ماسٹر غلام رسول مغل بادشاہوں کی
شان میں کوئی گستاخی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ باہر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک
تمام شاہ ان کے ہیرو تھے۔ اگر ان کے عہد حکومت یا ذات میں کوئی کوتاہی کسی کو نظر

آتی تو وہ بلبلا اٹھتے۔ نکتہ چینی کرنے والے کو دلائل دے کر قائل کرنے کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔ ایسے میں ان کا ولیم کنٹرل کھلتا جاتا اور وہ دلیل کی جگہ چنگھار سے اگلے کو قائل کر لیتے۔

نویں جماعت کے شروع میں کہیں سے تو زک جہانگیری میرے ہتھے چڑھ گئی۔ میں سارا دن ہم جماعت کو اس کے واقعات سناتا نہ تھکتا۔ گو میں ماسٹر غلام رسول کی ذہنیت سے واقف تھا لیکن نئی نئی جوانی رُہی تھی انا پھن اٹھائے کھڑی تھی میں نے ہم جماعتوں پر اپنا رعب ڈالنے کے لیے ایک روز کلاس میں جرات سے کہا۔ ماسٹر جی آپ نے تو زک جہانگیری پڑھی ہے۔“

”جب تو ابھی تھوڑا تھوڑا موتا پھرتا تھا۔ تن میں نے اس کو پڑھا تھا، بیٹھ جا اور زیادہ علمیت نہ بگھارا کر کلاس میں۔“

”ماسٹر جی۔۔۔۔۔“ میں نے ذرا سی ارکوشش کے بعد کہا۔

”کیا ہے؟“

”اس میں کچھ ایسے واقعات درج ہیں جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ بادشاہ جہانگیر کچھ ایسا رحمدل نہیں تھا۔“

ماسٹر غلام رسول نے چاک کا ٹکڑا اڑیل میز پر مارا۔

”نور جہاں سے شادی کی۔۔۔۔۔ یہ رحم دلی نہیں؟ کوئی بادشاہ کسی دوہا جو سے شادی کرتا ہے؟ اس کو کمی تھی کنواریوں کی بول بتا رحمدلی نہیں تو اور کیا ہے۔ بتا؟“

ماسٹر جی اور میں مختلف پیانوں سے رحم دلی کو ناپتے تھے۔

”جہانگیر نے ایک ملزم کو۔۔۔ ماسٹر جی بکرے کی کھال میں بند کروا کے اوپر ملزم تھاناں کوئی بے گناہ تو نہیں تھا۔ سزا ہمیشہ بہتری کے لیے دی جاتی ہے اب میں تم کو مارتا ہوں تو کیا اس کا فائدہ مجھے ہوتا ہے بتاؤ۔۔۔ ساری سزا ملزم کے فائدے کے لیے ہوتی ہے۔“

”لیکن ماسٹر جی جو بکری کی کھال میں سلوا دیا گیا اس کو کیا فائدہ ہوا؟“

”بیٹھ جا۔۔۔ بیٹھ جا اور بخشی نہ جاتا کر اپنے بڑے بھائی مختار کی طرح۔۔۔۔۔“

مطلب ہونہ ہو بخشی چلا جا رہا ہے، بولے جا رہا ہے خیر سے مونچھیں آجائیں سدھی پدی تو بات کریں گے جہانگیر اعظم کی۔“

وہ سکندر اعظم کی طرح ہر مغل بادشاہ کے ساتھ اعظم لگانے کے عادی تھے اپنی مونچھوں کے سلسلے میں پہلے ہی کچھ شرمسار رہتا تھا اس لیے میں چپ چاپ بیٹھ گیا لیکن علمیت بگھارنے والے کڑکے نے میرے اند کہیں بغاوت کر دی۔

تعلیم و تدریس کی بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ عام استاد عموماً اوسط درجے کا شخص ہوتا ہے اور وہ ذہنی جسمانی اور جذباتی طور پر لکیر کے فقیر قسم کی باتیں سوچتا ہے اسے ضبط و انظم سے مڈل کلاس لوگوں سے، اور پڑھا کو طلبا کو پڑھانے سے پیار ہوتا ہے لیکن سارا دن وہ بڑی قد آور شخصیتوں اور ان کے کارناموں کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے کبھی معاشرے کے ساتھ مطابقت نہ کی۔ عام ترین ہوتے ہوئے وہ ایسے لوگوں کی تعلیم عام کرتا ہے جن کی سطح پر وہ سوچ بھی نہیں سکتا اس کا اپنا کردار بچوں کو عام بنانے پر مصر رہتا ہے اور اس کی تعلیم بچوں کو خاص ہونے پر اکساتی رہتی ہے۔ سکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی جگہ سکول میں نہیں ہوتی لیکن ایسے ہی باغی بچوں کو بچ کر کھڑا کر کے ہمیشہ ان عظیم شخصیتوں کی روشن مثالیں دی جاتی ہیں جو خود سکولوں سے بھاگے تھے۔ ہر غلام رسول بچوں کو جنہیں جینیس۔۔۔۔۔ کی کتابیں پڑھا کر عام بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور یہی تعلیم کا سب سے بڑا المیہ ہے خاص لوگوں کی تعلیم اور عام لوگوں کی دادا گیری میرے دل کی بچ پر بھی ماسٹر غلام رسول کئی قد آور شخصیتیں کھڑی تھیں اس درخت جیسی ہو گئی جسے زیائش کے لیے جاپان میں پالا جاتا ہے، جو سالوں پرانا ہوتا ہے لیکن جس کا قد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

”سر آپ ہر روز ہمیں بتاتے ہیں کہ روپیہ تھرڈ ورلڈ ذلت کی جڑ ہے۔ پھر آپ اپنی کارینچ کر معمولی موٹر سائیکل کیوں نہیں خرید لیتے؟“

ابھی میں پختہ نہیں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ عام طور پر قول اور فعل کے تضاد سے بڑی قدر اور شخصیتوں کا خمیر بنا ہوتا ہے۔

پروفیسر تنویر کا چہرہ لال ہو گیا۔ انہوں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا ”یہ بالکل پرسنل سوال ہے بیٹھ جاؤ اور یاد رکھو تم قصباتی لوگوں کے manners بہت کمزور ہوتے ہیں، بے وقوف گدھے۔۔۔۔ اگر میں کارینچ دوں گا تو کالج کیسے آؤں گا؟۔“

میری انا کو سخت دھچکا لگا۔ اس لیے بحث کو اب چھوڑنا میرے لیے بھی آسان نہ تھا میں نے پروفیسر تنویر کو زچ کرنے کے لیے کہا۔۔۔۔ ”سینیکل پرسر۔۔۔۔ سائیکل پر۔۔۔۔ انسان کو عوام میں ملے رہنا چاہیئے۔“

”یہ Space age ہے گھدے آدمی۔۔۔۔ ہر کام میں وقت بچانا پڑتا ہے۔ اور ہم مجھے سائیکل سوار بنارہے ہو۔“

”لیکن سر چین بھی تو Space age میں ہے وہاں کے لاگ۔۔۔۔۔“

”ایک دانشور انٹو یکچوئل سائیکل پر آئے جاتے۔۔۔۔ اور تمہارے بزنس کارخانے دار۔۔۔۔ دو کوڑی کے نو دو لیتے کاروں پر گھومیں۔ مرمر کرتو جگہ ملی ہے معاشرے میں۔۔۔۔ برسوں کی جدوجہد کے بعد گریڈ بڑھے ہیں۔ ہم بھی عزت و ارزندگی بسر کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔“

”سر لیکن آپ کے نظریات کے مطابق تو سوسائٹی میں کوئی طبقہ نہیں ہونا چاہیئے، جس سے عزت بے عزتی کا سوال پیدا ہو۔“

اب پروفیسر کے منہ سے جھاگ اڑنے لگی وہ دونوں بازو ہلہرا کر بولے۔۔۔۔۔

”بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔۔۔۔ مینڈ کی! کھوپڑی ڈھائی ڈھائی انچ کی ہوتی ہے اور

اس میں مارکس کے نثریات بٹھانا چاہتے ہیں، بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ بھائی میاں۔۔۔۔۔
 پہلے ٹائی کی ناٹ باندھنا سیکھو۔۔۔۔۔ پھر ادھر آنا۔۔۔۔۔ ان باتوں کی طرف۔۔۔۔۔
 ”۔۔۔

میں اپنی ٹائی کی ناٹ ہتھیلی میں چھپا کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ پروفیسر تنویر کو کھوپڑیاں
 کھولنے کا عمل نہیں آتا تھا۔ وہ کسی کو ایسی تعلیم دینے کے اہل نہ تھے جو نظریے اور عمل
 کا فرق کم کر دے۔

لیکن پروفیسر سہیل ایسا چھپا ہو کاغز نہیں تھا، جس پر مزید کچھ لکھا نہ جاسکے، وہ تو
 سلیٹ کی مانند تھا، لکھا۔۔۔۔۔ مٹایا اور پھر لکھ لیا کتابوں سے اس کا شغف دیکھ کر مجھے
 بہت حیرت ہوئی۔۔۔۔۔ مجھے بھی عرصہ سے کتابوں کی رفاقت نصیب تھی۔ لیکن
 کتابوں نے مجھ سے زندگی کی ہلکی طرف کو پوشیدہ کر دیا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا، کہ
 کتابوں نے مجھ سے زندگی کی ہلکی طرف کو پوشیدہ کر دیا تھا، میں محسوس کرتا تھا، کہ
 کتابوں سے محبت کرنے والے عموماً زندگی کی اس اہم سمت کو بھول جاتے ہیں۔ وہ
 اس قدر سنجیدہ ہو جاتے ہیں کہ مزاح مکمل طور پر ان کی زندگی سے نکل جاتا ہے اور وہ
 لمبہ جبہ پہن کر سارا وقت پڑھے ہوئے نظریات کی لاٹھی سے دوسروں کی پٹائی میں
 مصروف رہتے ہیں۔

پروفیسر سہیل مختلف اور عجیب تھا شخصیت پر کسی نہ کسی غلام رسول نے اپنی مہر لگا رکھی
 تھی۔۔۔۔۔ اس لیے بچے کی طرح سادہ، کسی گنوار کی طرح متغیر اور کسی مسخرے جیسے
 ہنسوڑ پروفیسر سہیل کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ تعارفی کلاس میں ہی مجھے اپنی علم دوستی
 سے گلہ پیدا ہو گیا۔ مہاتما بدھ کی دھاما پادھا سے لے کر موجودہ دور کے تازہ ترین علم
 پیر سائیکولوجی تک مجھے جو کچھ پیش آیا تھا۔ اس سے اکتاہٹ پیدا ہو گئی۔ کاش میں بھی
 سادہ سلیٹ ہوتا۔۔۔۔۔ پچھلا لکھا ہوا مٹا سکتا اور پروفیسر سہیل کی دی ہوئی
 Assignment کو اسی تازگی سے لکھ سکتا جس کی وہ ہم سے توقع رکھ رہے تھے۔

حالانکہ ابھی میں نے مضمون نہیں لکھا تھا۔ لیکن ابھی سے انہیں مایوس کرنے کا دکھ مجھے تھا۔

آفتاب کے حسن اور پروفیسر سہیل کے علم کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے بعد میں نے تیسرا سجدہ یسعی شاہ کو کیا۔۔۔۔ غالباً اس میں اس کلچر کی جیت تھی جو دیہاتی لوگوں و میسر نہیں آتا۔

میں نے اس سے پہلے اتنی مکمل شہری لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں اشتہاروں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ اور وہ مجھے ہوائی سفروں پر بادلوں سے اوپر لے گئی۔ اس کا لب و لہجہ۔ لباس اٹھنا بیٹھنا، جسم سے اٹھنے والی خوشبو سب اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ مجھ سے زیادہ مہذب ہے۔ اب میری انا کا یہی مسئلہ تھا کہ میں اس لڑکی کو پچھاڑوں۔ اور اسے اپنی دیہاتی بیک گراؤنڈ میں گھسیٹ کر لے جاؤں جہاں وہ میری وجہ سے پچھاڑ کھا کر گرے اور مکمل طور پر دیہاتی ہو جائے۔

پھر اس کے صبح و شام ماں کی طرح لسی پینے دودھ دوپنے، چرغا کا تنے اور بڑی بڑی ہانڈیوں میں ساگ پکاتے ہوئے صرف ہوں۔ شاید ہر مرد کے اندر یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ عورت کو اس کی پٹری سے اتارے اور اپنے راستے پر لے کر چلے۔ اب یہ اور بات ہے کہ آفتاب مجھ سے پہلے ہی یسعی شاہ کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر رخصت ہو گیا تھا۔ اور اندرون شہر کے کلچر پر اردو میں پہلا لیکچر دے رہا تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں

پوٹھوہار کا وہ علاقہ جہاں آج کل دوسرے درجے کے بے آب خاکستری پہاڑ ہیں اور جن کو مقامی لوگ پتیاں پکارتے ہیں۔ یہی علاقہ جو ہوائی جہاز کی کھڑکی سے امریکہ کے جنوبی ریگستانوں سے مشابہہ نظر آتا ہے یہ علاقہ ایک زمانے میں لہریں مارتا چاند کی طرف لپکا، مردیں سمندر تھا۔ پھر کسی جوگی نے وہ تین صدی سے اس کے

کنارے بیٹھا گیان دھیان میں مصروف تھا۔ مندر کو نظروں سے اوجھل ہونے کا سراپ دے دیا۔ سمندر ایسے لونا کہ ہر ہلہر پالا گن پالا گن کہتی بجیرہ عرب میں جاگری اور اس علاقے کی تہہ آب چھپی ہوئی پہاڑیاں ٹنڈ منڈ باہر نکل آئیں۔ ان پہاڑیوں کے نشیب و فراز اور کٹاؤ ایسے تھے کہ لہر و لہر سمندر کے بہاؤ کا پتہ دیتے تھے۔

کچھ اور لوگ کہتے ہیں اس علاقے سے لحق کبھی ایک گھنہ جنگل تھا۔ جنگل کے درخت ایسے اونچے چھتارے ڈال ملے تھے کہ اس میں بہنہ والی مٹیوں کو بھی راستہ نہ ملتا اور سورج کی روشنی سے ان کے پانیوں میں کبھی ست رنگے بھرنے نہ پڑتے۔ یہاں سارا دن پرندے آزادی سے گھومتے پھرتے اور الو بھی دن کے وقت دیکھ سکتے تھے۔ لیکن ایک رات چاند سے ایسے آسب کی ہوا اتری کہ سارا جنگل ٹنڈ منڈ ہو گیا اور سب ندی نالے سوکھ گئے۔ اسکے علاوہ کچھ لوگ کہتے ہیں کئی قرن پہلے جب پہلی بار بنی نوع انسان متحد ہوا تو یہ جنگل موجود تھا۔ اس وقت وہ تمام منڈ اول علوم رائج تھے جو آج پھر سکھائے جاتے ہیں۔ تب پہلی بار انسان نے مرتخ اور زہرہ کا سفر کیا تھا اور زمین پر ایٹم بن بنائے تھے۔ جب تمدن کی کمان پورے زور سے تن گئی تو انسان نے سارے بم گرا کر اللہ کی دھرتی کو تہس نہس کر دیا۔ اور یہ جنگل بے آب و گیاہ بن کر علاقہ بن گیا۔

یہ تب کا ذکر ہے جب انسان نے پہلی بار تمدن ہو کر اپنے ہم دنیا پر نہ چلائے تھے۔ جانوروں کی بستیوں میں اس ایجاد کی وجہ سے بہت تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ اسی لیے جنگل میں کانفرنس بلانی گئی۔ جانوروں کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں اتنے پرندے آئے کہ جنگل کے درختوں کی کسی شاخ پر بیٹھنے کو جگہ باقی نہ رہی۔

ہند سندھ سے کاسنی پروں غول درغول آئے کھاسی کی پہاڑیوں سے سرخ دم والی بلبل اور فیروز رنگ کا کبوتر اس شان سے آیا کہ اس کے اندرونی نارنجی پروں سے

سکی آنکھیں خیرہ ہوئیں کھٹ منڈو کا بھجگا اور تبت کے شاہین کئی پڑاؤ ٹھہر کر حاضر ہوئے۔ افریقہ کے بھٹ تیتز بن مرغی اور بلبلیس تو آئی ہی تھیں لیکن شکاری پرندوں نے بھی اپنی مصروفیات بھلا کر امریکہ اور آسٹریلیا سے یہاں تک کا سفر اختیار کیا تھا۔ اونچے اونچے درختوں میں ریست ہاؤس بن گئے شکرہ باز چرخ عقاب گویشیا کو چک اور روسی ترکستان کے باسی تھے لیکن وہ بھی پامیر کے پرندوں کو ساتھ لے کر پہنچے تھے۔ کوا، مینا، بٹیر، کھکھٹ چکور، چڑیا، مقامی جنگل کے عوام تھے۔ اس لیے میڈنگ میں ان کی اجتماعی ووٹ بہت اہم تھی۔ لیکن انفرادی طور پر کوئی ان کی رائے کو نہ پوچھتا تھا۔ مڑی ہوئی ناک اور رانچی اڑانوں والے پرندے سفید فام قوموں کی طرح احساس برتری سے اترے پھر رہے تھے۔ دریائے گھاگر اور چترنجی کے طاس سے لٹورے، بھوری کنڈول اور غوغائی بڑے طمطراق اور سیلے سے فوجی ہوائی جہازوں جیسی فارمیشن بناتی آئیں۔ زریں پشت، نیل کنٹھ اور ہدہدوں کی ٹولیوں نے پرانے درختوں کے ٹھنڈے بسرام کے لیے چن لیے۔ فاخہ کوئل اور چنڈول کو اس مجلس مشاورت سے کوئی دل چسپی نہ تھی ان کے بھانویں انسان چاہے۔ ساری کائنات ختم کر دیتا وہ میلے گھونیاں تو جنگل والوں سے ملے ملانے چغلی عیب جوئی کے لیے آئی تھیں۔ لیکن جنگل میں پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ معاملہ سنگین ہے۔

کانفرنس سے کچھ دن پہلے سارے بن مین بھانت بھانت کے پرندوں سے کوک پڑی تھی۔ صاحب صدر کا سب انتظار کر رہے تھے۔ کرسی صدارت خالی ہونے کی وجہ سے کانفرنس جاری نہ کی جاسکتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد پرندوں کی نمائندہ ٹولی ماؤنٹ ایورسٹ سے یہ خبر لے کر واپس آئی کہ وہ تمام پر بت چھان آئے ہیں۔ دھولی دھارنا لگا پر بت، کے ٹو اور کچھڑ گا تک ہو آئے ہیں لیکن ہما کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ شاید دنیا میں کسی زبردست بادشاہ کی آمد تھی اور وہ اس کے انتخاب مین کائناتی طاقتوں کی مدد کرنے کے لیے اپنے وی آئی پی ٹور پر نکلا تھا۔ اس دور کے متعلق بھی

پرندوں میں بہت چہ میگوئیاں ہونئیں۔ کچھ شکاری ہوا بازوں کا خیال تھا کہ قیامت کے آزار قریب ہیں اور یہ قریب ہے اور یہ قیامت خود انسان کے ہاتھوں پر پانا ہونے والی ہے۔ دنیا کو قیامت سے بچانے کے لیے مرد مومن کی تلاش ہے اور اس بار ہما بادشاہ کا چناؤ نہیں بلکہ نجات دندہ کو کھوجنے کے لیے نکالا ہے کچھ پرندے سمجھتے تھے کہ ہما اب صوفی منش ہو چکا تھا۔ وہ انسان کو اتنی بار اللہ کی کلافت کا مشورہ سنا چکا تھا لیکن ہر بار خلیفہ صرف بادشاہ بن کر بیٹھ جاتا۔ ہما کو اس بات کا اتنا دکھ تھا کہ اب وہ اشرف المخلوقات کے سروں پر سے ارنانا گوارا نہیں کرتا۔ اور کہیں چھپ کر وقت گزر رہا تھا۔

بوم جاتی اپنے پرانے میں پاؤں اٹکانے کے عادی نہ تھے، انہیں اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہما اپنی انفرادی شان کی وجہ سے مشیت ایزدی کو بالکل ملحوظ نہیں رکھتا۔ اسے صرف کسی کسی انسان کی آرزو کی خشبو ملتی ہے جس کی تعاقب میں پھینچ جاتا ہے۔ اسی لیے ہما جس کندھے پر بیٹھ کر بادشاہت کا اعلان کرتا ہے وہی بادشاہ رعایا کے زوال کا باعث بنتا ہے لیکن الو لوگ چونکہ دیکھنے کے عادی تھے اور بولنے سے پریشاں ان کا شیوہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار برملا نہ کیا۔ چپ چاپ رہے اور فکر صاحب صدر کا انتظار کرنے لگے۔

گو بوم جاتی کے سر کردوں نے اپنی رائے کا اظہار اندروالے سرکل میں کیا تھا۔ لیکن کوئے کن سوئی لینے میں اول درجے کے حرامی ہوتے ہیں ویسے بھی انہوں نے بات پہنچانے کا فن آدم زادوں سے سیکھا تھا۔ گول آنکھوں والے الوؤں کی بات سارے میں پھیل گئی اور سارے جنگل میں چہ چہ کی آوازیں آنے لگیں۔ کوؤں کی چھٹ بھیا برادری کو ویسے بھی ہما سرکس کا جو کر لگتا تھا، جوازل سے خود مر بھی تھا اور بر خود غلط بھی جب عرصے تک ہما نایاب رہا، تو میٹنگ کی بے جا طوالت سے سب پرندے عاجز آنے لگے۔ کوئے بجا طور پر نالاں تھے۔ کیونکہ ان کو جنگل کی عادت نہ رہی تھی۔ وہ کوٹھے منڈیروں پر بیٹھ کر عورتوں کی باتیں سننے کے عادی ہو گئے تھے۔

یہاں انسان کا ساتھ نہ ملا تو یہ بچھیر پا رٹی بہت دق ہوئی۔

اب اکا دکا سیانے مکار اور ڈرپوک کوے شاطر شیاست دانوں کی طرح چھوٹے پرندوں کی گئی چنی انفری کو گھیر لیتے اور مشتعل کرتے۔ ”لو ہا تو ال کا احق ہے بادشاہ چنتا پھرتا ہے دھرتی پر۔۔۔۔۔ بھائی ادھر دنیا کا ہر انسان بادشاہ چاہے کھری میں سوئے چاہے تخت پر ہما کم عقل یہ نہیں سمجھتا کہ ہر انسان اپنے آپ کا اشرف المخلوقات سمجھتا ہے جن کے سر پر تکبر کا تاج ہو ان کو بادشاہ کیا بنانا۔“

لیکن مورچو چن پھیلائے سارے جنگل میں ہما کے سوا گت کا ناچ ناچتے پھرتے تھے۔ انہیں اس کانفرنس میں آنے کی یہی خوشی تھی کہ وہ استقبالیہ کمیٹی پر ہیں۔ کوے موروں کی ٹولی میں جائلز توفت دوغلی پالیسی تلے کہتے۔ ”ہما کی بات کچھ اور ہے۔۔۔۔۔ کرسی صدارت پر صرف وہی بچے گا۔ اگر نہ برا بے تو چاہے لاکھ کھٹ جوڑ کر منت کچھ نہ ہوگا۔“

کرسی صدارت دیر تک خالی رہنے کی وجہ سے ہما کے نعم البدل کا ذکر ہونے لگا۔ پھر پرچہ لگا کہ جہاں سے سمندر پر نام کرتا لوٹا تھا اور جہاں پہاڑیوں پر سپیاں گھونگھے، بچھو صولن سگ، مچھلی کے ڈھانچے اور دوسری سمندری مخلوق مردار پڑی تھی۔ وہاں ایک سمیرغ کا شانی بھون ہے۔ اس کی عمر کا کسی کو کچھ اندازہ نہ تھا۔ کچھ پرندے مصر تھے کہ سمیرغ بابا نوح کی کشتی میں رفیو جی رہا۔ کچھ کا خیال تھا کہ وہ علاقے جسے آج کل اسرائیل ہتھیانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہیں غازہ کے علاقے میں مسجد اقصیٰ سے طاقت اخذ کرنے کے لیے سمیرغ کبھی رہتا تھا۔ بوڑھے کچھوے مصر تھے کہ بحیرہ روم کے طاس میں جس وقت کچھلی رات کو پہلے بار چاندی جیسا پانی بھرنے لگا اور ابرق جیسی ریت لہروں سے آشنا ہوئی اس ریتلے خطے میں سمیرغ رہتا تھا۔

ساری رات وہ چاند سے نظریں ملائے قوت جذب کرتا رہتا اور سارا دن تپتی

ریت میں پنکھ پھیلائے، بنجر اور ویران عمل آفتابی میں مشغول رہتا۔ فاختہ بھند تھی کہ سمیرغ کی ہی قوت سے پوٹھوہار علاقہ جنگل ہوا۔۔۔ اگر چاند کی پوری کشش سمیرغ میں نہا بھر آتی۔ ایک بھی پانی کی لہر اس علاقے سے لوٹنے کا ارادہ نہ کرتی۔ عمل مہتابی میں وہ مہنٹا طیسی قوت تھی جس نے پانی کو باہر کی طرف لوٹنے پر مجبور کیا اور آخر میں تمام پانی بحیرہ عرب میں جاگرا۔

راہب طبع سمیرغ کو نسل غپاڑے سے نفرت تھی۔ وہ جنگل کے باسیوں سے بڑی وحشت کھاتا تھا۔ بے آبا د جگہوں میں رہنا اور جینے بھر کی خوراک کھانا اس کی عادت تھی۔ لیکن نمائندہ وفد نے اسے دھونڈ نکالا اور اس تجربے، فطانت، ذہانت اور نجابت کی قسمیں دے دلا کر اسے میننگ میں کے آئے۔ سمیرغ پورے چاند کی رات میں پچھلے پہر آئے اس کے آنے سے چند ڈائیے پہلے سارا آسمان درخت توڑ آندھی کی لپیٹ میں آ گیا۔ طوفان سے محبت کرنے والے پرندے اونچی اڑانوں کو نکل گئے۔ ڈرپوک پرندے لمبی شاخوں سے لپٹ کر جھوٹے لینے لگے۔ پھر زور سے بجلی چمکی دھرتی کا نپی بجلی اس دھماکے اور چنگاڑ سے چمکی کہ رات دن سی اجالی گئی۔ اس لمحے جب تمام پرندے شراکے کی بجلی سے دم بخود تھے۔ سمیرغ چودہ سال پرانے بڑے درخت پر آ بیٹھا۔ اس کے ٹھہرتے ہی آندھی چھٹ گئی۔ درخت ساکت ہو گئے اور بڑے درخت میں جیسے فاسفورس کا ایک بڑا فانوس روشن ہو گیا۔ جس وقت سمیرغ نے پر پھڑ پھڑا کر اپنی رجا مندی کا اعلان کیا تو جنگل پار تک توپوں کے فائر جیسی آواز آئی اور جانوروں نے ایک دوسرے کو کسی بھونچال کے آنے کی کبر دی۔

”اتنی بڑی کانفرنس بلانے کی وجہ کیا ہے؟“ سمیرغ نے سوال کیا۔

چیل جاتی کے گروہ میں سے ایک تنہا سی چیل نکلی تہا تہا کرتی آگے بڑھی۔۔۔
 ”آقا مسئلہ بہت باریک اور توجہ طلب ہے تو دیکھتا ہے کہ آج کل انسان پہلی بار

متحد ہوا ہے اس نے اپنی ایجاد پسند طبیعت کے ہاتھوں زہرہ اور مرتخ کے سفر کیے ہیں۔ لیکن انسان کی سرشت میں ایک وصف ایسا ہے جو اس کی تباہی کا باعث ہے۔۔۔ دیوانہ پن۔۔۔ اچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور دیوانے پن سے مشتعل ہو کر اس نے ایسے ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں جن سے یہ کرہ زمین کو منٹوں میں تباہ کر دیتا ہے اور اپنے مجسوس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا ہے۔ اے پرندوں کے شاہ! ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے کچھ پرندے بھی پاگل پن کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔“

مینا نے پر پھڑ پھڑائے اور سب کو متوجہ کر کے بولی۔۔۔۔۔ ”جس وقت پہلی دیوانگی کا واقعہ ہوا۔۔۔ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا اور کوئے نے انسان کی بے بسی دیکھ کر اس کی مدد کی آسمان سے اتر اور ہابیل کی لاش کو مٹی میں چھپانے کا گر سمجھایا۔ انسان کی کم ظرفی ملاحظہ ہو۔ شکر گزار ہونے کی بجائے اس نے ہمیشہ کوئے کو ذلیل سمجھا اور پرندوں کو اپنی عقل سے تابع کرنے کی کوشش کی۔

جب نبی قابیل نے جشن منایا تو وہ جنگلی جانور پکڑ کر لائے ان کو ذبح کیا۔ گوشت خود کھایا اور کھلے پائے ادھر ادھر پھنکوا دیے اور کتے اور بلی نے گوشت کی کثرت دیکھی۔۔۔۔۔ تو اپنے انبائے جنس کو چھوڑ کر بستیوں میں آ رہے سیر بھر کر کھایا اور وافر مٹی تلے چھپا چھوڑا۔۔۔۔۔ حرص کا شکار ہوئے۔“

”یہ لمبی داستان ہے آقا۔۔۔۔۔ بہت لمبی۔۔۔۔۔ انسان لاکھ اثر المخلوقات سہی ہم اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے، اس کی صحبت کبھی کسی جانور کو پرندے کو اس نہیں آئی۔“

طوحا مینا کا دشمن تھا اور بد اکر بولا۔۔۔۔۔ ”اگر انسان کی صحبت سے دیوانگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں، حرص، رغبت کینہ و حسد جنم لیتا ہے تو بتا گدھا حریص کیوں نہیں حالانکہ وہ انسان کا سب سے پرانا ساتھی ہے۔“

مینا جزبہ ہو کر بولی۔۔۔۔۔ ”اور تو بتا اتنی وفاداری کے باوجود۔۔۔۔۔ اتنی نیک

نفسی کے باوصف انسان نے گدھے سے ہمیشہ کیا سلوک کیا؟ کس قدر بوجھ لادتا ہے وہ ان بے زبانوں پر۔۔۔۔ اور جس کسی کی عزت مقصود نہ ہو اسے گدھا پکارتا اور سمجھتا ہے، انسان کا کیا ہے یہ تو دودھ پلانے والے جانوروں کا کام نکل جانے پر قصائی کے حوالے کر دیتا ہے۔ انسان کی بات درمیان میں نہ لاؤ دوستو ورنہ بحث لمبی ہو جائے گی۔“

چیل اسی بندر گھاؤ سے پریشان ہو کر بولی۔۔۔۔۔ ”ملزم کے نفع نقصان پر اس وقت بحث فضول ہے سزا دو۔۔۔۔ اور نکال دو۔۔۔۔ سزا دو اور نکال دو۔“

کاہنو جیسے سیاہ لباس والی کوئل بولی۔۔۔۔۔ ”سوچ لو عا دلو۔۔۔۔ انسانوں کی بستی سے گدھ جاتی لوٹ نہ سکے گی۔ آخر گدھ کا ہمارے ساتھ پرانا رشتہ ہے، وہ ان درختوں پر ہمارے ساتھ رہا ہے بھلا وہ انسان کی صحبت میں کیسے تندرست ہوگا۔ کیسے شفایاب ہوگا؟“

”تجھے شفایابی کی پڑی ہے ہم کہتے ہیں کہ بہت جلد اس کا پاگل پن سارے جنگل کو لپیٹ میں لے گا۔۔۔۔ اور پھر کوئی چارہ نہ چل سکے گا۔۔۔۔“ ایک جہاں دیدہ چیل بولی۔

چیلوں کو بحث سے کوئی غرض نہ تھی، ان کو سزا سے علاقہ تھا اور وہ صرف سزا کے متمنی تھے۔

سارے جانور کوئل کی بات سن کر گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔

بالغ نظر چیل پھر گویا ہوئی۔۔۔۔۔ ”ہم غافلوں کو اس بحث سے یک گونہ تشفی ہوتی ہے لیکن مکمل تسلی نہیں ہوئی۔ ہمارا مطالعہ صرف ایک ہے کہ گدھ جاتی کا حقہ پانی بند کر کے انہیں جنگل بدر کر دیا جائے۔ پھر چاہے یہ آبی جانوروں سے ناٹھ جوڑیں چاہے انسانوں میں جا بسیں۔ بس پرندوں میں ان کا شمار نہ ہو۔“

اس وقت سیاہ بگلا اٹھا اور ایک ٹانگ پر ایستہ ہو کر بولا۔۔۔۔۔ ”دانشوروں کی محفل

میں میرا بولنا معیوب ہے، پر گدھ سے بھی پوچھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔“
 فاسفورس کی جتنی تین بار پٹاجی اور آواز آئی۔۔۔۔۔ ”کہہ گدھ راجہ کیا تجھے
 اعتراف ہے کہ تو دوسرے پرندوں کی طرح نہیں ہے۔۔۔۔۔ تجھے دیوانگی کے
 دورے پڑتے ہیں؟“

راجہ گدھ اونچے درخت کی آخری ڈالی سے اترا اور سوکھے تال میں سب کر
 مخاطب کر کے بولا۔

”ہاں آقا! چاند راتوں میں اونچے چھتھارے درختوں سے میں خود ہی گر پڑتا
 ہوں۔ پھر میری حالت اپنے بس کی نہیں رہتی میں اپنے ہم جنسوں کو اپنے ماحول کو
 پہچاننے سے قاصر رہتا ہوں اور ایسی سمتوں میں نکل جاتا ہوں جو کبھی کہیں نہیں
 جاتیں۔“

”یو ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہے۔۔۔۔۔؟ کیونکہ کوئی پرندہ اس دیوانگی کا مرتکب
 نہیں۔“

”مان گیا مان گیا۔۔۔۔۔“ چیلوں کے گروہ سے آواز آئی۔

”جس وقت لومڑ دیوانگی کے آزار سے مغلوب ہو کر روتے ہیں، ہم آپے میں
 نہیں رہتے آقا۔۔۔۔۔ ہم خود نہیں جانتے کہ یہ دیوانگی کیوں ہے۔ ہم گناہگار ضرور
 ہیں لیکن کیوں ہیں، اس کا بھید ہم پر آج تک نہیں کھلا۔۔۔۔۔ کوئی ہمیں بتا سکے تو ہم
 اس کا احسان ماننے کو۔۔۔۔۔ تیار ہیں۔“

اس وقت نجد کی رہنے والی ایک بلبل بولی۔۔۔۔۔ ”دوستو! میں ریگستان کی
 رہنے والی ہوں، میرے حلق میں حدی خوانوں کے نغمے ہیں اور میرے سینے پر
 انسان کے عشق کا لہو جم گیا ہے۔ میں صدیوں سے دیکھتی آئی ہوں اور تمہیں بتاتی
 ہوں کہ گدھ کی دیوانگی کا سراغ انسان کی پراگندگی میں ملے گا اور انسان کے پاگل پن
 کی وجہ ایک ایسی قوت میں پنہاں ہے جو اگر آگے نہ جائے تو ریزہ ریزہ کرنے لگتی

”ہے۔“

جنگل میں الو سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ یکدم متوجہ ہوا۔۔۔۔۔ ”کیسی قوت؟ مینیکل انرجی۔۔۔۔۔ اٹومک انرجی۔۔۔۔۔ الیکٹریکل انرجی۔۔۔۔۔ پوٹینشل کہ کائی نیٹک ساؤنڈ کہ لائٹ انرجی؟“

بلبل سرخ سینہ پھلا کر بولی۔۔۔۔۔ ”ان سب قوتوں کا مرکب تیار ہوا تو انسان کی قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔“

سب حیرانی سے بلبل کا چہرہ تکئے لگے۔

”انسان اسی وقت کی بدولت دیوانہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ مان لو صاحبو جب قوت کو نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو پھر وہ اس باسن کو توڑ دیتی ہے جس میں اسے جمع کیا جاتا ہے۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا؟۔۔۔۔۔ کیسے کیسے کیسے؟“

”میں نجد کی رہنے والی ہوں میرا شیخ جب تجارت کی غرض سے دوسرے ملکوں کا سفر کرتا ہے تو مجھے سونے کے پنجرے میں ساتھ رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے بنارس کے ایک سنیا سی نے بتایا تھا کہ انسان کے دیوانہ پن کی اصل وجہ کیا ہے؟“

”بول۔۔۔۔۔ بتا۔۔۔۔۔ سر بستہ راز کھول۔۔۔۔۔“

”انسان کی ساری قوت اس کی جنسی طاقت میں پوشیدہ ہے، وہ جانوروں اور پرندوں کی طرح محض نسل بڑھانے کو اپنی جنس استعمال نہیں کرتا، بلکہ طاقت کے اس مشکلی گھوڑے کو اپنی رانوں میں دبا کر رکھتا ہے۔ پھر یہی برق رفتار سے دنیا اور دین کی مسافتیں بے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس گھوڑے پر انسان کے زانوختی سے کسے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے۔ ڈھیلا بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا ہے اور پاگل کہلاتا ہے۔ دنیا کا عرفان ہو تو شاعری، مصوری، موسیقی، آرٹ جنم لیتا ہے۔ دنیا درکار نہ ہو قوت تیز ہو تو عرفان کی حدیں چھو لیتا ہے اگر یہ قوت مقبض ہو جائے تو خود کشی کرتا

ہے۔۔۔۔۔ عشق لا حاصل ہو جائے اور گھوڑا سوار کو گھسیٹے تو انسان پاگل ہو جاتا ہے۔
لوگ اسے پتھر مارتے ہیں، زنجیروں سے باندھتے ہیں۔۔۔۔۔ دیوانگی کی اصل وجہ
یہی عشق لا حاصل ہے آقا۔“

فاسفورس کی جتنی تین بار بجھی اور آواز آئی۔۔۔۔۔ ”لیکن انسان کی دیوانگی سے
گدھ جاتی کا تعلق؟“

”علم ہمیشہ معلوم سے نامعلوم کی طرف لے جاتا ہے۔۔۔۔۔ کیا ہم انسان کی
دیوانگی سے یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ کہیں رجبہ گدھ بھی ایسی ہی قوت رکھتا ہو۔؟“
”عشق لا حاصل کی قوت؟۔۔۔۔۔“ سرخاب نے سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اس کو کسی طرح وہی طاقت حاصل ہو گئی ہے“ ہبل بولی۔
”اللہ کے دیئے ہوئے رزق کی قسم! سچ سچ بتا۔۔۔۔۔ کیا تو اس طاقت سے
مزین ہے؟“

رجبہ گدھ نے سراپیمگی کے عالم میں پھٹ پھٹائے اور بولا۔۔۔۔۔ ”آقا! مجھے
مہلت دے میں اپنے بھید سے خود آگاہ نہیں ہو سکتا ہے کہ یہی وجہ ہو لیکن اگر تع
مجھے کچھ وقت عنایت کرے تو میں اپنی برادری والوں سے مشورہ کروں اور پھر ساری
کیفیت عرض کروں۔“

سیرغ نے فاسفورس کی لالین بجھا دی زور سے بادل گرجا، یکبارگی بجلی یوں
کڑکی کہ تمام پرندوں کی نگاہوں میں جنگل سفید ہو گیا۔ پھر اگلی میٹنگ تک کانفرنس
ختم ہو گئی۔۔۔۔۔ پرندے ہوئے ہوئے ٹکڑیوں میں اڑنے لگے اور کچک دیر کے بعد
جنگل صرف سانپوں کی سائیں سائیں فید بیک کرنے لگا۔

کلاس میں پہلے پندرہ لڑکے داخل ہوئے۔

لیکن رفتہ رفتہ بورجھڑنے لگا۔ کسی کو کورس مشکل لگا۔ کوئی ماحول سے مطابقت نہ

پیدا کر سکا۔ کسی ایک کوڑکیوں کی صحبت خائف کر گئی۔ ایک آڈھاس لیے چلا گیا کہ پڑھائی کے علاوہ کسی دوسری فیلڈ میں کمائی کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ لڑکیاں ہمیشہ کی طرح ڈٹی رہیں عورت میں ڈٹے رہنے کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ بہت جلد کلاس میں ہم صرف پانچ لڑکے رہ گئے پانچ لڑکیاں اور پانچ لڑکے اور اتنی متناسب تعداد کے باوجود سیسی شاہ اور آفتاب کے علاوہ ہم میں جوڑا جوڑا بننے کی صلاحیت نہ تھی۔

سالانہ سپورٹس کے دن سارے کالج میں ہرزبان پریمی اور آفتاب کا سکیٹڈل تھا اتنی جلدی اس قدر دیدہ دلیری اور اپنائیت سے کوئی طالب علم کسی لڑکی کی طرف بڑھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ دونوں غالباً اس سکیٹڈل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، سیسی اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے مکمل طور پر کٹی ہوئی تھی۔ طیبہ اور فرزانہ تو خیر مڈل کلاس کی لڑکیاں تھیں ان کی انگلیاں تو شروع دن سے منہ میں تھیں۔ لیکن کوثر جو خود گلبرگی پیداوار تھی۔ وہ بھی اپنی تمام تر جدیدیت کے باوجود ابرو اٹھانے اور کندھوں پر عیسائی لڑکیوں کی طمع کر اس کا نشان بنائے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ انجیلا البتہ سارے سکیٹڈل سے بچ کر چلا کرتی۔ ہر بات سے بچنے پہننے کی وجہ سے اس کا چہرہ ہمیشہ خوفزدہ رہتا۔

جوں جوں ان دونوں میں فاصلے کم ہوتے گئے اتنا ہی بلاوجہ۔۔۔۔۔ بغیر سوچے سمجھے اور اپنی بہتری کے خلاف میں سیسی کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔ دل بھی عجیب چیز ہے جب ماننا نہ چاہے تو لاکھ ثبوت کرو، ہزار دلائل ہوں کچھ نہیں مانتا۔ آفتاب اور سیسی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے ان کے نوٹ سانبجے تھے۔ کتابیں ایک تھیں، وہ ایک پن سے باری باری لکھتے تھے۔ موٹر سائیکل پر میں نے انہیں آتے جاتے کئی بار دیکھا کیفے ٹیریا پر وہ ایک گلاس میں دوسرا ڈال کر مشروب پیتے۔ کالج میں تمام ایک کی خیریت دوسرے سے پوچھتے۔ اس کے باوجود مجھے شبہ تک نہ تھا کہ سیسی آفتاب سے محبت

کرتی ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ میرا دل اس بات کی گواہی دیتا رہتا تھا کہ یہ سب چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔۔۔۔۔ انسان لا حاصل کے پیچھے کرکتنی لذت حاصل کرتا ہے۔

سالانہ سپورٹس ڈے پر سارا کالج نصف دائرے والے لان میں جمع تھا۔ زیادہ تر نظریں آفتاب اور سیمی پر تھیں۔ جو کرسیاں کم ہونے کی وجہ سے ایک ہی کرسی پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ پھر لڑکیوں کی چاٹی ریس اناؤنس ہوئی۔ سپورٹس کلب والے ہماری سوشیالوجی کی لڑکیوں کو منا کر گراؤنڈ میں لے گئے اس ریس کے دوران کوثر اور سیمی نے جینز پہن رکھی تھی اور طیبہ اور فرزانہ کھلے پانچویں کی شلوار میں چائیاں سر پر اٹھائے بھاگ رہی تھیں۔ کالج کے کئی حلال زادے بازوں اٹھائے بے پردگی بھاگتی ان ہر نیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں حرام زادے ہو گئے تھے۔

ایسوں ہی میں سے ایک میں بھی تھا۔

فرزانہ کی چاٹی ٹوٹ کر پاش پاش ہوئی سیمی نے کئی فاول کئے۔ طیبہ بھاگی تو جی داری سے لیکن کوثر سے پیچھے رہ گئی۔ بالآخر چاٹی ریس میں کوثر سے سیمی ہار گئی اس کے بعد آفتاب اور سیمی چند لمحے ٹھہرے اور پھر دونوں ادل چھوڑ کر خدا جانے کہاں چلے گئے۔

اس روز پہلی بار میرے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ شاید سیمی اور آفتاب دور نکل گئے ہوں۔

یہ شبہ میرے دل میں کوثر نے ڈالا۔ وہ چاٹی ریس میں فاسٹ آئی تھی۔ اس کا چہرہ متملایا ہوا اور گردن پر پسینے کے قطرے تھے۔ سیمی کی غیر موجودگی میں وہ بہت سمارٹ، شائستہ اور قابل قبول لڑکی لگتی تھی۔ کرسیوں کی کمی تھی۔ اس کی واپسی پر میں نے اپنی کرسی اسے پیش کر دی اور سامیہ نے اسے کھبے کر پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”چلی گئی۔۔۔۔۔؟“

”کون؟۔۔۔۔۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جی چلی گئی۔۔۔۔۔“ پچھلی قطار سے امجد نے جواب دیا۔

اس وقت ساری کلاس جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”اور وہ بھی ساتھ گیا اس کا چچہ۔۔۔۔۔“ کوثر بولی۔

”گیا۔۔۔۔۔“ جمال نے جواب دیا۔

اپنے کٹے ہوئے بال دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اس نے پسینہ آلود گردن سے اوپر کیے۔

”Competition تو ذرا برداشت نہیں کرتی۔ کیسے بھاگی ہار کے۔“ طیبہ اور فرزانہ دوپٹوں سے منہ پونچھتی ہوئی ہنسنے لگیں۔ انجیلا البتہ اپنے ناخنوں کو دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ وہ ازل کی بے چاری تھی۔

”ابھی تو چاٹہ ریس ہاری ہے۔۔۔۔۔ جب آفتاب ریس ہارے گا تو پتہ نہیں کیا حشر ہوگا اس کا۔“

کوثر کی زبان پر عورت کا ازلی حسد تھا غصے کی وجہ سے مجھے اس کی شکل بھی کچھ کچھ ٹیڑھی لگ رہی تھی۔ پھر سپورٹس کلب کا ایک جوان ان تین لڑکیوں کے لیے کوکا کولا لے کر آگیا۔ فرزانہ اور طیبہ تو شاید ”عصمت بچاؤ“ قسم کی لڑکیاں تھیں انہوں نے کوکا کولا پینے سے انکار کر دیا۔ لیکن کوثر نے بوتل شکریے کے ساتھ وصول کی نواڑی رنگین کرسی پر بیٹھی اور کوکا کولا پیتے ہوئے سیسی کے کردار، آفتاب کی کمزوری کلاس کی بدنامی پروفیسروں کی بے بسی پر بڑی لمبی چوڑی گفتگو کا آغاز کیا۔ کوثر تعارفی تقریب والے دن سے زخم خوردہ تھی۔ گواس کا مبلغ علم سیسی سے کم تھا۔ لیکن وہ گلابرگ کے میں بولے وارڈ سے آتی تھی۔ جہاں شہر کے امیرالامر رہتے ہیں۔ سیسی کے متعلق سن رکھا تھا کہ اس کے ابا کا گھر گلابرگ کی ایکسٹیشن نمبر تین میں تھا۔ اور وہ ماں باپ کے پاس رہنے کے بجائے کسی ہوسٹل میں مقیم تھی۔

”ایسی لڑکیاں پڑھنے جھوڑی آتی ہیں۔ اگر اس لیے ہے کہ آزادی ہو۔۔۔۔۔ اور

”کیا۔“

بڑی دیر تک طیبہ اور فرزانہ کانوں کو ہاتھ لگاتی رہیں۔

دراصل ساری بات ڈگری کی ہوتی ہے برقعے والیاں، بے نقاب لمبی چوٹی والی کو آزاد خیال سمجھتی ہیں۔ لمبی چوٹی والی کٹے بالوں والی کو بے حیا جانتی ہے۔ بال کٹی کا خیال ہوتا ہے کہ اس کے تو صرف بال ہی کٹے ہیں اصل حرافہ تو وہ ہے جو دن کے وقت ماسک را بھی لگاتی ہے اور آئی شیڈ بھی آئی شیڈ والی کو یقین ہوتا ہے کہ وہ بے چاری تو اللہ میاں کی گائے ہے۔ اصل میں تو وہ اچھا چھکا ہے جو دوپٹہ نہیں اوڑھتی See through کہڑے پہنتی ہے اور سب کے سامنے سگریٹ پینے سے نہیں چوکتی سگریٹ نوشی بی بی کے سامنے وہ فساد ہوتی ہے جو باخرموں کے ساتھ بیٹھ کر بلیو فلم دیکھتی ہے۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح مردوں میں بھی نیکی کی تعالیٰ موجود ہوتی ہے اور اس کی کئی ڈگریاں مقرر ہوتی ہیں جو شخص صرف نظر باز ہے اور اچنتی نظر سے لڑکیوں کو آنکلتا ہے وہ ان مردوں کو بد معاش سمجھتا ہے جو لڑکیوں کی محفل میں راجہ امز ربن کر بیٹھتے ہیں اور لطیفوں اور کہانیوں سے فضا کو عزل المعزلات کی طرح رومانٹک کر دیتے ہیں عورتوں سے باتیں کرنے کے رسیا ان مردوں کو غنڈہ سمجھتے ہیں جو انڈھیرے سویرے کو اڑ کے پیچھے سیڑھیوں کے اندھیرے میں غلخانے کی سنک کے پاس چوری چھپے کسی لڑکی کو بازوؤں میں لے لیتے ہیں۔ چوری چھپے بلے اذانے والے ان حضرات کو عادی مجرم سمجھتے ہیں جو کھلے بندوں عورتوں کو کاروں میں بٹھاتے اور ہوٹل کے کمرے بک کراتے ہیں کھلے عاشق ان پر آوازے کستے ہیں جو زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور زنا کاران پر نکاتیہ چینی کر کے بے قیاس راحت محسوس کرتے ہیں جو زنا بالجبر کرتے ہیں اور قانون کی گرفت میں ملزم ٹھہرائے جاتے ہیں

یہ ساری باتیں اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے لیے کی جاتی ہیں اور سن میں

تمام لوگ سوسائٹی سے اپنے لیے Approval کا ایک جائز طریقہ تلاش کرتے ہیں ورنہ بات ساری ڈگری کی ہے۔۔۔۔۔ کسی کو ہلکا بخار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ کسی کو زیادہ۔۔۔۔۔ کسی معاشرے میں شرافت کا درجہ نارمل متعین کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔

”ہوا کیا ہے۔۔۔۔۔“ آخر کو جمال نے سوال کیا۔

”ہوا کیا نہیں۔۔۔۔۔ تم کسی فیسٹ اینرلٹ کے سے پوچھ لو۔۔۔۔۔ سٹاف روم میں جا کر کسی کمیسٹری کے پروفیسر، حساب اردو کے پروفیسر سے پوچھ لو۔۔۔۔۔ سیمی بیگم کو عشق ہو گیا ہے آفتاب سے۔۔۔۔۔ کوثر بولی“

ٹھن سے کسی ے میرے سر پر لوہے کی ہتھوڑی ماری۔

پہلی بار مجھے خیال آیا کہ شاید سیمی مجھ سے محبت نہ کر سکے۔

سب سے پہلے مجھے سیمی کے اظہار اشتہار متاثر کیا۔۔۔۔۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھی یا کھانا چاہتی تھی۔

ہر عہد میں ہر معاشرے میں مختلف عمر کی عورتیں اپنی اشتہار کی نمائش کرتی رہی در پردہ ہو جاتی ہے۔ وہ نہ صرف عام محفلوں میں چڑی چوگا کھانے لگتی ہیں بلکہ اشتہار کے اظہار سے بھی انہیں نفرت ہو جاتی ہے کیونکہ ایک بھوک سے ہمیشہ دوسری بھوک کا سراغ چلتا ہے۔ پچھلی صدی میں بھوک کی نمائش جنسی آمادگی کے مترادف تھی۔ میلے ٹھیلوں پر یاروں سے لڈو جلیبیاں لے کر کھانے والی بنو مردوں میں تو مقبول تھی لیکن اپنی ہم جنسوں میں وہ بڑی بدنام تھی اور سسرال جا کر بسنا اس کے لیے مشکل تھا۔

لیکن اس دور کی ماڈرن لڑکی نے کھانے کے آداب ہوٹلوں سے سیکھے ہیں۔۔۔۔۔ ڈائینگ ٹیبل کی میز سے اخز کیے ہیں۔ ہوائی جہازوں کے سفر میں جہاں اپنے اپنے ٹرے لگے لگائے آتے ہیں اور جہاں آپ کے ٹرے میں دوسروں کی شراکت

ممکن نہیں ان ہوٹلوں ہوائی سفروں نے لڑکیوں کا نہ صرف چچ کاٹا علیحدہ کر دیا ہے بلکہ ان کی بھوک کو فردا فردا بڑی اہمیت دے دی ہے۔ اب بیف برگر چبانے والی دوہرے سٹرو سے کوک پینے والی زبان کے چٹخارے سے کون چاٹنے والی لڑکی ندیدی نہیں دلاویز ہے اتنے سارے ٹیلی ویژن کے اشتہاروں میں ماڈلز کو چائے پیتے، چیونگ گم چباتے سٹک کھاتے دیکھنے کے بعد کھاتی پیتی لڑکی مرد کا آئیڈیل بن گئی ہے۔

ویسے بھی مرد کا عورت کی بھوک سے ڈھکا چھپا لیکن بڑا پرانا رشتہ ہے جب کبھی کوئی مرد کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے اس عورت کی بھوک مٹانے کا جسکے پڑ جاتا ہے پھر وہ اس کی جذباتی بھوک مٹانے کے لیے اس کا سہارا بنتا ہے، ذہنی خلا جو بھوک ہی کی شکل ہے ختم کرنے کو اس سے باتیں کرتا ہے اس کی جذباتی بھوک کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے جسمانی بھوک بچوں کا باعث بنتی ہے اور پھر ان ہی چھوٹی چھوٹی اشتہائیں ختم کرنے میں اس کی زندگی صرف ہو جاتی ہے۔

پرانے زمانے میں بھی شوہر اپنی ماؤں سے چھپ کر اپنی نوبیا ہتا بیویوں کی ذہنی جذباتی جسمانی بھوک مٹانے اور پروا والی منزل میں جاتے تو ان کے ہاتھ میں قلاقند کے دو نے اور مولسری کے ہار ہوتے۔۔۔ آج بھی جب ملاقات ہوتی ہے تو کوک پلانے کو ان کھلانے والا اسے اپنی نیک نصیبی سمجھتا ہے۔

ماڈرن لڑکی یہ بھی سمجھ گئی ہے کہ بھوک کا دکھلاوا مرد تک یہ پیغام پہنچاتا ہے کہ اگر وہ کھانے پینے میں سرگرم ہے تو جنسی بھوک میں بھی مرد سے کم نہ ہوگی۔۔۔ وہ ایک سہل سے اپنے تمام کوائف سمجھا دیتی ہے اپنی بھوک کو نمایاں کرتے ہی آج کی لڑکی مرد کی بھوک میں برابر کی شریک ہونے کا وعدہ کرتی ہے۔

طیبہ کوثر اور فرازہ سے سیسی خوبصورت تو نہ تھی۔ لیکن وہ لباس میں، نشست و برخاست گفتگو کھانے پینے میں سب سے آگے تھی۔ جب کبھی وہ کلاس میں داخل

ہوتی اس کے منہ میں چیونگ گم ہوتی جو نہی پروفیسر کلاس سے جاتا وہ اپنے کینوس کے تھیلے میں سے سیب نکالتی اور اسے آستین پر صاف کر کے کھانے لگتی۔۔۔۔۔ سیب کھانے کا بھی اس کا عجیب طریقہ تھا وہ سیب میں تیکھ دانت اتارتی اور کڑک کی آواز کے ساتھ منہ پرے کر لیتی۔ ایک ہی ہفتے کے اندر اس کا سیب ساری کلاس میں گھومنے لگا تھا

”ایک Bite لے لو۔۔۔۔۔“ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔

میں ایک ایسے گھر سے سوشیالوجی کی کلاس میں گیا تھا جہاں جھوٹے برتنوں میں کھانا گناہ ہوتا ہے۔

”اس طرف سے کھا لو۔۔۔۔۔ میں نے یہاں نہیں کھایا۔“

اس نے سیب کی صاف ستھری طرف پیش کر دی۔ میں نے سیب اس سے لیا اور عیب وہاں دانت گاڑ دیئے جہاں سے اس نے کڑا ک سیب کاٹا تھا۔

بھوک کے معاملے میں وہ بہت بودی تھی۔ وہ گھنٹے گھنٹے کے بعد بھوک ہو جاتی۔ یایوں سمجھئے، یہ اس کا لاڈ تھا۔۔۔۔۔ بہت جلد ہماری کلاس ایک خاندان کا روپ اختیار کر گئی۔ اسی لیے سیمی کی باتیں کسی کو عجیب نہ لگتی تھیں۔

”بھی میرے پاس کچھتر پیسے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے کوک پینا ہے۔۔۔۔۔ ہے کوئی اللہ کا بندہ۔۔۔۔۔؟“

اللہ کا بندہ آفتاب ہمیشہ اس کی ساتھ والی سیٹ پر ہوتا۔

اچھا بھئی اور کون کون کوک پینے جائے گا؟

ادھر پورے سبھی تیار ہو جاتے۔

پھر سب اپنی اپنی نقدی اس کے ڈسک پر دھرتے جاتے۔ وہ حساب لگاتی جب رقم پوری ہو جاتی تو ہم سب کوک پینے طلے جاتے کینٹین پر بھی عجب تماشا رہا کوئی سیون اپ منگواتا کوئی فائنا منگواتا کوئی کوک۔۔۔۔۔ اب سیمی کسی سے مانگ کر

گھونٹ پیتی کبھی اپنی بوتل پیش کر کے کہتی۔

”پی لوطیبہ۔۔۔۔۔ تم نے تو فانا منگوا یا ہے۔۔۔۔۔ سیون اپ کا بھی ایک سپ لے لو بھئی۔۔۔۔۔“

جب طیبہ ہچکچاتی تو وہ اپنے کینوس کے تھیلے میں سے ٹشو پیپر نکال کر بوتل کا منہ صاف کرتی اور کہتی۔

”خدا قسم اب تو کوئی ہرج نہیں ہے۔“

شروع شروع میں سیمی ایسی Sporty لڑکی نظر آئی کہ کلاس والوں کو شبہ تک نہ ہوا کہ وہ آفتاب کی ہپ پاکٹ میں ہے۔ ان دنوں میں ہر روز اس میں کوئی نئی بات کوئی نئی ادا اور کوئی نئی دریافت کرنے کی سٹیج میں تھا۔ میری یہ سٹیج تحیر کی تھی جو کچھ مجھے نظر آتا میں اسے پوری طور پر ہضم بھی نہ کر پاتا کہ دوسرے دن اس میں کچھ اور نیا، کچھ اور دلچسپ اور حیران کن نظر آ جاتا۔۔۔۔۔ سب سے بڑی تبدیلی جو آفتاب سے ملنے کے بعد اس میں آئی اردو کی سوجھ بوجھ تھی۔ اب وہ ایسی اردو بولنے لگی تھی کہ بڑے بڑے اردو باز اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔

سوشیالوجی کی کلاس میں وہ سب سے باتونی لڑکی تھی پروفیسر کے نظریات سے ٹکر لینا اور چھوٹے سے لطیفے پر دیر تک ہنستے رہنا اس کا محبوب مشغلہ تھا دراصل اس میں وہ خوش اعتمادی کا خمیر تھا جس سے اس کی شخصیت کی تمام دلاویزی میں پھول لگے تھے۔

بھوک کی نمائش کے بعد سیمی میں بڑی جنسی کشش تھی وہ عموماً گردن پیچھے کر کے غر غر کر نیکے انداز میں منہ کھول کر پاٹ وار آواز میں ہنستی ایسے میں اس کے کندھے بازو پیٹ چھاتیاں سب ہلکورے لینے لگتے۔ اس کا قہقہہ عام طور پر مصنوعی ہوتا لیکن اس قدر بناوٹی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ لپ سٹک، بریزر اور سینوں کے اشتہاروں کی طرح کوئی چیز آپ کو یقین دلاتی تھی کہ قہقہہ محض

اشتہار ہے اصل سیمی اس اشتہار سے بھی اچھی ہوگی۔

بلند بانگ تھا ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ بد قسمتی سے اس روز وہ میرے بہت قریب بیٹھی تھی حالانکہ اس کا بازو آفتاب کی کاپی پر تھا۔ لیکن اس قربت نے مجھ پر ایسے اثر کیا کہ یکدم ہنستے ہنستے میں اسے دیکھنے لگا اور پھر ہنس نہ سکا۔

کچھ لمحے بڑے فیصلہ کن ہوتے ہیں اس وقت یہ طے ہوتا ہے کہ کون شخص کس کا سیارہ بنایا جائے گا جس طرح کسی خاص درضہ حرارت پر پہنچ کر ٹھوس مانع اور مانع گیس میں بدل جاتا ہے اسی طرح کوئی خاص گھڑی بڑی نتیجہ خیز ہوتی ہے اس وقت ایک قلب میں طلوع ہوتا ہے وہی دوسرے آئینے میں منعکس ہو جاتا ہے دوسرے قلب کی اپنی زندگی ساکت ہو جاتی ہے اس کے بعد اس میں صرف بازگشت کی آواز آتی ہے جس وقت میں سیمی کے عشق میں مبتلا ہوا مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ آفتاب کی محبت میں اس قدر دو رنکل چکی ہے۔۔۔۔۔ دراصل سیمی جیسی لڑکیوں پر محبت کرنے کا کبھی شک بھی گزر نہیں سکتا۔ وہ لباتی شرماتی تو ہیں نہیں کہ آدمی اندازے لگا سکے ہم پانچوں طالب علموں کے ساتھ اس کی خوب بخشا رہتی تھی۔

فرزانہ اور طیبہ متوسط گھرانے کی لڑکیاں تھیں س لیے ان میں جرات کی کمی بھی تھی اور سچائی کی بھی۔۔۔۔۔ کوثر درمیان میں تھی۔۔۔۔۔ کبھی ہو کر مذاق کر لیتی بھڑکتا سرخ۔۔۔۔۔ بھلا اس پر میں میں کیسے شبہ کرتا کہ اندر ہی اندر وہ جل بھا ہے۔

حسن اتفاق دیکھئے کہ آفتاب اور میں روم میٹ تھے۔ ہوٹل کے ہم کمرہ دوست بھی ہوتے ہیں اور حریف بھی ان کا سب سامان سانجھا بھی ہوتا ہے اور اس شراکت کے باعث ان میں جھگڑے بھی رہتے ہیں ہم کمرہ کے سیفنی سے بلیڈ چرانا، اس کے صاف تو لیے سے گندہ پسینہ پونچھنا، پیسے ادھار لے کر نہ لوٹانا، اس کی حاضری میں سے کھانا، بغیر اجازت کے ٹائی لے کر استعمال کرنا اور ڈرائی کلین کرائے بغیر لوٹانا۔

اپنے سلپر خشک اور روم میٹ کے سلپر غسل کے بعد گیلے کرنا، تیل لگانے کے بعد ہم کمرہ کے صاف تکیے کو دوہرا کر کے گردن تلے فٹ کرنا، نئی جرابیں مانگنا، گندے رومال بخوشی آفر کرنا، مجموعی طور پر لڑکیوں کو زبردست لانا اور اصلی لڑکی کے ذکر کو گول کر جانا۔۔۔۔۔ یہ سب باتیں ایک ہی کیوبکل میں رہنے والوں میں چلتی رہتی ہیں لیکن آفتاب اور میں پورا فتنہ ایڑ اور سسٹھ ایڑ کے چھ ماہ ساتھ رہے۔۔۔۔۔ ہمارے پلنگ، ٹرنگ اور میز تو ساتھ ساتھ تھے۔

لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے مکمل طور پر اجنبی ہی رہے۔

نہ صرف ہماری عادتیں مختلف تھیں بلکہ ہم مختلف ماحول کی پیداوار بھی تھے۔

اگر میں گھاس تھا تو آفتاب پھول تھا۔ گورا چٹا کشمیری جس کی شرتی آنکھیں براؤن بال اور بڑی چوڑی چکلی کاٹھی تھی۔ اس میں قد سے لے کر رنگ تک باتوں سے لے کر خاموشی تک عادتوں سے لے کر جبلی سرشت تک وہ سب کچھ تھا جس سے لڑکیاں پیار کرتی ہیں۔ وہ شگلا اتنا معصوم اور بھولا تھا کہ اسے دیکھ کر ہر لڑکی میں ایک ماں بیدار ہو جاتی۔ لڑکیوں کے سامنے اس بلا کا خاموش رہتا کہ سب کا جی مجبورہ کی طرح اسے لگد لگانے کو چاہتا۔ ذرا سی طبیعت کے خلاف بات ہو جاتی تو اس کی شکل مجروح ہو جاتی، شرتی آنکھیں نمناک نظر آتیں۔ اب باتوں کے پھاہے لے کر سب لڑکیاں نرس بننے پر آمادہ ہو جاتیں۔ آفتاب قالین فروشوں امیروں کا ایسا لاڈلا بیٹا تھا جس کی گھٹی مس پریم رہتا تھا۔ وہ اس قدر سیر چشم سیر دل آدمی تھا کہ نہ اسے دولت کی بھوک تھی نہ محبت کی نہ وہ شہرت کی تلاش میں تھا نہ ترقی کی۔۔۔۔۔ وہ ان تمام نعمتوں میں ہر وقت رہتا تھا۔ مچھلی جیسے جل میں رہتی ہے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ سوچ کی طرح ضروری اور سورج کی ہی طرح غیر اہم تھا۔ اس نے کبھی کسی کلاس میں کسی پروفیسر سے بحث نہیں کی۔ بس نما نما مسکراتا رہتا۔ ہم سب میں جب سیاسی بحثیں ہوتیں اور ہم نوائے وقت، امروز، مساوات، جنگ مشرق سے ہو کر

نیوز ویک اور ٹائم ویک اور ٹائم تک پہنچتے۔ تب بھی وہ خاموش رہتا۔ وہ کسی کو مرعوب کرنے کے لیے یا خود کسی سے مرعوب ہونے کے لیے خواہ مخواہ کوئی پنگا نہیں لیتا۔ جب کبھی وہ بات کرتا تو اس کی بات میں وزن ہوتا۔۔۔۔۔ نمبر ایک۔۔۔۔۔ نمبر دو۔۔۔۔۔ نمبر تین۔۔۔۔۔ وہ نہ کبھی لڑکیوں کو لفٹ دیتا نہ متاثر کرنے کی کوشش کرتا۔ صرف اس سے عادتاً اور سرشتاً ایسی حرکتیں ہوتی رہتی تھیں جن سے لڑکیاں پیار کرتی ہیں۔ اگر ماڈرن لڑکیاں بھوک کی نمائش کر کے اندر کی بھوک کا ثبوت دیتی تھیں تو آفتاب کے پاس ہمیشہ اتنے پیسے رہتے تھے جس سے وہ ظاہری بھوک کو شانت کر دیتا اور کچھ اس لا پرواہی سے کہ لڑکی سمجھ جاتی ایسے ہی بغیر مشکور کیے بغیر شرمندہ کیسٹا موشی اور رضا سے وہ اس کی دوسری اشتہا مٹانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

لڑکیوں کے ٹاپک پر وہ گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔ لیکن صرف امجد کے ساتھ روم میٹ ہونے کے باوجود اس نے کبھی کسی لڑکی کو میرے ساتھ موضوعِ سخن نہیں بنایا۔ مجھے یاد ہے شروع ایم اے کے دن تھے میرا خیال تھا کہ آفتاب اپنے تجاہل عارفانہ سے مجھے ٹٹول رہے ہیں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

آج طیبہ تمہارے متعلق پوچھ رہی تھی۔“

”کون سی طیبہ۔“

وہی جس کی ناک پر تل ہے“

”اچھا وہ“

”شاید اسے تم میں دل چسپی پیدا ہو گئی ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن بڑی بے وقوفی ہے۔۔۔۔۔ اس نے جرابیں اتارتے

ہوئے کہا۔

”تھوڑے وقفے کے بعد جو بلیں ان میں دل چسپی نہیں لینی چاہیے۔“

”یہ کوئی اختیاری بات تھوڑی ہے۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔اختیاری بات تو نہیں ہے۔“

اس کا رویہ نہ جارحانہ تھا نہ مدافعانہ۔۔۔۔۔بس وہ بات کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

”پوچھتی تھی کہ کیا آفتاب کے ابا جی دوکان ہے مال پر۔۔۔۔۔قالینوں کی۔۔۔۔۔“
بتا دینا تھا ابا جی کی دوکان ہے۔۔۔۔۔آفتاب کی نہیں۔۔۔۔۔اس نے ابرو سکڑ کر کہا۔

اب وہ پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔میں بات کو بڑھانا چاہتا تھا کہ لیکن اس کی خاموشی نے میرا منہ بند کر دیا۔

ففتھ ایر میں مجھے شبہ تھا کہ وہ نرگسیت کا شکار ہے۔ لیکن بعد میں مجھ پر کھلا کہ غالباً آفتاب کو اپنے آپ سے پیار نہیں تھا۔ بس اسے زندہ رہنے کی عادت تھی پرندوں کی طرح۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ کسی کے پاس کوئی خاص معقول وجہ بھی نہیں ہے کہ وہ کیوں زندہ نہ رہے۔ اگر کسی کے پاس ایسی وجہ ہوتی اور وہ آفتاب کو بتا دیتا تو یقیناً آفتاب اپنی زندگی ختم بھی کر دیتا شروع شروع میں ہسیسی اس کے ساتن نتھی ہوئی اور ہودوونوں اکٹھے رہنے لگے تو مجھے آفتاب سے شدید نفرت ہو گئی بلکہ میری یہی کوشش رہتی تھی کہ جونہی وہ کمرے میں آئے میں باہر نکل جاؤں لیکن اتنا پاس رہنے کے باوجود یہ اس کی سادگی تھی جس نے اسے یہ اندازہ ہی نہ لگانے دیا کہ میری جذبات کیا ہیں؟ آفتاب کو میں نے کسی دن خود آگاہ ہی میں بتانا نہیں دیکھا اگر اسے اپنی ذات کی سمجھ ہوتی تو شاید وہ مجھ تک پہنچ سکتا۔ عام طور پر ہماری کلاس کے لڑے لڑکیاں سی خود آگاہی کے احساس سے کئی حرکتیں کرتے تھے، لیکن اس کا الٹا یہ سیدھا ایک تھا اسی لیے وہ کھاتے وقت بائیں کرتے ہوئے چلتے وقت بیٹھتے سے سوتے ہوئے کبھی اپنی زندگی کی گڑ کی میں گرفتار نظر نہیں آیا۔

اس روز جب امجد کی نہ بانی بھیج دیا کہ ہسیسی اور آفتاب کا قصہ دو رنگل چکا ہے۔ تو

کوڑکی بات پر مہر لگ گئی۔ میں پروفیسر سہیل سے مل کر آ رہا تھا سٹاف روم سے باہر ہی مجھے امجد مل گیا۔ کلاس میں صرف امجد سے آفتاب کی بے تکلفی تھی۔

یار یہ لڑکیاں بہت میسنی ہیں عشق بھی فل ساز کرتی ہیں اور پڑھائی بھی فل ٹاس کرتی ہیں تم غافل نہ رہنا۔۔۔۔۔ ماریں گی ساری بدنخیں۔۔۔۔۔ پڑھتے تم رہے گے اور فست یہ آئیں گی باجماعت۔۔۔۔۔

میں نے تکلفا پوچھا۔۔۔۔۔ عشق کون کون کر رہا ہے؟۔

”سب کر رہی ہیں ایک ایک لیکن سب کا عشق گھٹیا درجے کا ہے سوائے سیمی کے۔“

”سیمی۔۔۔۔۔ سیمی بھی؟“

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

میں بھی چوری چوری پرائز بانڈ خرید چکا تھا اس وقت میرے کان یہ سننے کے بے قرار تھے کہ میرا انعام نکل آیا ہے۔

”ہم دونوں اودل کے سامنے ایک بیخ پر بیٹھ گئے۔ میں نے بات کو مذاق میں اڑانا چاہا۔

”اچھا تو پھر کون کون عشق کر رہا ہے۔“

”طیبہ اور فرزانہ تو قابل اعتماد لڑکیاں نہیں ہے، یہ دو قدم آگے چلتی ہیں تو چار قدم پیچھے جاتی ہیں۔“

”کیوں؟“

”ان کا قصور نہیں ان کی فیملی بیک گراؤنڈ ایسی ہے مڈل کلاس کی لڑکی کو بدنامی کا بڑا ڈر ہوتا ہے۔۔۔۔۔ یہ عشق نہیں کرتیں شوہر تلاش کرتی ہیں۔“

”اور کر رہی؟“

”کوڑ؟ اس وقت میرے ساتھ فٹ جا رہی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ جب

سارے نوٹس نوٹوٹیٹ کر کے میں اسے دے دوں گا تو پھر جمال کی طرف مائل ہو جائے گی۔“

”بکومت۔۔۔۔۔“

امجد نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

”احمق آدمی جمال کے اباجی وائس چانسلر ہیں۔۔۔۔ کوثر بے چاری کیریئر بنانا چاہتی ہے وہ اس فیکٹ کو بھلا سکتی ہے کبھی۔۔۔۔ وہ کسی مرد کے انگوٹھے تلے زندگی بسر نہیں کرنا چاہتی۔“

میرے لبوں پر سیسی کا نام آنا چاہتا تھا، لیکن امجد ادھر ادھر کی باتوں کے چٹخارے لے رہا تھا میں سیسی کا نام کیسے لیتا۔

”ویسے یاریہ کوثر چوہی جیسی میرے دل کو بڑی لگی تھی پہلے پہل۔“

”اب کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے سوال کیا۔

”فائدہ۔۔۔۔۔ ان کم بختوں کے پیچھے مرنے کا۔۔۔۔۔ دفع ہو جائیں گی تو خط

کا جواب بھی نہیں دیں گی، بچوں کو گود میں بٹھا کر تو سن مکھن کھلایا کریں گی اور ہماری باتیں اپنے شوہر کو سنا کر ہنسایا کریں گی۔“

میں نے پھر سیسی کے متعلق پوچھنا چاہا لیکن چپ رہا۔۔۔۔۔

”انجیلا کا فکرا اچھا ہے اگر وہ کب ڈال کر نہ چلے۔۔۔۔۔ ہنا۔۔۔۔۔؟“ امجد

نے کہا

”شرماتی ہے۔۔۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔ ”لمبے قد کی لڑکیوں کو بیماری

ہوتی ہے کب کی“

”شرماتی نہیں ذرا عام نارمل لڑکی سے بھاری ہے اس کا کمپلکس ہے اسے کن کی

وجہ یہی ہے مانو نہ مانو۔۔۔۔۔“

میں نے ذہن میں انجیلا کے کمپلکس کو لانے کی کوشش کی لیکن مجھ پر سیسی کے

عشق کا ایسا خوف طاری تھا کہ مجھے انجیلا کا کچھ بھی یاد نہ آ سکا۔

”کبھی تم نے دیکھا نہیں جب وہ کلاس میں آتی ہے تو ہمیشہ اپنی کتابیں سینے کے

آگے رکھتی ہے۔ کم بخت کی ایک ہی چیز اچھی ہے اور اسی کا اسے کوہمپلکس ہے۔“

”آج سپاٹ سینوں والی لڑکیوں فیشن میں ہیں گدھے۔۔۔۔۔ جن کے کندھے

کی ہڑی کالر کی ہڈی اور دو چار پسلیاں نظر آتی رہیں۔۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔۔

۔۔۔“ میں چپ ہو گیا میں سیمی کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔

”مدقوق لڑکیاں Under nourished“ امجد نے سوال کیا۔

”ہاں تو اور کیا کھیتوں میں کام کرنے والی صحت مند لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ تو بہ

کرو، وہ تو پینڈو لگتی ہیں پینڈو۔“

”ہمیں تو اطالوی تصویروں کی لڑکیاں پسند ہیں ڈی ونچی اور رافیل کی لڑکیاں۔“

”وہ عورتیں تھیں۔۔۔۔۔ عورتوں کا زمانہ گزر گیا۔“

”سیمی جیسی لڑکیاں؟۔۔۔۔۔“ امجد نے بالاخر اس کا نام لیا۔

”بالکل ویسی۔۔۔۔۔ جس کی ہنسی کی ہڈی نظر آئے۔۔۔۔۔ ہوتھوں کی نیس

ابھری ہوں گالوں کی ہڈی اوپر کوٹھی ہوئی دکھائی دے۔“

”لعت بھیجو۔۔۔۔۔ میں تو ان کو اشتہاروں میں پسند نہیں کر سکتا، زندگی میں کیا

پسند کروں گا“

”اس لیے کہ تم پینڈو ہو۔۔۔۔۔ تمہاری بیک گراؤنڈ دیہاتی ہے۔۔۔۔۔ بھائی کو

بوٹی ہے پتہ نہیں اسے یہ مریل سیمی کیوں پسند ہے۔

امجد نے لمبا کش لگایا اور بولا۔۔۔۔۔ اور آفتاب کون سا اکسفورڈ کا پڑھا ہوا

ہے۔۔۔۔۔ بھائی کی بوٹی۔۔۔۔۔ پسند ہے۔“

یکدم آسمان سے بجلی گرجی اور میرے پر آتش باند پر غلط نمبر پرنٹ ہو گیا۔

”آفتاب کو۔۔۔۔۔؟“

”اچھا بننے کی کوشش مت کرو۔ تم اس کے روم میٹ ہو تم کو پتہ ہوگا۔“

”وہ مجھ سے ذرا بھی فری نہیں ہے۔“

”بابا ان کا عشق تو آخری مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔“ میں اپنے حسد کو چھپاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”اتنی جلدی

کیسے کیسے؟“

”یار آفتاب تو سیمی کو اپنی ماں سے بھی ملانے لے گیا تھا لیکن غالباً کشمیرن بڈھی

نے پسند نہیں کیا سیمی کو۔۔۔۔۔ میں بھی اس کی جگہ ہوتا تو نا پسند کرتا۔“

میراجی چاہتا تھا کہ کرائے کا ایک پاتھ اس کے جڑے پر ماروں لیکن اس وقت

مجھ مجھ سے بے حد دوستی کا اظہار کر رہا تھا۔

”تم اس قدر غائب مت رہا کرو قیوم۔۔۔۔۔ کچھ کلاس والوں کے حالات پتہ

ہونے چاہئیں۔ ایک روپیہ ہے؟“

میں نے جیب میں ہاتھ مارا۔

”یار یہ منی بس والے ذرا لحاظ نہیں کرتے۔ ساری بڑی بسیں دس پیسے لے کر

سوار کر لیتی ہیں لیکن یہ روپیہ لیتے ہیں پورا ماڈل ٹاؤن کا۔۔۔۔۔ اس پاکستان کا کیا

بنے گا۔“

وہ روپیہ لے کر چلا گیا۔ لیکن میں نہ پاکستان کے بارے میں سوچ سکا نہ بسوں

کے متعلق۔۔۔۔

ن دنوں مجھ پر سیمی کے عشق کا دورہ پڑا ہوا تھا جب عشق اظہار سے ناواقف ہو تو

اس میں اندر ہی اندر بہت زیادہ تاخیر پیدا ہو جاتا ہے سیمی کی ہر بات کو غلط سمجھنا

آسان تھا وہ ہر لڑکے کو دلچسپی اور تجسس سے دیکھنے کی عادی تھی جنس مخالف سے ایک

خاص حد تک دوستی کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو گھر آئی

صحبت کو سوغات کی طرح سمجھ کر تھینک یو کر کے رکھ لیتی ہیں مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھی

ایسے رویے سے معتوب و شق اس وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دونوں طرف برابر آگ لگی ہوئی ہے حالانکہ وہ صرف نائیس Nice ہو رہی ہوتی ہیں۔

ہم دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے لیکن میری فیملی بیک گراؤنڈ کچھ ایسی تھی کہ میں تو ازن خود کبھی اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کی جرأت کر سکا نہ ہی باتوں میں اپنی قلبی کیفیت بیان کر سکا میں اپنی جماعت کا فلا سفر تھا۔ وہ بڑی بڑی دیر تک میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی رہتی۔۔۔۔۔ لیکن یہ تمام گفتگو علمی نظریات پر بالکل غیر ذاتی ہوتی اسی لیے میرا معمول تھا کہ کالج جانے سے پہلے ایک خط تحریر کرتا اس میں اپنی تمام محبت کو کھلم کھلا ظاہر کرنے کی کوشش ہوتی۔ کالج سے واپسی پر یہ خط پھاڑ دیتا۔ اور اپنی ڈائری میں احتیاط سے وہ تمام باتیں رقم کرتا جو اس کے اور میرے درمیان ہوتی رہتی تھیں۔۔۔۔۔ میں سیمی کے رویے سے کسی تشکیک کا شکار نہیں تھا میں تو الٹا اس نشاط کے سہارے زندہ تھا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے سیمی کا خاموش رویہ اس پر صادر ہے۔

امجد کے جانے کے بعد سمجھ نہ آرہی تھی کہ پچھلے تمام وقفے کو کس کھائے میں ڈالو کرسمس کی چھٹیوں میں صرف چند دن تھے میں ان چھٹیوں سے ویسے ہی خوف زدہ تھا کہ اس خوف میں یوں اضافہ ہوا۔ امجد کے جانے کے بعد سیمی آگئی۔ ہم دونوں دیر تک کیفے ٹیریا میں بیٹھے رہے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ میں بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے چلے گئے اور کوئی بھی اندر کی بات فی کرہ امجد کی باتیں سن کر اب مجھے سمجھ آگئی کہ دراصل وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ جب ہم اٹھنے والے تھے تو وہ بولی

”میں پڑھائی چھوڑ دینا چاہتی ہوں قیوم۔“

”ہیں ہیں؟ یہ کیا عقل ہے؟“

”بس مجھے دل چسپی نہیں رہی“

”فائنل میں وقت کون سارا گیا۔“

وہ آج ملک شیک کے ساتھ آلو کے چپس نہیں کھا رہی تھی حالانکہ یہ دونوں چیزیں وہ ہمیشہ اکٹھی انڈالتی تھی۔

”میں سوشیا لوجی کے قابل نہیں ہوں۔۔۔۔۔ نہ سوشیا لوجی پرے قابل ہے۔۔۔۔۔ یہ ایک جھانسا سبکٹ ہے۔“

”اچھا منہ بند کرو۔“

”میں سوچتی ہوں اگر میں پنڈی چلی جاؤں تو؟“

”وہاں جا کر کیا کرو گی۔“

”صاف ستھرا شہر ہے۔۔۔۔۔ وہاں کوئی Job مل جائے گی میں ہوٹل لائف سے بور ہو گئی ہوں۔“

ہر ماڈرن لڑکی بہت جلد بور جاتی ہے اس لیے میں نے اس کی بات سنجیدگی سے نہ لیا۔

لیکن وہ سنجیدہ تر ہوتی گئی۔

”قوم۔۔۔۔۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤ۔۔۔۔۔ جب کوئی آدمی ناکام ہو جاتا

ہے تو پھر وہ اپنے آپ کو Analyze کرتے کرتے فلاسفر بن جاتا ہے۔۔۔۔۔ میں

بھی اپنے پرانے کافرق بھول گئی ہوں کبھی کبھی لگتا ہے اگر میں ہوٹل چھوڑ کر اپنے

گھر جا کر کال بل بجاؤ تو گھر والے مجھے ایسے ملیں گے جیسے اپنے ہوں کبھی لگتا ہے

اگر میں اپنے گھر کے برآمدے میں جا کر کسی کو آواز دوں گی تو کوئی باہر نہیں نکلے گا۔۔۔

۔۔۔ سب میری شکل دیکھ کر لوٹ جائیں گے۔۔۔۔۔ مجھے پہچان نہیں سکیں گے۔۔۔

۔۔۔ کیا میں جنسی طور پر Frustrated ہوں قوم۔“

”کون کہتا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے محبت سے سوال کیا۔

”کوثر کہہ رہی تھی کہ میں بہت زیادہ Frustrated ہوں۔“

میں نے اسے پیار سے دیکھ کر کہا۔

”جب تمہارا گھر یہاں لاہور میں تو تم ہوٹل میں کیوں رہتی ہو سیمی؟“

اس نے ملک شیک کی نلکی دو حصوں میں توڑ کر میز پر پھینکی پھر لمبی آہ بھری، اور

بولی۔۔۔۔۔ ”وہ گھر میرا خرچ تو اٹھا سکتا ہے۔۔۔۔۔ میرا ابو جھ نہیں اٹھا سکتا۔“

”کیا مطلب؟“

”اوہ ہو۔۔۔۔۔ زیادہ سوال مت کیا کرو بڑے پینڈو لگتے ہو۔“

”میں کسی تجسس کے زیر اثر نہیں پوچھتا سیمی۔۔۔۔۔“ میں نے اپنا ہاتھ اس کے

ہاتھ پر رکھ دیا۔

”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں تمہارا دل بڑا ہمدرد ہے۔۔۔۔۔ کبھی کبھی

مجھے لگتا ہے جیسے تم میری زندگی میں بڑا اہم رول ادا کرو گے۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیوں

مجھے Feelings ہیں اس قسم کی! تم مجھے بچاؤ گے کبھی نہ کبھی کسی آفت سے۔“

یہ لمحہ اظہار محبت کا تھا لیکن وہ اس جملے کے باوجود تھکی ہوئی اور پریشان نظر اارہی

تھی میں خاموش رہا۔

”کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم دونوں ہوائی جہاز سے سفر کر رہے

ہیں اچانک ہوائی جہاز Crash ہو گیا۔ کچھ باقی نہیں بچا نہ جہاز کا نہ ہم دونوں کا۔“

”اچھا خواب ہے۔۔۔۔۔ اگر کچھ بچ جاتا تو خواب برا ہوتا۔“

وہ چپ ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے کینوس کے تھیلے میں ہاتھ مارا

”قیوم مجھے ایک پیکٹ لے دو۔۔۔۔۔ چیونگ گم کا۔“

خوش قسمتی سے میرے پاس پیسے تھے میں نے اسے چیونگ گم خرید دی۔

اس روز وہ بہت قریب ہو کر دوڑ دوڑتی تھی۔ جیسے پتنگ کی ڈوری ہاتھ میں ہوا اور تکل

دور دور رہی ہو۔

”تم سوشیا لوجی کے سٹوڈنٹ ہو قیوم۔۔۔۔۔ کبھی تم نے سوچا کہ پاکستان کی

اصل بد نصیبی کیا ہے؟“

ایسے وقت میں یہ سوال بہت عجیب تھا لیکن وہ اس طرح باتیں کرنے کی عادی تھی یکدم بہت جذباتی ہو کر وہ بات موڑنے کی غرض سے بہت ہی معروضی بن جاتی۔

”در اصل پاکستان کی سب سے بڑی ٹریجڈی وہ Generation ہے جنہوں نے پاکستان بنایا آئیڈیل کی خاطر۔۔۔۔ اور اب وہ خود نظریہ پاکستان کو کیا کریں گے۔“

اب ہم دونوں خالص طالب علموں کی طرح دیر تک پاکستان نظریہ پاکستان موجودہ پودا اور پچھلی نسل پر باتیں کرنے لگے ابھی کچھ دیر پہلے وہ بے جان تھی۔ اس نے اپنی ٹانگیں سامنے میز پر رکھی ہوئی تھیں اور گلابی چشمے کو کیٹوس کے بیگ پر لا پڑائی سے ڈال چھوڑا تھا اب وہ گردن آگے کیے دونوں ہاتھوں کے اشاروں سے باتیں کر رہی تھی اور ایسی تاریکی طرح زندہ جس میں سے کرنٹ گزر رہا ہو۔

”یہ قوم۔۔۔۔ پاکستان صرف دو نسل کی کارگزاری ہی تو ہے۔۔۔۔ یہ پچھلے پچیس سال جس میں ہمارے ماں باپ بوڑھے ہوئے اور ہم جوان۔۔۔۔ یہ وقفہ۔۔۔۔ یہ ایک کڑا ہے میں گزرا ہے سب نے اس میں اتنا کچھ ڈالا ہے۔۔۔۔ ہماری Generation نے ہمارے ماں باپ نے۔۔۔۔ اور آج تک نہ کچھ میٹھا کچا ہے نہ نمکین ہے نا۔“

”تم سوشیالوجی کے طالب علم ہو کر میری بات میں دلچسپی نہیں لے رہے لعنت“

”لے رہا ہوں۔“

”غور کرو۔۔۔۔ سوچو زرا۔۔۔۔ تجزیہ کرو ساری پچوشن کا پاکستان کا جو امیر طبقہ ہے وہ کس طبقہ میں جوان تھا اور غریب گھرانوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ادھر آ کر یعنی مقابلہ نہ تھا۔ اس لیے یہ طبقہ یہ Ambitions طبقہ بہت آگے نکل گیا۔ اس

بنک بیلنس بیرونی ممالک میں ہیں وہ کسی جگہ جا کر الحرص میں مبتلا لوگ کمائے جاتے ہیں۔ ان کی بیویاں گھروں میں ہیں۔ پر یہ وِشَق کیے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ تمہیں پتہ نہیں I have gone through all کنے والی بیویاں بوڑھی ہو گئی ہیں شوہروں کو کسی مقام پر پہنچانے کے بعد اب وہ ناکارہ ہیں پرانے صوفے کی طرح ان کا ہر سپرنگ ڈھیلا ہے۔۔۔۔۔ اور مجھے جیسی لومڑیاں پھرتی ہیں شہر میں اور ان کے لیے ہر انگور کا گچھا میٹھا ہے۔۔۔۔۔ واہ کیا Dramatic بات ہے۔۔۔۔۔ ہے نا۔“

”آج تمہیں کیا ہو گیا ہے سہی۔“

”کوڑھ ٹھیک کہتی ہے میں Frustrated ہوں۔۔۔۔۔ دراصل میں۔۔۔۔۔ میرے ماں باپ؟۔۔۔۔۔ میں کیسے تمہیں سمجھاؤں قیوم۔۔۔۔۔ میا باپ پاکستان بنانے والی پود کی طرح بوڑھا ہو رہا ہے اس نے اپنی بوڑھی مردمیت کے سامنے دولت بنگلے بنک بیلنس کی سکرین لگا کر اپنے آپ کو بہت Potent کر لیا ہے۔۔۔۔۔ اس کا وقت لومڑیوں کے لیے ہے۔۔۔۔۔ بیٹی بڑا بو جھگتی ہے اسے۔“

”تمہیں اپنے باپ کے متعلق ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں“

”اور میری ماں کے ہاتھ پلے کچھ نہیں۔ وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتی، مجھے کیا بچائے گی۔ تم نے شہر کی لومڑیاں دیکھی ہیں جنہیں ہر بیوٹی شاپ فارن ایڈ پہنچاتی ہے ان کے پاس نقلی پلکیں ہیں کئی کئی ہنر پیس ہیں۔۔۔۔۔ میک اپ کے علاوہ آزادی ہے ان سے میری ماں کیا لڑے گی۔“

”تمہارے امی نے اجازت کیسے دی ہوٹل میں رہنے کی۔“

”اوہ چھوڑو جی۔۔۔۔۔ میری ممی کسی بات کی اجازت نہیں دیتیں وہ کسی بات سے Agree نہیں کرتیں اور سب کچھ مان جاتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ شراب نہیں پیتیں لیکن کا کٹیل پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں وہ میرے باپ کے مشاغل سمجھتی ہیں

لیکن اعتراض اس لیے نہیں کر سکتیں کہ وہ ڈیڈی کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ وہ بیوٹی پارلر سے حسن کاری کرواتی ہیں لیکن دل سے ان کا عقیدہ ہے کہ کوئی بوڑھی عورت عمر سے لڑ نہیں سکتی۔۔۔۔۔ بھائی صاحب ہم تو ایسے گھر میں رہتے آئے ہیں جہاں ایک ماں کو بوڑھا ہونے کی اجازت بھی نہیں ملتی تھی جو ان ہونے کی اجازت کب ملے گی۔۔۔۔۔ تم کو کیا پتہ ایسا گھر کیا ہوتا ہے۔ میری ماں بوڑھے ڈھانچے کے ساتھ نو جوان لومڑیے برابر بھاگ رہی ہے۔۔۔۔۔ اوہ یہ سب کچھ یہ میرے ماں باپ ان کی زندگی اتنی مضحکہ خیز ہے۔۔۔۔۔ اتنی بچکانہ ہے کہ میں۔۔۔۔۔ میں اس میں نہیں جاسکتی واپس کبھی نہیں۔۔۔۔۔ بتاؤ جب ماں ہی بیٹی سے ڈرتی ہو تو اجازت کون دے گا۔۔۔۔۔ میں کس سے اجازت لے کر ہوٹل آتی۔ بتاؤ ناں۔“

”کبھی ماں ڈری ہے بیٹی سے۔۔۔۔۔ حد کرتی ہوں تم۔“

”ڈرتی ہے ہر وہ ماں۔۔۔۔۔ جو بچے میں جو ان تھی آج اپنی بیٹی سے ڈرتی ہے اب گھروں میں بیٹیاں حکومت کرتی ہیں۔۔۔۔۔ ڈیڈی کی کار، ڈیڈی کی توجہ۔۔۔۔۔ ڈیڈی کی چپک بوک سیکھ بیٹی کے لیے ہے بیٹی کی سہیلی کے لیے ہے سہیلی کی سہیلی کے لیے میں۔۔۔۔۔ اپنی ماں سے پیار کرتی ہوں قوم۔۔۔۔۔ تم کو کیا پتہ میں اس کو مدد کا صدر بنا کر خود پر ائم منسٹر بننا نہیں چاہتی۔“

بڑی دیر خاموش رہی۔

”گھروں میں کچھ جھوٹا سچا دبدبہ ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ جھوٹا سچا پیار۔۔۔۔۔ ورنہ ہوٹل بہتر ہے۔“

وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے اپنا ہاتھ اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔۔۔۔۔ ”آج میں نے تمہیں بہت بور کیا۔۔۔۔۔ ہے نا۔“

”ذرا بھی نہیں۔۔۔۔۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ تم کتنی صاف اردو بولنے لگی ہو۔۔۔۔۔“

”ہاں وہ بھی۔۔۔۔۔ ہے“ وہ اتھ کھڑی ہوئی۔

”جاری ہو سیتی؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں سوچتی ہوں سوشیالوجی ایم اے کا بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا یہ بھی

بڑا Hoax ہے میرے ممہ دیڈی کی طرح۔۔۔۔۔“ کچھ دیر وہ کھڑی رہی اور پھر

بولی ”دیکھو آفتاب ملے تو میرا سلام کہنا“

جس وقت سیمی رخصت ہوئی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کالج سے

ہمیشہ کے لیے جاری ہے جس وقت اس نے سلام بھجوایا تب بھی مجھے شبہ نہ گزرا کہ

کوئی عجیب بات ہونے والی ہے حتیٰ کہ جس وقت میں نے آفتاب کو سیمی کا سندیسہ دیا

اس وقت بھی مجھے خیال نہ آیا کہ سیمی کا کالج میں آ کر ی دن تھا اور میرے ساتھ آخری

دو پہر تھی۔

”سیمی تمہیں سلام بھجواری تھی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔؟“ لالعلقی سے آفتاب نے کہا۔

ہم دونوں نے ایک نے ایک دوسرے کو لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور پھر چپ

ہو گئے۔ شاید آفتاب کو بھی معلوم نہ تھا کہ سیمی ہوٹل چھوڑ کر پنڈی جاسکی ہے۔

کچھ دن سیمی کا چرچہ رہا ہم جماعت اس کا ذکر کرتے رہے پھر لیٹ فیس والوں

کے ساتھ بورڈ پر اس کا نام نظر آتا رہا۔ پھر اچانک آفتاب کی منگنی ہو گئی کلاس کو ایک

نیا موضوع ہاتھ آ گیا۔ یہ منگنی اس لیے انوکھا ٹاپک تھی کیونکہ اب تک سیمی آفتاب کا

سکیڈل عام ہو چکا تھا۔ لڑکیاں آفتاب کی غیر موجودگی میں اس عشق کی بڑی

تفصیلات باہم پہنچاتی تھیں۔ لیکن آفتاب نے سامنے سب سیمی کا نام لینے سے گریز

کرتے تھے۔

فائنل امتحان سے ٹھیک ایک ماہ پہلے آفتاب نے بھی ہوٹل چھوڑ دیا پھر ایک دن

وہ شادی کے کارڈ بانٹنے آیا اور مستقل غائب ہو گیا۔۔۔۔۔ امتحانوں کی وجہ سے بہت

دن تک ہم اسے بھی یاد نہ کر سکے۔

امتحانوں سے پہلے دن اور رات کی سمتیں بدل جاتی ہیں کبھی گھنٹہ میلوں میں کتنا ہے اور کبھی سارا دن ملی میٹر میں سکڑ جاتا ہے امتحان سے قبل ہونے والی چھٹیاں ہو چکی تھیں آفتاب کی شادی کا کارڈ ان چھٹیوں سے دو دن پہلے آیا تھا۔ ہم سب نے اپنے اپنے اکارڈ لیے اور کوڑنے سیسی کا کارڈ بھی لے لیا۔ آفتاب کے جانے کے بعد کچھ دیر تک اس کی شادی دہن کا نام کارڈ کی پرنٹنگ، لفافے کا سائز آفتاب کی شخصیت زیر بحث رہی پھر امتحان ڈیٹ شیٹ نوٹس کی باتیں ہونے لگیں۔ کسی نے سیسی جیسی بوگی لڑکی کا نام نہ لیا۔

امتحانی چھٹیوں سے پہلے گلاب کے سفید پھول جو کالج کی سڑک کے ساتھ ساتھ نظر آتے تھے ختم ہو چکے تھے بہار ختم تھی بھر پور گرمی ابھی آئی نہ تھی صبح اٹھنے کو جب نہ چاہتا تھا رات کو پڑھائی کرنے سے دل بھاگتا تھا۔ سہ پہر کو اچانک تمپرچر بڑھ جاتا اور قبیلہ کرنے کو جی چاہتا امتحانوں میں وقت کم رہتا جا رہا تھا لیکن اسب ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں کی باتیں زیادہ یاد آنے لگی تھیں دماغ میں امتحان کی گھنٹی بجتی رہتی۔ جس سے Guilt میں اضافہ ہوتا۔ حسن اتفاق سے ہر فلم ہاؤس میں اب دھڑا دھڑا اچھی فلموں کی نمائش شروع ہو گئی تھی جمال امجد اور میں ہوٹل رہ گئے تھے۔ لڑکیاں گھروں میں مقید ہو چکی تھیں ہر اچھی فلم دیکھنے کے بعد ہم تینوں قسم کھاتے کہ امتحانوں تک کوئی فلم نہیں دیکھیں گے۔ لیکن خبر ملتے ہی خدا کیسے پروگرام بن جاتا کورس کے علاوہ سب کتابیں دل چسپ اور پر از معلومات نظر آتیں۔ ہم تینوں قریباً ہر روز مختلف بک ڈپوز کتاب گھروں کے چکر لگاتے ان کتابوں کو جو بک شالوں پر بکتی تھیں خریدنے کی ہم میں استطاعت نہ تھی لیکن اصلی پڑھائی سے جان بچانے اور ضمیر سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا بک شالوں پر پھیرنے سے

یہ تسلی رہتی کہ ہم تیاری کر رہے ہیں جمل اور امجد نے تو یو ایس آئی ایس کا کارڈ بھی بنوا لیا تھا وہ اپنے آپ کو جل دینے وہاں بھی چلے جاتے میں انارکلی میں فٹ پاتھ پر بکنے والی پرانی کتابیں دیکھتا رہتا پھر پبلک لائبریری چلا جاتا۔۔۔۔۔ ان مشاغل سے مجھے یسوی کے متعلق سوچنے میں بڑی مدد ملتی تھی اپنی میز کرسی کے خیالوں کا انسداد باجائیڈ آؤٹ ہونے لگتا بک سٹالوں پر فٹ پاتھ کنارے اور پبلک لائبریری میں دماغ کو کسی جہت پر لگانا نہیں پڑتا تھا جوں جوں امتحان قریب آرہے تھے گھبراہٹ زیادہ اور پڑھائی کا گراف گر رہا ہے اب ہم تینوں نے داڑھیاں رکھ لی تھیں۔۔۔۔۔ لیکن میں شیو سے زیادہ خط بنوانے میں وقت صرف کرتا جب بھی ہم تینوں ملتے پڑھائی کے متعلق نا آسودہ گفتگو ہوتی ہر روز ہم تینوں فیصلہ کرتے کہ گھر ہی چلے جانا بہتر ہے لیکن دوسرے دن سب ہوسٹل میں ہر تے۔

میں اپنے گاؤں چند رائیں جاسکتا تھا کیونکہ وہاں ماں بھی نہیں تھی اور بجلی کا بھی انتظام نہیں تھا۔ ساندہ کلاں میں بڑے بھائی مختار رہتے تھے لیکن میں کبھی ان کے پاس نہیں رہا۔ اس لیے میں امتحان کی تیاری کے لیے کسی کسی نے ماحول میں جانے کو تیار نہ تھا۔۔۔۔۔ چند راں میں بغیر بجلی کے تیاری ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ دسویں کے بعد میں گھر چھوڑ کر قصور نہ چلا گیا ہوتا۔ ذہنی طور پر چند را سے کٹ کر اب امتحانی چھٹیاں گزارنے میں وہاں کیسے جاسکتا تھا۔

کئی بار مجھے خیال آیا کہ ماموں کے پاس قصور چلا جاؤں۔۔۔۔۔ وہ مجھے اوپر والی منزل کا کمرہ دیں گے رات کو بلے شاہ کے مزار سے قوالیوں کی آواز آئے گی۔ صبح صبح ماموں گرم گرم پوریوں کا ناشتہ لائیں گے۔۔۔۔۔ سب میری پڑھائی کا فکر مجھ سے زیادہ کریں گے۔۔۔۔۔ لیکن اب مجھے ایسے ماحول سے وحشت ہوتی تھی۔

دراصل میں کسی ایسے ماحول میں جانا نہ چاہتا تھا جس میں زیادہ وقت یسوی کے متعلق سوچ نہ سکوں۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیوں مجھے احساس ہوتا تھا کہ اگر میں نے

ہوسٹل کا کمرہ چھوڑا تو کہیں اس کے درودیوار کے ساتھ ہی سیمی بھی پیچھے نہ رہ جائے۔

آفتاب کی شادی سے ایک رات پہلے کا واقعہ ہے۔

میں بنیان پا جامہ پہنے اپنا بستر گول کر کے کمرے کے پیچھے لگائے پڑھ رہا تھا، کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ دستک گول کر جاؤں کیونکہ ہوسٹل کے لڑکے کافی وقت ضائع کر دیتے تھے لیکن پھر آواز آئی۔

”قیوم۔۔۔!“

میں نے دروازہ کھولا۔۔۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔

سیمی کو دیکھ کر میں پسینہ میں نہا گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ دلیلمبی اور زرد لگ رہی تھی آج اس کے کٹے ہوئے سرخ بال کھلے تھے اور کینوس کا بیگ اس کے ساتھ نہ تھا وہ پہلے جیسی نہ تھی۔۔۔۔۔ گویا ہر طور پر اس میں کوئی خاص تبدیلی بھی نہ آئی تھی۔

”آپ کب آئیں۔۔۔ آئے ناں۔۔۔“

”ابھی آٹھ بجے کی فلائٹ سے۔۔۔ اپنا سامان وائی ڈبلیو اے میں رکھا۔۔۔“

۔۔۔ اور یہاں۔۔۔۔۔

”گھر نہیں گئیں آپ؟۔۔۔۔۔“ میں نے تکلف سے پوچھا۔

”کون سا گھر؟۔۔۔ ابھی تک تم میرا گھر نہیں بھولے۔“

وہ رول کیے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔۔۔ اس کے کولہے کی ہڈیاں تنگ جینز میں بہت نمایاں تھیں۔

”ویک اینڈ کے لیے اتنی ہوں۔۔۔۔۔ وائی ڈبلیو میں میری ایک دوست رہتی ہے۔ ویک اینڈ کے لیے رکھ لے گی مجھے۔“

مجھے سمجھ نہ آرہی تھی کہ اس سے کس موضوع پر بات کروں۔

”آپ تو کالج سے ہی گئیں۔۔۔۔۔ بغیر ملے ملائے۔“

”جانا پڑتا ہے۔“

میں نے اس بوگی، ٹیڑھی، کم شکل، عاشق غیر کو دیکھا۔۔۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں تھی۔ لیکن پتہ نہیں میں ہر قیمت پر، ہر موسم میں، ہر قسم کے حالات میں اس کا اسیر تھا۔

”تم بہت دبلے ہو گئے ہو۔۔۔۔۔ اب تم باند فلمز میں ہیرو نہیں بن سکتے۔“

یہ لمحہ عرض حال کا تھا۔۔۔ لیکن جتنی جلدی اس نے میرے متعلق یہ جملہ کہا اتنی ہی سرعت سے وہ غائب ہو گئی۔

”تم نے پوچھا نہیں کہ میں۔۔۔۔۔ کیوں آئی ہوں لاہور؟“

میں نے اب بھی سوال نہ کیا۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ آفتاب کی شادی پر آئی ہوگی
”کون کون جا رہا ہے شادہ پر“

”بہال اور امجد۔۔۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور تم۔۔۔۔۔“

”آفتاب میرا روم میٹ تھا۔۔۔۔۔ میرا دوست نہیں تھا۔۔۔۔۔ شاید میں تمہیں

پہلے بھی بتا چکا ہوں۔“

”مجھے کوثر نے کارڈ بھیجا تھا۔۔۔۔۔ مینی۔۔۔۔۔ کبھی خط نہیں لکھا اور کارڈ پوسٹ

کر دیا۔ قیوم۔۔۔۔۔ تم مانو گے تو نہیں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے پتہ چل گیا تھا پہلے ہی کہ اس

کی شادی کس دن ہوگی میں نے کارڈ ملنے سے بہت پہلے کل کی تاریخ اپنی نوٹ بک

میں لکھی تھی۔۔۔۔۔“

اس نے نوٹ بک دکھانے کے لیے بیگ تلاش کیا۔۔۔۔۔ ”افسوس میں نوٹ

بک کینوس والے بیگ میں بھول آئی ہوں۔“

”تمہیں کیسے شک تھا۔۔۔۔۔ کیسے؟“

”بس مجھے معلوم تھا۔۔۔ کہ وہ چودہ تاریخ کو شادی کرے گا چودہ تاریخ اتوار کا دن۔۔۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ہوں گے اور اس کی شادی کی رات کو بارش ہوگی گرج چمک کے ساتھ۔۔۔ تم جاؤ گے نا اس کی شادی پر۔“

”کس لیے۔۔۔؟ میں وہاں کسی کو نہیں جانتا۔۔۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔“

”تمہیں جانا پڑے گا قیوم۔۔۔ میری خاطر۔۔۔ دیکھو میں پنڈی سے محض اس لیے آئی ہوں۔۔۔ تم مجھے آکر بتانا کہ دولہن کیسی ہے؟“

”تم خود چلی جاؤ تمہارے پاس کارڈ ہے۔۔۔ کوثر کا بھیجا ہوا۔۔۔ بلکہ تم تو دولہن کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتی ہو۔“

”ہاں جا سکتی ہوں، دیکھ سکتی۔۔۔ ہوں لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔“

”بس قیوم میں بہادر لگتی ہوں لیکن صرف لگتی ہوں اندر سے نہیں ہوں۔۔۔۔۔ قیوم پلیز فارمانی سیک۔۔۔ آفتاب کی بیوی کو دیکھ کر آنا۔۔۔ میں نے سنا ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔“

”تمہیں کس نے بتایا“

”وہ آفتاب کیلون ہے۔۔۔۔۔ ویسی ہی ہوگی آفتاب جیسی۔۔۔۔۔“ سیسی کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسو آگئے

”تم جاؤ گے نا۔۔۔ میں نے اس کی کوٹھی دیکھی ہے کل ڈیوس روڈ کی اس کوٹھی میں کتنی روشنی ہوگی۔۔۔ آفتاب دولہا بن کر نکلے گا تو۔۔۔ نو۔۔۔ تم اسے دیکھنا قیوم۔۔۔۔۔ وہ وہ۔۔۔۔۔“ یکدم چپ ہو گئی۔

”چلو ہم اکٹھے چلیں گے۔“

وہ ڈر گئی۔

”ناں جی۔۔۔۔۔ بھلا میں کیسے جاسکتی ہوں وہاں۔۔۔۔۔ اس کی بے بے مجھے قتل کر دے گی فوراً۔۔۔۔۔ کون جانے آفتاب بھی برا مان جائے۔“

میں نے سیمی کا ہاتھ پکڑا اور محبت سے کہا۔۔۔۔۔ ”سنو سیمی۔۔۔۔۔ گواپنی نصیحت پر خود عمل نہیں کر سکتا۔ لیکن میرا فرض ہے کہ ایک بار میں صورتحال سے تمہیں اچھی طرح روشناس کراؤں۔“

”مثلاً؟“

”تم کیا کر رہی ہو پنڈی میں۔“

”ایک ٹریول ایجنسی ہے۔۔۔۔۔ اس میں ملازم ہوں۔“

”تم ایم اے کرو واپس آ کر مکمل کرو اپنی تعلیم۔“

وہ اونچے اونچے ہنس دی۔

”میں تعلیم یافتہ ذہین عورتوں سے نفرت کرتی ہوں کم بخت بلا کی جھوٹی ہوتی

ہیں۔ اور پھر جب تک آفتاب لاہور میں ہے میں یہاں کیسے آسکتی ہوں۔۔۔۔۔

سب کچھ پھر سے شروع ہو جائے گا۔“

”ذرا غور سے سوچو۔۔۔۔۔ آفتاب کی شادی ہو رہی ہے تم کیوں خود بخود دیس

نکالا لے رہی ہو۔۔۔۔۔ اپنے ماں باپ سے سمجھوتہ کر لو سیمی۔۔۔۔۔ مشرق میں سب

اولاد سمجھوتے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔“

وہ چپ چاپ بستر کی چادر میں سے تاریں نکالنے لگی۔

”قیوم بڑی مشکل ہے، میں تو سمجھوتہ کر لوں لیکن۔۔۔۔۔ لیکن میری وجہ سے ان

دونوں کا آپس میں بڑا سمجھوتہ کرنے پڑتے ہیں ڈبل بیڈ پر سونا پڑتا ہے۔ اکٹھے

تقریبات میں جانا پڑتا ہے جب بھی میں گھر پر رہوں ان دونوں کر میری خاطر محبت

کی فضا کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ بجلی، گیس ہاٹ کولڈ واٹر کی طرح بڑا اہل آتا ہیجبت کا۔

۔۔۔ وہ دونوں بے چارے بڑا ہاڈھی جوان جوان بننے کی کوشش کرتے ہیں قیوم۔

--- جب وہ دونوں میری وجہ سے سمجھوتے کرتے ہوں --- اب بھی ---“

”شاید --- لیکن اب میں دیکھ نہیں سکتی۔“

میں نے سوال کرنے کے لیے منہ کھولا اور پھر چپ ہو گیا۔

”پوچھو --- پوچھو --- پوچھو ناں؟“

میں بڑی دیر چپ رہا اصل سوال ہمیشہ نکلانی کی گرہ بن کر میرے ہی حلق کا ناطقہ بند کرتے رہے ہیں۔

”آفتاب کو بھی بڑے سمجھوتے کرنے پڑتے تھے۔ میری وجہ --- سے! اسی

لیے تو میں نے کالج چھوڑ دیا۔ مجھے بڑا ترس آتا تھا آفتاب پر۔“

”کیوں؟ --- کیوں آخر؟“

ایک بار پھر میں نمکین پانی تھا اور وہ مجھ میں سلورنائیٹریٹ کے تلچھٹ کی طرح بغیر ملے ہوئے بیٹھتی جا رہی تھی۔

”کالج میں اسے مجھ سے محبت کرنی پڑتی تھی۔ گھر جا کر اپنی کشمیرن بے بے کے

ساتھ شادی کے امور میں دل چسپی لینی ہوتی تھی۔ پھر شام کو اپنی کزن کے گھر جانا

ایک معمول تھا اس کا۔۔۔ اللہ جانے وہ مجھ سے محبت کرنے میں زیادہ مجبور تھا کہ

کزن کے ساتھ شادی کروانے میں۔۔۔۔۔ اب تو یہ باتیں میں اس قدر سوچ چکی

ہوں کہ اگر مجھے جواب مل بھی جائے تو میں داعیہا یہی کچھ سوچتی رہوں گی باقی ساری

عمر ---“

آفتاب کی محبت!۔۔۔ اس کے اظہار کا بھی ابھی تک مجھے موقع نہ ملا تھا۔

سیمینے مجھے آستین سے پکڑ کر التجا کی۔۔۔۔۔ ”سنو قیوم تمہیں شادی پر جانا ہوگا۔

جانا پڑے گا دیکھو تم انکا نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ وعدہ کرو۔۔۔۔۔ پر مٹس۔“

”وعدہ۔“

”ایسے نہیں ہاتھ ملا کر۔۔۔۔۔ وعدہ!“

میں نے سیمی کا ہاتھ گرفت میں لے لیا۔

جلتی استری پر چھن سے پانی باند پڑی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پڑتے ہی غائب ہو گیا۔

”زیبا کے ہونٹ پر تل ہے۔۔۔ غور سے دیکھنا قیوم بائیں طرف گہرے سبز رنگ کا تل۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا۔۔۔ بس مجھے پتہ ہوتا ہے۔۔۔ یاد رکھنا قیوم ہونٹ پر۔۔۔۔۔“

اس کا چھن سے غائب ہو جانے والے ہاتھ میرے گرم ہاتھ میں تھا۔
پہلی بار میں نے سوچا کیا میں جنسی طور پر Frustrated ہوں۔

شادی انٹرکونٹی نینٹل میں تھی۔ گہری شام کو ہائی ٹی۔۔۔ سارا انتظام سوئمنگ ٹینک کے ارد گرد کی غلام گردشوں میں تھا۔ مجھے کوئی مجبوری نہ تھی لیکن میں جمال اور امجد سے بہت پہلے وہاں پہنچ گیا۔ یہ تاجر پیشہ لوگوں کی شادی تھی۔ اس میں شرکت کر یوالے لوگ شہر کے Elite تھے۔ قالین فروشوں نے اونچے انسروں سے لے کر فلمی ایکٹرسوں تک سب قابل ذکروں کو بلا رکھا تھا۔ کچھ لوگ میری طرح تھے۔ ان کی آفتاب کے گھر والوں سے جان پہچان نہ تھی وہ سب وقت کٹی کے لیے سگریٹ پینے بیروں کو دیکھ کر مسکرانے اور بے مصرف چکر لگانے میں مصروف تھے۔ ابھی دو لہن اپنے آرائشی منڈپ میں نہیں آئی تھی خوش لباس کشمیری لڑکیاں، اور فر بہ جسم عورتیں شادی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

پھر آفتاب بر اس سمیت پہنچا۔ اس کے ساتھ جمال اور امجد بھی تھے۔

بر اتوں کو لوٹنے کا عہد گزر چکا۔ لیکن آفتاب کے آگے آتے دیکھ کر میرا جی چاہا

کہ اسی وقت کوئی چھ فٹا نو جوان کہیں سے آجائے پھر آفتاب کو قتل کر کے وہ اس کی زیبا کے ساتھ فرار ہو۔۔۔۔۔ اسے سندھوری میز پوش ان پر سجے ہوئے بھاری بھاری کاسنی برتن پیسٹری سینڈ الیش ٹرے تتر بتر ہوں۔۔۔۔۔ کاریں سفید کشمیری لڑکیوں کو پیک کر کے موٹی فر بہ عورتوں کو بھگا کر نکل جائیں۔

نیلے سوئمنگ ٹینک میں تیرنے والی امریکی اور جرمن لڑکیاں چیخیں مار کر اوپر والے

کمرؤں کو دوڑیں اور آفتاب کی لاش، کمکواب کی شیوانی اور تلے کی جوتی سمیت سوئمنگ ٹینک پر تیرتی رہے۔ ہوٹل کا عملہ پولیس کے آنے تک اندر چھپا رہے اور چودھویں رات کا چاند کے علاوہ اس لاش کو دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔۔۔۔۔ پھر مین وائی ڈبلو پینچوں اور سیسی کو بتاؤں کہ زیبا کے سابق عاشق نے آفتاب کو قتل کر دیا اور دولہن کے ساتھ فرار ہو گیا سیسی منڈ حال ہو کر میرے سینے سے آگے۔

پچھلے باب کا اختتام ہو۔۔۔۔۔ اور آہستی آہستی دھیرے دھیرے جب سیسی دوبارہ زندہ ہو تو اس کی ہر خوشی ہر غم مجھ سے وابستہ ہو جائے!

خواب جب اس قدر فاسد قسم کے ہوں تو ان کے دیکھنے والے عموماً خوش نہیں رہ سکتے۔

اس لیے عین وقت پر نکاح ہوا۔

تمام مہمان گو مغربی تہذیب میں سنے ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے شوق سے نکاح کے چھوہا رے کھائے۔۔۔۔۔ پھر منڈپ میں دولہا دولہن ایک ساتھ بیٹھے پریس فوٹو گرافر کے علاوہ امجد نے بھی تصویر کھینچیں۔ سلامیاں دی گئیں۔۔۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوتا رہا۔ پتہ نہیں کیوں آفتاب کی شادی مجھے ٹیلی ویژن کا فلور شو لگ رہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ ابھی یہ سارا سیٹ ایکٹرا یکٹرسوں سمیت اپنے اپنے گھر چلا جائے گا پھر نہ کوئی شادی ہوئی ہوگی نہ کوئی دعوت۔

لیکن منڈپ میں دولہن پتھی تھی۔۔۔ نتھ کے نیچے ہونٹ پوتلیے وہ مسکراہٹیں دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے پاس آفتاب دونوں ہتھنوں سے ہنس رہا تھا اس کی کسی حرکت سے تاسف، غم یا ملیا میٹ ہونے والی کسی کیفیت کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ میں سیمی کو اس غنڈے آفتاب کی شکل کیسے دکھاتا؟ کاش اس وقتمیرے پاس بھی کوئی پولو رائیڈ کیمرہ ہوتا تو میں بھی آدھ گھنٹہ میں اس کی تصویریں بنا لیتا پھر شاید سیمی یقین کرتی کہ۔۔۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا!

میں چونکہ آفتاب کا روم میٹ۔ اس لیے اس سے بہت بعد میں ملا۔ میرے چائے کے برتن اٹھانے میں مصروف تھے کچھ اہم مہمان جانا چاہتے تھے آفتاب کی بھر بھر کم ماں انہیں مسکراہٹوں کے ساتھ رخصت کر رہی تھی۔ اب بھی جوانلو کیاں، بجلیاں گرانے کے لیے بالیاں، بالیاں اور چوڑیاں درست کیے کا رہی تھیں مرد بظاہر سیاست پر گفتگو کرت ہوئے ان ہی زہرہ جبینوں کو تحسین بھری نظروں سے خراج ادا کر رہے تھے۔

میں نے زیبا کے ہونٹوں کا تل دیکھ لیا تھا اور باقی شادی میں میرے لیے اب کوئی نظر فریب بات نہ تھی پھر امتحان کا خیال بھی تھا۔ میں کھسک جانے کا راستہ بھانپنے میں مشغول تھا۔ جب آفتاب میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

واقعی آفتاب میں وہ سب کچھ تھا جس کی آرزو لڑکیاں کرتی ہیں۔

”کڑکی کوئی نہیں آئی۔۔۔“ آفتاب نے کہا۔

پتہ نہیں وہ کس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا؟

”لڑکیاں یا رپڑھا کو ہوتی ہیں، وہ کیوں اپنا نام ویسٹ کریں گی۔“

”باقی سب کا کیا حال ہے؟“

باقی سب خدا نے اس کا کیا مطلب تھا؟

”خوب پڑھائیاں ہو رہی ہیں۔۔۔“ اس نے سوال کیا۔

”کہاں یار۔۔۔؟ پتہ نہیں سبکٹ واہیات ہے کہ ہم لوگ یہودہ ہیں۔“
 کچھ دیر خاموشی رہی۔۔۔۔۔ پتہ نہیں میں کیوں محسوس کیا کہ آج وہ مجھ سے فروعی
 باتیں نہیں کرنا چاہتا۔

”یسی آئی ہے۔۔۔۔۔“ پتہ نہیں میں نے کیوں کہا۔

”کہاں۔۔۔۔۔؟ یکدم اس نے سارے میں نظر دوڑائی۔“

”یہاں نہیں آئی۔۔۔۔۔ ویسے آئی ہوئی ہے۔“

آفتاب جیسے مایوس ہو گیا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ کب؟۔۔۔۔۔“

”کل شام۔“

”کچھ دن رہے گی۔“

”صرف ویک اینڈ۔۔۔۔۔“

آفتاب کا رنگ پھیکا پڑ گیا اس کا سارا دو لہا پن، خوبصورتی، مسکراہٹ رخصت
 ہو گئی۔۔۔۔۔ یسی کا ذکر نے یکدم ہمیں اس قدر قریب کر دیا جیسے ہم ہمیشہ کے
 دوست تھے، روم میٹ نہیں تھے۔ آفتاب کے چہرے سے لگتا تھا جیسے ہم ہمیشہ کے
 دوست تھے روم میٹ نہیں تھے۔ آفتاب کے چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ ٹیپ ریکارڈ
 کی طرح بولنا چاہتا ہے لگاتار۔۔۔۔۔ انتھک گول گول چکروں میں۔۔۔۔۔ کبھی ٹون
 گرا کر کبھی Volume بڑھا کر۔۔۔۔۔ ایسے خاموش لڑکے سے اتنی باتوں کی مجھے
 امید نہ تھی۔

”عجیب بونگی لڑکی ہے وہ حالات سے، اپنے آپ سے، کسی دوسرے سے سمجھوتہ
 کرنے والی نہیں۔“

سپرنگ بورڈ پر ایک امریکی لڑکی چڑھی اس نے ہوا میں سمر سالٹ لگایا اور سرخ
 لباس غسل سمیت پانی تلے غائب ہو گئی۔۔۔۔۔ اس لڑکی اور یسی میں بلا کی مشابہت تھی

میں نے سانس روک لی اور آرزو کی کہ جلدی سے وہ پانی کی سطح پر واپس نکل آئے۔
آفتاب نے منڈپ کی طرف دیکھا۔ دولہن میں اب عمومی دلچسپی کم ہو چکی تھی
اور اسے اسی کے گھروالی عورتیں سہیلیاں اور چھوٹی بچیوں نے گھرے میں لیے بیٹھی
تھیں۔ شاید آفتاب کو زیبا سے بھی محبت تھی۔

”یہی کبھی سمجھ نہیں سکتی۔۔۔ وہ بہت زیادہ زندہ ہے۔۔۔۔۔ محبت کرتی ہے جی
جان سے۔۔۔ زندگی حساب کا سوال نہیں ہے لیکن وہ اسے کسی فارمولے سے حل
کرنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔“ نمبر ایک نمبر دو۔۔۔۔۔ تین والا بے مکان بول رہا تھا۔۔۔

”سب کا اپنا اپنا طریقہ ہے آفتاب۔۔۔۔۔ ہم کسی پر اپنا طریقہ ٹھونس نہیں سکتے۔“
اس نے گلے سے تمام ہار اتارے کر سامنے میز پر رکھ دیے اور پھر ٹنڈ منڈ ہو کر
کرسی سے پشت لگا دی۔ آفتاب کم گو تھا۔۔۔۔۔ وہ صرف امجد کے ساتھ یہی کے
ٹاپک پر باتیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس وقت پتہ نہیں کیوں وہ کیوں وہ اس قدر بھر کم
باتیں کرنے لگ

”زندگی سے موت تک کئی راستے ہیں جس راستے پر بھی پڑ جاؤ قیوم اس کی کچھ
راحتیں ہوتی ہیں۔ اس میں کچھ تکلیفیں پیش آتی ہیں کچھ اس راہ پر چلنے کے کے تغے
ہوتے ہیں کچھ قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں دراصل کوئی راہ اختیار کر لو۔۔۔۔۔ کسی راستے
پر پڑ جاؤ وقفہ اتنا لمبا ہے کہ مسافروں کا سانس اکھڑے ہی اکھڑے۔۔۔۔۔“

کیا آفتاب ہمیشہ سے ایسا تھا؟

یا کسی واقعہ نے اس کی طبیعت کو بدل دیا تھا۔۔۔۔۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا۔ جب
پہلی بار ہم سب نے اپنا اپنا تعارف پروفیسر سہیل کی کلاسمیں کرایا تھا۔ اس روز
آفتاب کس قدر مودس، کنوار اور خوبصورت نظر آتا تھا۔

وہ بولے گیا۔۔۔۔۔ ”دیکھو ناں قیوم جب مسافر کا دم اکھڑتا ہے تو پہلی سوچ

اس کی یہ ہوتی ہے کہ۔۔۔ کہ مسافت میں تھکا دینے والا بنیادی نقص اس کی پسند کا تھا اگر اس نے کسی دوسری راہ کر پسند کیا ہوتا تو شاید راستہ آسانی سے کھتا۔۔۔۔۔“

”کبھی کبھی درست انتخاب راستے کی طوالت کو کم کر دیتا ہے“ میں نے کہا۔

”غلط میرے بھائی غلط۔۔۔۔۔ جھوٹ بکواس! کسی راہ پر چلے جاؤ۔۔۔۔۔ کم وقت نہیں لگے گا۔۔۔۔۔ اسی لیے تو کوئی پسند کی راہ درست نہیں ہوتی بالآخر۔۔۔۔۔“

یہ باتیں ایک دولہا کے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔ دولہا تو شرماتا پان چباتا اور مسکراتا ہی پارا لگتا ہے۔

”فرض کرو ایک راستہ ہے پتھر یلا، آسمان پر سورج خط استوا جیسا۔۔۔۔۔ اس راستے پر چلنے والا ضرور سوچے گا کہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں جو تاجکستانوں کی چھاؤں میں انگوروں کے کوشے کھاتے چل رہے ہیں اگر تاجکستان والی راہ پر نکلے تو وہاں کے چلنے والے بتائیں گے کہ ہر خوشے میں کالی وردیوں والے کالی بلی بریے ہیں شہد کی مکھیاں ہیں۔ اس کے جسم پر ہر جگہ بھڑوں کا کالے کیسو جن ہے۔۔۔۔۔ پھر یہ تاجکستانوں میں چلنے والا سوچتا ہے کہ وہ شخص جو لکڑی کا پھٹے ڈالے بن پتوار اترائی کے رخ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ جا رہا ہے خوش نصیب ہے اس کی راہ آسان ہے، بن پتوارے سے پوچھو تو وہ کہتا ہے۔۔۔۔۔ خبردار یہاں کی مچھلیاں آدم خور ہیں۔۔۔۔۔ سنسا منہ کھولے پڑے ہیں، اور ڈھلوان پر جانے والے پانی میں از خود بھنور پڑتے ہیں“

”اگر ہر راہ پر خطر ہے۔۔۔۔۔ تو پھر پسند کیسی۔۔۔۔۔ یہ پسند کا شوشہ چھوڑ کر تو فطرت نے انسان کو احمق بنایا ہے۔“

”اور یہی جیسے احمق اپنی Choice پر ڈٹے رہیں گے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ راہے انتخاب سے وہ زندگی کی راہتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں حالانکہ وہ صرف اول بدل سکتے ہیں راہتوں کو۔۔۔۔۔ اضافہ نہیں کر سکتے نہ غم میں نہ خوشی میں۔“

”یہ تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو آفتاب“

”میں نے کبھی اپنی پسند سے زندگی نہیں گزاری اور بڑی اسودگی میں وقت گزارا

ہے مجھے دولت، محبت، آسودگی ظلمانیت سن اتفاقات ملی۔۔۔۔۔ یہی۔۔۔۔۔ یہی

بات اسے سمجھ نہیں آئی میں اگر پسند کو زندگی میں شامل کر لوں تو بڑی مشکلات پیدا کر

لیتا اپنے لیے۔۔۔ دوسروں کے لیے۔“

یہ شخص یا تو انتہا کا خود غرض تھا یا بلا کا بے غرض۔۔۔۔۔ میں اندازہ لگا سکا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ لوگ اہم فیصلے کیسے کرتے ہیں۔ ساری زندگی کے تمام

فیصلے پسندنا پسند کے راستے یہ کیسے ہوتے ہیں اگر نتیجہ نہیں نکلتا تو فیصلے ہوتے کیوں

ہیں آخر۔ نیچر ہمارا وقت ضائع کرنا چاہتی ہے ہمیں بے وقوف بنانا اس کی منشا ہے؟“

میں نے پوچھا

آفتاب اب مجھے مکمل طور پر پروفیسر کی کاپی لگ رہا تھا۔ اس نوجوان سے میری

کوئی واقفیت نہ تھی۔

”دیکھو فیصلے ہم میں شروع ڈال دیے جاتے ہیں چوری چوری ہماری مرضی

پوچھے بنا۔ ہر انسان کے اندر ایک خمیر ہوتا ہے سرسوں کے بیج میں یہ فیصلہ ہوتا ہے

اس کا زرد رنگ ہو گا تر بوز کا ٹوٹو اس کا ہر بیج یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس سے جنم لینے والا

تر بوز سرخ ہو گا۔۔۔۔۔ دیکھو قیوم نہ تر بوز اپنی خوشی سے سرخ ہوتا ہے نہ چنبیلی اپنی

مرضی سے خوشبو دار۔۔۔۔۔ سب کا بیج کا خمیر ہے جو آدمی چور بناتا ہے اس کے وجود کو

غارت گری کا خمیر لگا ہوتا ہے کہیں۔۔۔۔۔ نیک سازگار ماحول میں شاید ساری عمر

اس کی یہ خوبی نہ کھلے لیکن جس کے اندر غارت گری کا خمیر نہیں ہو گا۔۔۔۔۔ وہ ناساز

گار ماحول میں بھی کچھ نہیں کر پائے گا۔۔۔۔۔ کبھی چور نہیں بن کسے گا۔۔۔۔۔ یار

میرے سیدھی بات ہے سب کو تم بھی گرتا دیکھتے ہو نیوٹن نے بھی دیکھا تھا تم کشش

ثقل ایجاد نہیں کر سکے۔ کیونکہ تمہارے بیج میں وہ راستہ نہیں تھا جو ایک سائنسدان کا

ہوتا ہے“ میں۔۔۔۔۔ پروفیسر سہیل کی کمپنی میں اگر نہ رہتا تو شاید یہ باتیں مجھے سمجھ نہ آتیں اور۔۔۔۔۔ شاید میں اپنی پسند کی زندگی بسر کرنا چاہتا۔۔۔۔۔ لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں۔

کیا واقعی وہ سمجھ گیا تھا؟

کیا یہی سب کچھ کر وہ ایسی باتیں کرنے پر مجبور تھا۔

کیا پروفیسر سہیل کی باتوں کا اثر تھا۔

کیا وہ ہمیشہ سے خاموشی کے غلاف تلے ایسی ہی باتیں سوچتا تھا۔

”اب میں احتجاج کرنے کے خلاف ہوں تھلکہ مچانے والے صرف اپنا نقصان ہی نہیں کرتے سب کو برباد کرتے ہیں سارے ماحول کو۔۔۔۔۔ یہی سمجھتی ہے کہ وہ اپنے رویے سے اپنی سوچ سے اپنی پسند سے خوشی اور غم لانے کی ضمانت ہے۔۔۔۔۔ وہ تو ایسی ضدی ہے کہ اپنی آرزو کے سامنے اللہ کی ساری کائنات توڑ پھوڑ سکتی ہے۔“

”میں بھی ایسے ہی سمجھتا ہوں۔

”بیکار ہے فضول ہے۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں وہ خود ڈوٹ جائے گی اچانک۔“

”تمہیں یہی سب سے محبت ہے؟“

وہ بڑی دیر خاموش رہا۔

”آفتاب۔۔۔۔۔ میں نے ایک سوال کیا ہے تم سے۔“

”محبت ہونے نہ ہونے سے میرا راستہ نہیں بدل سکتا۔“

”کیوں؟“

”یہی سمجھتی ہے میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچا نہیں۔۔۔۔۔ بہت سوچا ہے

میں نے قیوم بہت زیادہ۔۔۔۔۔ یہی کے ساتھ بھی زندگی میں کچھ راحتیں ہوتیں کچھ غم ہوتے۔۔۔۔۔ زیبا کے ساتھ رہنے میں کچھ راحتیں ہوں گی غم ملیں گے۔۔۔۔۔

زندگی کسی کے ساتھ گزار لو قیوم آخر میزان برابر رہتا ہے۔“

”ایسی منفی سوچ کی وجہ سے تم نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔“

”اگر میں اس کی زندگی تباہ نہ کرتا۔۔۔۔۔ تو کچھ اور لوگوں کی زندگی تباہ کر دیتا یہ

فیصلہ بھی نہیں پہلے سے میرے اندر ہو چکا ہے۔“

”تمہیں یہ فیصلہ عیسیٰ سے محبت کرنے سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔“

”میں نے کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔۔۔۔۔ کیونکہ ہر فیصلہ میرے بیچ میں پہلے سے

موجود تھا اور اس بیچ کے فیصلے سے مڑا نہیں جاسکتا۔ باقی تمام فیصلے اس پہلے فیصلے میں

موجود ہوتے ہیں قیوم۔“

”مجھے خدا کے لیے بتاؤ تمہیں عیسیٰ سے محبت ہے کہ نہیں۔“

اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔۔۔۔۔ چند ثانیے اپنی نوبیا ہتا کو دیکھا اور بولا۔

”محبت چھلا وہ ہے قیوم۔۔۔۔۔ اس کی اصل حقیقت بڑی مشکل سے سمجھ آتی

ہے۔ کچھ لوگ جو آپ سے اظہار محبت کرتے ہیں اتصال جسم کے خواہاں ہوتے

ہیں۔ کچھ آپ کی روح کے لیے تڑپتے ہیں کسی کسی کے جذبات پر آپ خود حاوی ہو

جانا چاہتے ہیں۔ کچھ کو سمجھ سوچ ادراک کی سمتوں پر چھا جانے کا شوق ہوتا ہے۔۔۔۔۔

محبت چھلا وہ ہے لاکھ روپے بدلتی ہے۔۔۔۔۔ اسی لیے لاکھ چاہو ایک آدمی آپ کی

تمام ضروریات پوری کر دے یہ ممکن نہیں۔۔۔۔۔ اور بالفرض کوئی آپ کی ہر سمت ہر

جہت کے خلاء کو پورا بھی کر دے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ بھی اس کی ہر

ضرورت کو ہر جگہ ہر موسم میں ہر عہد میں پورا کر سکیں گے۔۔۔۔۔ انسان جامد نہیں ہے

بڑھنے والا ہے اور پر دائیں بائیں۔۔۔۔۔ اس کی ضروریات کو تم پابند نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔

لیکن عیسیٰ بڑی ضدی ہے۔۔۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔۔۔ وہ محبت کو کسی جامد لمحے میں بند

کرنا چاہتی ہے۔“

شاید آفتاب اور میں ابھی اور کچھ دیر باتیں کرتے رہتے لیکن اس وقت امجد اور

جمال آگئے وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔

امجد نے آتے ہی آفتاب کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”کیا رازوینا ہو رہے ہیں“

لیکن آفتاب ابھی جواب دینے نہ پایا تھا کہ جمال بولا ”یار ادھر چلو شالیمار میں اتنی پیاری پوپٹیں بیٹھی ہیں۔۔۔۔۔ خدا قسم ذرا ہائے اوٹی کرنے والی نہیں بڑے آرام سے تادیلی خیالات کرتی ہیں۔“

”ہاں سچ یا ر بڑی ڈیسینٹ لڑکیاں ہیں۔ ایسے آرام سے باتیں کرنے لگیں ہم سے چلو۔“ امجد بولا۔

”چونکہ تم سے باتیں کرنے لگیں اس لیے ڈیسینٹ ہوئیں۔۔۔۔۔“ آفتاب نے مسکرا کر پوچھا۔

امجد نے آنکھ مار کر کہا۔۔۔۔۔ ”سچی یا رہمیں تو وہی ڈیسینٹ جو خوانخواہ ہمیں، یہ احساس نہ دلائیں کہ ہم کوئی خاص قسم کے غنڈے ہیں جو ان کی عصمت دری کیے بغیر دم نہ لیں گے۔۔۔۔۔ اندر سے چاہے ویسے ہی ہوں لیکن احساس نہ دلائے تب لڑکی ڈیسینٹ ہوتی ہے اٹھو قیوم۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔۔“

آفتاب نے مسکرا کر کہا۔۔۔۔۔ ”جاؤ بھائی۔۔۔۔۔ ہم تو تنہی ہو گئے۔“

”اس کے ساتھ۔۔۔۔۔“ جمال نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”نہیں اس کے ساتھ

ابرو کے اشارے سے آفتاب نے زیبا کی طرف اشارہ کیا۔۔۔۔۔ جمال اور امجد نے بڑے نرت کاروں کی طرح کمریں لچکاتے کرسیوں میں بیٹھی ہوئی جنس مخالف کو ایس کیوزمی کرتے ہوئے اندر کی طرف چلے گئے۔

اس وقت پانی کی تہہ سے سرخ لباس غسل والی امریکن لڑکی نے سر نکالا اور ڈولفن کی طرح سر اٹھا کر جھٹکا۔۔۔۔۔ لڑکی نیلی آنکھوں پر پانی کی تہہ میں تیرنے کی وجہ

سے ہلکی سی سرخی چھا گئی تھی۔۔۔ آفتاب نے سامنے پڑے ہوئے گل دان میں سے ایک گیندے کا پھول توڑا اور اس کی طرف پھینکا۔ لڑکی ایک انجانے راستے پر یوں تعریف ملتے دیکھ کر معصومیت اور خوشی سے مسکرائی پھر اس نے پھول کو فاختہ کی طرح منہ میں اٹھایا اور پانی کی تہہ میں چلی گئی۔

آفتاب میں وہ سب کچھ تھا جس سے لڑکیاں محبت کیا کرتی ہیں۔
ہوٹل سے نکل کر مجھے سارا راستہ کالج کی تعارفی کلاس یاد آتی رہی پتہ نہیں کیوں ساری

شام آفتاب کی باتوں سے پروفیسر سہیل کی خوشبو آتی رہی جیسے میں آفتاب سے نہیں پروفیسر سہیل سے مل کر آ رہا تھا۔

جمال اور امجد سے بہت پہلے میں شادی سے لوٹ آیا۔

رات کے پہلے پہر ہوٹل بالکل اجاڑ تھا کمروں میں سے پنکھوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور سڑک پر چلنے والے ٹریفک کی دبی دبی سی آواز ایک مسلسل سرگوشی تھی میں ہوٹل کی

زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے پھر دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ ان قلیل چھٹیوں میں مجھے کیسے پڑھائی کرنی چاہیے کیا میں بھائی کے پاس شاندار چلا جاؤں کیا قصور میں دلجمعی سے پڑھائی ہو سکتی ہے یا پھر مجھے نیا ٹائم ٹیبل بنا کر یہیں ہوٹل میں رہنا چاہیے؟

ہوٹل کی ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والے لڑکوں کی عادتیں اور پڑھائی کے اوقات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں کچھ نوجوان ساری رات سادھی لگا کر پڑھتے ہیں اور صبح نیند کی گولیاں کھا کر مگر مچھ کی طرح بے سدھ لیٹ جاتے ہیں کچھ خائف رہتے ہیں اپنے حافظے کے ہاتھوں۔ ان کو زیادہ پڑھنے

کے بعد نروس ہو کر دوسروں کے پاس اکلالتی جرات - اعادہ سبق اور خوف کا علاج کرنے جانا پڑتا ہے ان کے علاوہ ایک جماعت خود غرضوں کی بھی ہوتی ہے وہ کوٹا بھر پڑھائی کر کے دوسروں کے پاس خوش گپی کے لیے اس وقت جاتے ہیں جب ابھی دوسرا بے چارہ پڑھائی کا شارٹ ہی لے رہا ہوتا ہے میں دن میں کئی مرتبہ پڑھائی کی کھلی دبانے کی غرض سے جھوٹے شارٹ لیتا اور ہر بار کوئی نہ کوئی ہوٹل کا باسی بریک لگانے پر مجبور کر دیتا۔ جمال کی عادت تھی کہ شہزادہ سات گھنٹے پڑھنے کے بعد حالیہ حالات پاکستان اور پاکستان کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لانے کے پروگرام بڑی تفصیل سے زیر بحث لا کر دو ڈھائی گھنٹے میرے پاس صرف کرتا۔

”بیٹھ جاؤ جمال۔۔۔۔۔“ میں کرسی پیش کرتا۔

”میں بس جا رہا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ کھڑا رہتا اور بولتا چلا جاتا۔

”ناں بھائی۔۔۔۔۔ تمہارا بھی ٹائم ویسٹ ہوگا۔۔۔۔۔ میرا بھی۔۔۔۔۔ بیٹھنا

وٹھنا نہیں ہے۔“

میں اس کے سامنے کئی بار گھڑی دیکھتا۔ کئی پنسلیں گھڑ کر رکھ لی جاتیں۔ پن دھوئے جاتے۔ ان کی سیاہی بدلی جاتی کاغذوں کے نوٹ بنانے کے لیے پن لگاتا۔۔۔۔۔ جن

کتابوں سے مختلف Topics پر Refrence ملنے کی امید ہوتی۔ ان کتابوں میں جا بجا کاغذ کی پرچیاں رکھ کر ان کو اینٹوں کے چھٹے کی طرح جما کر رکھتا۔۔۔۔۔ میرے مشاغل نے کبھی جمال کو پریشان نہیں کیا۔ وہ سٹیل مل لگانے سے لے کر دہی بلونے والی چھوٹی رٹی تک ان گنت فیکٹریاں پاکستان کے مختلف شہروں میں لگاتا رہتا۔ اس کی گفتگو سے سارا پاکستان کا لاشاہ کا کوبن جاتا اور فضا میں سے بدبودار شیرے، امیران اٹیئٹری کے خام چمڑے کی بو آنے لگتی۔۔۔۔۔

جمال کے جانے کے بعد فضا میں فیکٹریوں کا دھواں اس قدر پھیلا ہوتا کہ میں

سانس برابر کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاتا۔ واپسی پر پڑھائی کے شارٹ میں کئی اوگھٹ گھائیاں آتیں ان کو پار کرنے کے بعد ابھی میں نے سپیڈ ہی پکڑی ہوتی کہ امجد آ جاتا۔۔۔۔۔ امجد ہنگامی آدمی تھا وہ صرف پندرہ منٹ ٹھہرتا۔۔۔۔۔ لیکن اس کے ضمیمے کے بعد توجہ کتاب کی سکرین پر ٹھہر ہی نہ سکتی تھی۔

جس وقت میں آفتاب کی شادی سے لوٹا۔ میرا ارادہ شہر سے بھاگ جانے کا تھا جو کچھ آفتیں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ ان کی سردار مصیبت سیسی تھی۔ آفتاب کی شادی نے پتہ نہیں کیوں دل میں سیسی کی محبت پالینے کے خواب کو از سر نو ہوا دے رکھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ کوئی ایسا خوف بھی تھا جو میٹر نوم پر بتا رہا تھا کہ اب بیٹا تم پاس ہی نہ ہو سکو گے اس لیے اس میں عافیت ہے کہ شہر، ہوٹل۔ کالج چھوڑ کر کسی چھوٹے سے گاؤں میں بھاگ جاؤ، وہاں مقامی نمبردار سے دوستی لگا کر ایک چھوٹا سا سکول کھولو اور باقی ماندہ زندگی ان بچوں کو پڑھاؤ جو پڑھنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے۔

بالآخر میں نے پھر ایک جھوٹا شارٹ لیا۔ اپنی چار پائی سے بستر رول کر کے سرہانے کی جانب رکھا اور سوشیا لوجی کے دوسرے پرچے کی تیاری کرنے لگا۔ اس وقت دروازے پر کسی نے انگوٹھی کے ساتھ دستک دی۔

دروازہ کھولا تو سیسی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مجھے بانس پر ٹنگا ہوا نظر آیا۔
 ”آ جاؤں۔۔۔۔۔ کہ نہیں۔“

”اس وقت تمہیں اجازت کیسے ملی اندر آنے کی؟“
 ”بس مل گئی آ جاؤں؟“

وہ چار پائی پر جوتے اتار کر بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کٹے ہوئے بالوں والی کسی لڑکی کو ٹلیپر پہن کر لالائی چار پائی پر ننگے پاؤں بیٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے رول کیے ہوئے بستر پر اپنی کہنی جمائی اور نظریں جھکا کر پوچھا۔
 ”تو ہو گئی شادی؟“

شاید وہ مجھ سے نفی میں جواب کی آرزو مند تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہو گئی۔۔۔۔۔“

بڑی دیر تک وہ سر ہلاتی ہلاتی رہی۔

پھر جیسے اس نے اپنے آپ کو قابو پا لیا۔ وہ بڑے سادی گھریلو انداز میں باتیں کرنے لگی۔

”بہت مہمان تھے۔۔۔۔۔ ہے نا۔۔۔۔۔“

”نہیں زیادہ نہیں تھے۔۔۔۔۔ یہی کوئی تین سو کے قریب۔۔۔۔۔“

”جمال اور امجد بھی گئے ہوں گے۔۔۔۔۔“ جیسے وہ شادی پر ہمارے ساتھ ہی

تھی

”ہاں۔۔۔۔۔“

”اور۔۔۔۔۔؟ اور فرزانہ کوثر وغیرہ۔۔۔۔۔“

”وہ پڑھ رہی ہوں گی اس وقت۔۔۔۔۔ ان کمبجوں نے فیسٹ ڈویشن لینی

ہے ہماری طرح کوئی اپنا آگاہوڑا مارنا ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ سمجھ دار ہیں وہ چاروں۔۔۔۔۔ کاش خدا ہمیں بھی عقل دیتا! انجیلا

بھی نہیں آئی۔۔۔۔۔؟“

وہ چپ ہو گئی

اس وقت ایک بار امید نے مجھے بڑے بھرپور قسم کے سبز باغ دکھائے دراصل ہر

شخص کو اپنے ملک کی لوک کہانیاں پر اندر ہی اندر بڑا اعتبار ہوتا ہے وہ بہت سمجھدار

ہونے کے باوجود کبھی ان کہانیوں کے چنگل سے نکل نہیں سکتا۔ ملک کی مجموعی

سائیکی ان ہی کہانیوں میں ہوتی ہے۔ اور میں بھی ان ہی کہانیوں کا ایک حصہ تھا۔

اس وقت مجھے یقین تھا کہ چونکہ ولین کی شادی ہو گئی ہے اس لیے نیچرل نتیجہ یہی ہے

کہ اب سیسی پوری قوت سے مجھ پر عاشق ہو جائے گی۔ راستے کی چٹان کلتے ہی

اسے میرے سوائے اور کچھ نظر نہیں آنا چاہیے۔ لیکن سیمی کچھ شوقیہ گلابی گلاسز نہیں پہنتی تھی۔ واقعی اس کی بصیرت کمزور تھی اسے آفتاب کے بعد کوئی شخص نظر نہ آیا۔
”انتظام کیسا تھا؟۔۔۔۔۔“ اور میں نے یونہی پوچھا۔

دراصل وہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی اور میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔
میں اس سے وہ باتیں کیوں کرتا جو تالاب کنارے آفتاب نے مجھ سے کی تھیں
شاید میرے بیان کے رد و بدل سے وہ ان باتوں کو آفتاب کی محبت پر محور کرتی۔
بڑی دیر بعد میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔ ”اچھا تھا جیسے ہوٹلوں کے انتظام ہوتے ہیں۔“

”پھر بھی۔۔۔۔۔“
”نکاح سے پہلے ڈرنک تھیں۔۔۔۔۔ کوکا کولا وغیرہ“
یکدم اس کا رنگ پھرتی ہو گیا۔ دوپہر کی دھوپ میں چمکتی سفید ریت کی طرح
”نکاح سے پہلے۔۔۔۔۔ نکاح سے پہلے۔۔۔۔۔ نکاح سے پہلے۔۔۔۔۔“ وہ
الاپنے لگی اس وقت مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید سیمی اب بھی مجھ سے محبت نہ کر سکے۔
”اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“

”چائے تھی۔۔۔۔۔ نکاح کے بعد۔۔۔۔۔ وہی معمول کی چیزیں، چیز فنگرز،
مچھلی، پیسٹری اور ایک ٹرانفل قسم کی سویٹ تھی۔“
یکدم وہ بھڑک کر بولی۔۔۔۔۔ ”نکاح کے بعد کبھی ٹرانفل نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ ہمیشہ
نکاح سے پہلے ٹرانفل ہوتا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے جنہوں نے میرے اظہار محبت کو
شارٹ سرکٹ کر دیا۔

”کیسی ہے؟۔۔۔۔۔“ گلابی گلاسز کے پیچھے دھنسی ہوئی آنکھیں تھیں آنکھوں
میں آنسو تھے اور ان پردوں کے پیچھے کہیں سیمی کھڑی تھی۔

”کون۔۔۔۔؟“

”وہی بڑا نفل۔۔۔۔“

”خوبصورت ہے۔۔۔۔۔ جیسے کشمیری لڑکیاں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے لہجے کو خشک رنگ دے کر کہا۔

”قد۔۔۔۔؟“

”لمبا۔۔۔۔“

”آنکھیں۔۔۔۔؟“

”نبلی!۔۔۔۔۔ لیکن میک اپ زیادہ تھا میں نقلی پلکوں کی وجہ سے دیکھ نہیں سکا اچھی طرح۔“

”رنگ۔۔۔۔؟“

”گورا۔۔۔۔۔ گائے کے دہی جیسا۔“

اب آنسو اس کی گالوں پر بلا تکلف گرنے لگے۔

”اور وہ۔۔۔۔۔“

”وہ کون۔۔۔۔؟“

تھوڑی دیر کے لیے میں بھول گیا تھا کہ سیمی آفتاب سے محبت کرتی ہے۔

”دولہا؟۔۔۔۔ آفتاب؟“

”ٹھیک تھا۔۔۔۔۔ جیسے دولہا ہوتے ہیں کخواب کی شیروانی، ملتان کی کھسہ، سر پر

سرحدی پٹکا۔۔۔۔۔ سہرا۔۔۔۔۔ ہار۔۔۔۔۔“

”یہ نہیں۔۔۔۔۔ یہ نہیں۔۔۔۔۔ بتاؤ قیوم وہ خوش تھا، خوش نظر آ رہا تھا۔۔۔۔۔؟

اسے خوش ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔۔۔۔۔ مجھ سے پچھڑنے پر کم از کم اسے خوش تو

نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ ہے نا؟“

میں نے سیمی کو خوشنودی کے لیے کہا۔۔۔۔۔ ”نہیں بابا تم سے کس نے کہا وہ

خوش تھا۔۔۔۔۔ مجھے تو وہ کچھ اداس نظر آیا۔“

اس کے خیال کے ساتھ اتنی آسانی کے ساتھ مطابقت کرنے پر وہ خالص افسروں کی طرح بگڑ گئی۔

”جھوٹ مت بولو۔۔۔۔۔ خوجی کوئی اس کے چہرے پر تھوڑی ہوگی۔۔۔۔۔ وہ تو اس کے دل میں ہوگی اندیہاں۔۔۔۔۔“

”شاید۔۔۔۔۔“ میں نے شرمندگی کے ساتھ کہا۔

اب اس نے رول کیے ہوئے بستر پر سر ٹکا دیا اور دھاری دار گدی پر اس کے تمام بال بکھر گئے۔

”مانا اس کی بڑھی بے بے مجھ سے شادی پر رضامند نہ تھی۔ لیکن کیا کچھ سال اور وہ رک نہ سکتا تھا۔۔۔۔۔ کم از کم ہم دونوں ایم اے ہی اکٹھے کر لیتے۔۔۔۔۔ ساتھ ساتھ۔۔۔۔۔ لیکن اسے شوق تھا شادی کا۔۔۔۔۔ اسے اپنی بچپن کی منگیترا سے محبت ہے قیوم۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتے وہ بے حد دوغلا ہے۔۔۔۔۔ اس کی دوڑخصیتیں ہیں۔۔۔۔۔ مٹر کے چھلکوں کی طرح۔“

اس وقت میرا جی چاہا کہ اسے وہ ساری باتیں بتاؤں جو آفتاب نے سوئمنگ پول کرانے کی تھیں۔

”تم جو وہاں گئے تھے تو کیا کھانے پینے گئے تھے؟“ میں چپ رہا۔

”لڑکیاں تاڑنے؟“ اس نے پوچھا۔

”چھوڑو یا ر۔“

”پھر تم اتنا بھپتہ نہ کر سکتے کہ زیبائے متعلق اس کا Reaction کیا ہے۔“

میں نے اس جلالی افسر سے جان بچانے کی خاطر کہا۔۔۔۔۔ ”میں نے انہیں باتیں کرتے تو نہیں دیکھا لیکن غالباً آفتاب کے ماں باپ نے زبردستی یہ لڑکی اس

کے گلے باندھی ہے۔“

”چھوڑو قیوم چھوڑو۔۔۔ تم بھی مجھے فریب دینا چاہتے ہو آفتاب کی طرح۔ وہ
الو کا پٹھا بھی چاہتا ہے کہ خود تو بڑے مزے کی خوشگوار شادی شدہ زندگی گزارے اور
میں یہ لیتے رکھوں کہ وہ دل ہی دل میں مجھ پر مرتا ہے اس لیے ساری عمر میں شادی
نہ کروں؟“

امید نے پھر سر اٹھایا۔

”نہیں تمہیں شادی ضرور کرنی چاہیے بلکہ جلد از جلد۔۔۔“

”مائی فٹ۔۔۔۔ شادی! میں لعنت بھیجتی ہوں شادی پر۔۔۔۔ میں تو امتحان

نہیں

دے سکی اس کے بغیر۔۔۔ میں شادی کیا کروں گی؟“

میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ سیمی کے جسم کو چھونا میرے لیے
حجر اسود کو چومنے سے کم نہ تھا میرا رواں رواں رقت اور عقیدت سے بھر گیا۔ دیر تک
میرا ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا رہا اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ شاید وہ اس بات ہی
سے آگاہ نہ تھی کہ میرا ہاتھ اس کے کندھے پر لرز رہا ہے۔

”اس کے گھر میں چاہے کوئی رہے دل میں تم رہو گی سیمی۔“

سیمی نے لمبی آہ بھری اس کی ہنسی کی ہڈی اور ابھر آئی۔

”جانے دو قیوم جانے دو۔۔۔۔ دل کی پوسٹ تو میں نے پنڈی جانے سے

پہلے خالی کر دی۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا کہ پوسٹ خالی ہو چکی ہے اور یہ موقع افسر کی میز پر اپنی

عرضی رکھنے کا ہے۔ میں نے ہاتھ اس کے زانوں پر رکھا۔ وہ پہلے کی طرح بے

دھیانی بیٹھی رہی۔“

”سنو سیمی!۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں بتا رہا

ہوں۔۔۔ آفتاب اس وقت اسی فیصد خوش ہے۔۔۔ بیس فیصد خوشی اسے رفتہ رفتہ مل جائے گی۔۔۔ کیونکہ وہ زیادہ شدید نہیں ہے۔۔۔ مسئلہ تمہارا ہے تمہیں خوش رہنے کے لیے کوئی بندوبست کرنا چاہیے“
وہ کسی قسم کے بندوبست کے لیے تیار نہ تھی۔

”وہ اس قدر بے رحم نہیں ہو سکتا۔۔۔ وہ ایسا بے وفائیں ہے قیوم۔۔۔ ہم دونوں تو ایک دوسرے کے علاوہ کسی کے ساتھ خوش رہ ہی نہیں سکتے تھے۔۔۔“
پھر یہ کیسے ہوا کہ وہ تو زیبا کو پا کر خوش ہو گیا اور میں۔۔۔ اور میرے لیے خوشی ایک مسئلہ بن گئی۔۔۔ کیسے؟
”تمہیں بھی اپنے لیے خوشی کی کوئی راہ تلاش کرنی ہوگی سہی۔۔۔ پیچھے رہ جانے

والوں کے لیے اور کوئی صورت نہیں ہوتی!“
وہ محبت کے ترازو میں برابر کا تلنا چاہتی تھی اور دوسری طرف کے پلڑے میں مجھے ایسے کوئی بٹہ رکھنا نہیں آتا تھا جس کی وجہ سے اس کا توازن ٹھیک ہو جاتا۔ اگر میں آفتاب کو خوش ظاہر کرتا تو وہ تنصیر کی صورت میں بے قابو ہو جاتی اگر میں اسے اداس ظاہر کرتا تو بے یقینی ناامیدی اور شدید غم تلے دب کر آہیں بھرنے لگتی، محبت کا آراؤ پر تلے برابر اس کے تختے کا تپا چلا جا رہا تھا۔

میں سوشیالوجی کے طالب علم کی طوح سوچنے لگا کہ جب انسان نے سوسائٹی کو تشکیل دیا ہو گا تو یہ ضرورت محسوس کی ہوگی کہ فرد علیحدہ علیحدہ مطمئن زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ باہمی ہمدردی میل جول اور ضروریات نے معاشرہ کو جنم دیا ہو گا۔ لیکن رفتہ رفتہ سوسائٹی اتنی پیچ در پیچ ہو گئی کہ باہمی میل جول، ہمدردی اور ضرورت نے تہذیب کے جذباتی انتشار کا بنیادی پتھر رکھا۔ جس محبت کے تصور کے بغیر معاشرے کی تشکیل ممکن نہ تھی۔ شاید اسی محبت کو مبالغہ پسند انسان نے خدا ہی سمجھ لیا اور انسان

دوستی کو انسانیت کی معراج ٹھہرایا۔ پھر یہی محبت جگہ جگہ نفرت حقارت اور غصے سے زیادہ لوگوں کی زندگیاں سلب کرنے لگی۔ محبت کی خاطر قتل ہونے لگے۔۔۔۔۔ خود کشی وجود میں آئی۔۔۔۔۔ سوسائٹی اغوا سے شجون سے متعارف ہوئی۔ رفتہ رفتہ محبت ہی سوسائٹی کا ایک بڑا روگ بن گئی اس جن کو ناپ کی باتل میں بند رکھنا معاشرے کے لیے ممکن نہ رہا اب محبت کے وجود یا عدم وجود پر ادب پیدا ہونے لگا۔۔۔۔۔ بچوں کی سائیکوجی جنم لینے لگی۔ محبت کے حصول پر مقدمے ہونے لگے۔۔۔۔۔ ساس بن کر ماں ڈائین کا روپ دھارنے لگی۔ معاشرے میں محبت کے خمیر کی وجہ سے کئی قسم کا ناگوار Bactria پیدا ہوا۔

نفرت کا سیدھا سادا شیطانی روپ ہے۔ محبت سفید لباس میں ملبوس عمر عیار ہے۔ ہمیشہ دوا راہوں پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اس کی راہ پر ہر جگہ راستہ دکھانے کو صلیب کا نشان گرڑا ہوتا ہے۔ مجتبیٰ جھمیلوں میں کبھی فیصلہ کن سزا نہیں ہوتی ہمیشہ عمر قید ہوتی ہے۔ جس معاشرے نے محبت کو علم بنا کر آگے قدم رکھا وہ اندر ہی اندر اس کے انتظار سے بری طرح متاثر بھی ہوتی چلی گئی۔ جائز و ناجائز محبت کے کچھ ٹریفک رولز بنائے لیکن ہائی سپیڈ معاشرے میں ایسے سپیڈ بریکر کسی کام کے نہیں ہوتے کیونکہ محبت کا خمیر ہی ایسا ہے۔۔۔۔۔ زیادہ خمیر لگ جائے تو بھی سوسائٹی پھول جاتی ہے۔ کم رہ جائے تو بھی پیپڑی کی طرح ترخ جاتی ہے۔

شکست و ریخت۔

بدبختی و موختہ سامانی۔

آج تک سوسائٹی جرائم کی بیخ کنی پر اپنی تمام قوت استعمال کرتی رہی ہے۔ اس نے اندازہ نہیں لگایا کہ کتنے گھروں میں کتنے مسلمانوں میں سارا نقص۔ ہی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ سوسائٹی کا بنیادی تضاد ہی ہے کہ ابھی تک وہ محبت کا علم اٹھائے ہوئے ہے۔ حالانکہ وہ اس کے ہاتھوں تو فتنہ بھر تکلیف اٹھا چکی ہے۔ جب تک یہ

جن دوبارہ بوتل میں بند نہیں ہو جاتا اور اس کے ٹریفک رولز مقرر نہیں ہوتے، تب تک شانتی ممکن نہیں۔ کیونکہ محبت کا مزاج ہوا کی طرح ہے کہیں نکلتا نہیں اور معاشرے کو کسی ٹھوس چیز کی ضرورت ہے۔

محبت میں بیک وقت توڑنے اور جوڑنے کی صلاحیت ہے۔ سوسائٹی کا رنگ اسی کی بدولت نکھرتا ہے اور اسی جذبے کی وجہ سے شدید کالک بھی منہ پر لگتی ہے میں اور یہی اگر اب بھی ہم جماعت ہوتے تو محبت کے اس پہلو پر کئی گھنٹے بحث کرتے رہتے پھر وہاں خلدون، ڈرخائم، کومٹ اور مارکس کے نکتہ نظر پیش کر کے بحث کو بڑا Objective اور خوب صورت بنا دیتی ہم کسی نئی تھیوڑی کے سر پر پہنچ کر اپنے آپ کو بہت ذہین تصور کرنے پر مجبور ہو جاتے..... ایسی بحثیں جو عام طور پر ہم کیفے ٹریا میں کیا کرتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے

سے کس قدر دور لے جایا کرتی تھیں اور ان ہی کی وجہ سے ہم نے کتنے فاصلے طے کیے تھے۔ لیکن اس وقت وہ میری ہم جماعت نہ تھی۔ وہ مائی تو بہ کی پتلی تھی۔

میرے گاؤں چندرا میں ایک پرانا بھٹہ تھا۔ اینٹیں بنانے والے یہاں سے کبھی کے جا چکے تھے۔ لیکن جابجا ٹوٹی اینٹوں کے چٹھے، لال گبروے رنگ کی پکی مٹی اور گہری کھائیاں تھیں جن سے مٹی کھود کھود کر اینٹیں بنائی جاتی ہوں گی۔ برسات میں ان کھائیوں میں برساتی پرانی بہہ کرا کٹھا ہو جایا کرتا۔ پرانے بھٹے کے پاس مائی تو بہ تو بہ کی جھگی تھی۔ پتہ نہیں اس کا اصلی نام کیا تھا۔ لیکن اب سارے گاؤں میں اسے سب مائی تو بہ تو بہ کہتے تھے۔ سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ وہ کال علم جانتی ہے۔ لیکن دو ایک بار میری موجودگی میں کس نے اس سے استفسار کیا تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر تو بہ تو بہ کرنے لگی۔ ایک روز میں شام گئے گھر نہ لوٹ سکا۔ باہر امرود کے باغ میں کچے کچے امرود توڑتے مجھے دیر ہو گئی۔ پتہ نہیں میرے باقی ساتھی کیا ہوئے لیکن

جس وقت میں باغ سے باہر نکلا تو ہلکی ہلکی بوند بوندی ہو رہی تھی۔ پرانے بھٹے تک پہنچتے پہنچتے بارش کا یہ عالم تھا کہ مجھے لگا۔ پانی کا ریلہ مجھے زمین میں میخما چاہتا ہے۔ اس روز میں نے مائی تو بتو بہ کی جھگی میں پناہ لی۔

جس وقت جھگی میں داخل ہوا۔ مائی تو بتو بہ نے منہ پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ میں پھوس کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر سہم گیا۔ مائی اس وقت ایک آٹے کا پتلا بنا رہی تھی۔ اس نے بڑی توجہ سے ایک گٹھ مٹھیا آٹے کا اندھا بونا بنایا۔ پھر چولہے میں من کی چھٹیوں کی آگ جلائی۔ اب وہ اس آٹے کے پتلے میں سویاں کھبونے لگی۔ ہر سوئی پتلے میں فٹ کرنے کے بدوہ آنکھیں پھراتی اور دیر تک چھوچھو کرتی جس وقت اس نے اس آٹیکے پتلے کو آگ میں ڈالا۔ بجلی اس زور سے کڑکی کہ بھٹے سے لے کر امرود کے باغ تک ساری دھرتی سفید ہو گئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھول کر بھاگنا چاہا۔ لیکن اس وقت کسی نے پیچھے سے میرا کرتا پکڑ کر کہا..... ”دیکھ اگر کسی سے بات کی تو سویاں چھو کر تجھے بھیا گ

میں جھونک دوں گی..... کسی کو بتایا تو مجھ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

اس وقت میرے سامنے میری ہم جماعت نہیں تھی جس سے میں سوشیا لوجی کی بحثیں کیا کرتا تھا۔ بلکہ وہ مائی تو بتو بہ کی پتی تھی۔ جس میں پتہ نہیں کتنی ان گنت سویاں چھبی ہوئی تھیں اور وہ بھٹی میں اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو قیوم؟“

آفتاب کیسا آدمی ہے؟“

”مجھے کیا پتہ؟“

”وہ تمہارا روم میٹ تھا“

میں نے نثری انداز میں بولنا شروع کر دیا ”وہ اکتوبر کے مہینے کی پیداوار ہے اس ناطے سے وہ Libra ہے ایسے لوگوں میں ایک قدرتی ہوتا ہے۔“

”اور..... اور.....“

”تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا ہے۔“

”یہ تم مجھے کیا بتا رہے ہو..... یہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔“

”جو کچھ تم جانتی ہو، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔“

”اس نے کیسے وہ سب کچھ بھلا دیا میری محبت..... ہمارا..... میل جول وہ سب

کچھ“

”یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔“

”پھر یہ سب۔ کیا ہے؟..... یہ شادی..... یہ زیبا..... یہ ماں باپ کی

فرمانبرداری..... یہ سب کچھ!“

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

میں اسے آفتاب کی ایسی کوئی بات بتانا نہ چاہتا تھا جو اس کی محبت کو اور پختہ کرتی

اور پھر بھی میں اسے تسلی دینے پر مجبور تھا۔

”وہ کون ہے؟..... کیا ہے؟..... کیسا آدمی ہے؟..... خدا کے لیے تم تو اتنے

اچھے تجزیے کیا کرتے تھے..... بتاؤ ناں..... اس کی اصلیت کیا ہے؟“

میں نے سر کھجایا اور دانشور بن کر بولا..... ”دنیا میں رنگ رنگ کے لوگ ہیں

ان کی سٹڈی کے الگ الگ علوم ہیں..... تمہارا کیا خیال ہے کہ..... کہ آفتاب۔“

”تبت کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کے گرد رنگ کا ایک ہالا ہوتا ہے اور یہ ہالا

اس کی اصلی سائیکی کا index ہوتا ہے۔ کچھ لال ہیں کچھ پیلے کچھ سبز.....

جن کے گرد نیلا ہالا ہوتا ہے وہ لوگ ہمدردی کرنے والے ہوتے ہیں۔ سرخ

رنگ والے شدید ہوتے ہیں..... سوسائٹی سے یوں بھڑ جاتے ہیں جیسے ماتا دور کا

سرخ مینٹل سائڈ کے سینگوں سے الجھتا ہے۔ جذبے کے غلام جنس کے غلام یہ لوگ

توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ تمہارے آفتاب کا ہالا بادل کے رنگ کا ہے..... اس پر سورج

کی شعاعیں پڑیں۔

تو اس کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ زمین کا عکس پڑے تو مٹی رنگا ہو جاتا ہے۔
تمہارے آفتاب کے کئی جلوے ہیں کئی رنگ ہیں۔“

”ہاں..... ہاں..... اب اس بادل پر زیبا کارنگ چڑھنے لگے گا۔“

میں اسے جان سے نہ مارنا چاہتا تھا۔

”وہ بہت خوبصورت ہے.....“ سیمی نے میری طرف اس امید سے دیکھا کہ
میں اس جملے کی تردید کر دوں۔

”ہاں خوبصورت ہے لیکن بے رنگ ہے۔“

”اس کی بیوی ہے..... وہ اس کی محبت کی زیادہ مستحق ہے..... ہے نا۔ ہے نا بولو؟“

“

خدا جانے محبت کا دراصل مستحق کون ہوتا ہے؟ میں نے دیکھا ہے کہ بگڑے دل
رئیس جنہیں بہت محبت ملتی ہے عموماً اسی محبت کی مٹھاس کا مزہ زائل کرنے کے لیے اپنی
پشتوں کی

عزت اتروانے طوائفوں کے پاس جاتے ہیں..... شہر کے مشہور دانشور ایسی
عورتوں کے پیروں پر نماز پڑھتے ہیں۔ جو انہیں کتے کے باسن میں کھلاتی ہیں۔
انسان کا دل ہمیشہ محبت کا متلاشی نہیں ہوتا۔ جب محبت کی گیس سے اس کا غبارہ
پھٹنے لگتا ہے تو اس کی آرزو ہوتی ہے کہ کوئی سوئی ہلکا سا چھید کر کے اس کی انا کو کم کر
دے جو لوگ ہماری عزت اتارتے ہیں ادرے درے دفع دور رکھتے ہیں وہ ہماری انا
کو کترنے والی قینچی ہوتے ہیں۔ انا کا سائز بہت بڑا ہو جاتا ہے تو ایسی قینچی کہیں نہ
کہیں سے پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان ہمیشہ محبت کی فضا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیشہ
فرعون بنے رہنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ وہ خدا سے لے کر معمولی بد تک ہر سٹیج پر
اترتا چڑھتا رہتا ہے۔ جیسے سات سروں پر انگلیاں پھرتی ہیں۔ جب مختلف

طریقوں سے کئی بار یہ پھرت ہو چکتی ہے تو ایک انسان کا گیت مکمل ہوتا ہے۔ اسی لیے زندگی کے لیے محبت بھی ضروری ہے اور نفرت بھی..... جب نفرت پاتال میں لے اترتی ہے۔ تو پھر کہیں سے محبت اوپر اٹھاتی ہے اتنا اٹھائے لیے جاتی ہے کہ آدمی غبارہ بن کر آسمانوں کو چھونے لگتا ہے جب یہ غبارہ اور اوپر نہیں جاسکتا لیکن اس کی آرزو کم نہیں ہوتی تو کہیں سے حقارت..... نصرت کی سوئی گیس کم کرنے کو آٹکتی ہے یہ عمل مسلسل ہے..... زندگی کے ساتھ ساتھ ہے..... خدا سے لے کر عبد تک عمل فرشتے سے لے کر شیطان تک کی منزل۔

ان مٹ سے لے کر ناپائیدار تک

”تم کیا سوچتے ہو۔۔۔۔ کہاں چلے جاتے ہو تم قیوم۔۔۔۔ تم کو اپنی پڑھائی کا اس قدر فکر کیوں ہے؟“

میں چپ رہا۔

”مجھے بتاؤ۔۔۔۔ سمجھاؤ مجھے خدا کے لیے۔۔۔۔ جس طرح تم مجھے ڈرامہ کی تھوڑی سمجھایا کرتے تھے خود کشی کی۔۔۔۔ بتاؤ قیوم محبت کہاں ملتی ہے؟۔۔۔۔ کن کو ملتی ہے

؟۔۔۔۔۔“

میں اسے کیا بتاتا۔

میں تو خود بچپن سے محبت کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ محبت کہاں ملتی ہے کن کو ملتی ہے اور کن وجوہات کی بنا پر ملتی ہے لیکن جب کبھی وہ مجھ سے بات کرنے کی توقع رکھتی میں بولتا جاتا۔

”محبت کا تحفہ سبھی عموماً دو قسم کے لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔۔۔۔ ایک وہ فرعون صفت لوگ جو اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتے جو چلتے نہیں اچھلتے ہیں ان کو ان کو پر قینچ کرنے کے لیے ان کی زندگی میں کوئی شخص محبت کا گلدستہ لے کر داخل ہوتا ہے

گلدستہ وصول کرتے وقت فرعون شکل لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کانٹے بھی ہیں اور چیونٹیاں بھی۔۔۔۔۔ عموماً ان ہی چیونٹیوں کے ہاتھوں بڑے بڑے ہاتھی جاب جبق ہو جاتے ہیں۔“

”میں تمہاری بات سمجھی نہیں قوم۔۔۔۔۔ یا شاید آج میرا دماغ درست نہیں“

”ایک وہ لوگ جو خدا سے بھی نہیں ڈرتے ان کو انسان بنانے کے لیے۔۔۔۔۔ عہد بنانے کے لیے محبت عطا ہوتی ہے ان کی حیثیت سمجھانے کے لیے۔ ان کا قد عام انسانوں جتنا کرنے کے لیے۔۔۔۔۔ یا پھر محبت ان لوگوں کو ملتی ہے جو ہرنے کی آرزو میں جیتے ہیں جان بلب ہوتے ہیں ان کے لیے محبت کا تریاق آتا ہے غیب سے۔ یکدم ان مردہ لاشوں میں زندگی کے آثار راجا گرہوتے ہیں وہ درختوں کو پرندوں کو چاند ستاروں کو از سر نو دیکھنا شروع کرتے ہیں بچے کی حیرت کے ساتھ موسم ان پر اثر انداز ہوتے ہیں ایک بار پھر۔۔۔۔۔“

”کیا کیا کیا؟۔“

”سنو بی سنو۔۔۔۔۔ محبت مارتی بھی ہے اور زندہ بھی کرتی ہے۔۔۔۔۔ پھنکارتی انا کو مارنے کے لیے بھی محبت کا ذہر ہے اور قریب المرگ زندگی کو زندہ کرنے کے لیے بھی محبت

ہی کا تریاق ہے۔“

اب وہ پھر گئی

”تم سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ تم بھی ایویں ہی ہو۔۔۔۔۔ واہیات۔۔۔۔۔

صرف کچے کچے فلاسفوں بالکل ڈاکٹر تھیل کی کاربن کاپی۔“

”تمہیں تسلی کیسے ہوگی۔“

”محبت سے صرف محبت سے“

میں ہنس دیا۔

”اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔“

میں نے دکھی سے کہا۔۔۔۔۔ تمہیں محبت نہیں چاہیے سیمی۔۔۔۔۔ تمہیں صرف آفتاب درکار ہے۔۔۔۔۔ سب کا یہی حال ہے۔۔۔۔۔ سب کا سب کو محبت چاہیے لیکن صرف اس شخص کی جسے اس کا اپنا دل شدت سے چاہتا ہے۔۔۔۔۔ باقی سب محبتیں کیلے کا چھلکا ہیں وافر واہیات۔۔۔۔۔ غیر ضروری۔۔۔۔۔ ایویں۔

”تم نے کبھی محبت کی ہو۔۔۔۔۔ تو تمہیں پتہ ہو آدمی کس کرب سے نکلتا ہے تم کو تو ہر وقت پڑھائی کی پڑی رہتی ہے۔۔۔۔۔ اپنی تھیوریاں بنانے میں لگے رہتے ہو پروفیسر سہیل کے ساتھ سوشلزم کی بحث کرنے میں وقت گزرتا ہے تمہارا۔۔۔۔۔ جاؤ جا کر مارکس پڑھو۔۔۔۔۔ اینگلز پر سر کھپاؤ۔۔۔۔۔ تم کو کیا پتہ کہ ایک ایسا وقت انسان پر آتا ہے جب وہ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے باوجود خود کشی کر لیتا ہے۔۔۔۔۔ تم کو کیا پتہ۔۔۔۔۔ سب کچھ معاشرہ نہیں ہوتا۔ معاشیات سے انسان کی فلاح مکمل طور پر بندھی ہوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔ تمہیں کیا پتہ۔“

”مجھے پتہ ہے۔۔۔۔۔ پتہ ہے۔“ میں چلایا

اس نے اپنا پرس اٹھایا لکڑی کی ہیل والے جوتے تلاش کیے اور اٹھ گئی
”تمہیں میری بات سننا ہوگی۔۔۔۔۔ میں نے بھی محبت کی ہے کسی سے۔۔۔۔۔ شدت کے ساتھ۔۔۔۔۔ آج تمہیں میری طرف کی کہانی بھی سننا پڑے گی سیمی۔“
”سنوں گی قیوم۔۔۔۔۔ غور سنوں گی لیکن آج نہیں۔۔۔۔۔ دیکھو ناں آج میرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی۔۔۔۔۔ ”صرف ایک جملہ۔“
”آج نہیں قیوم پتہ ہے آج ہی تو اس کی شادی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ آج ہی تو لینڈ سلائڈ ہوا ہے زبردست قسم کا۔“

وہ چپ چاپ باہر نکل گئی۔ صرف اس کا چھوٹا سا پھولدار رومال الانی چارپائی پر

پڑا رہا۔

اسے میرے اظہار محبت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔۔۔ میں اسے کیسے بتاتا؟ کہ میرے سارے فلسفے میرے تمام تجزیے پروفیسر سہیل کے ساتھ ہونے والے مباحثے اس ایک ناآسودہ جذبے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

کیا میں جنسی محرومی کا شکار تھا۔ کیا میں صرف Frustrated تھا؟

کیا میری ذہانت ان محرومیوں کی وجہ سے سان پر چڑھی تھی؟

سیبی کے جانے کے بعد فوراً کتابوں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے کئے بال پھولدار رومال۔۔۔۔۔ کئی چیزیں! جیسے شہد کی مکھیاں میرے تعاقب میں تھیں اور میں ان سے بھاگ کر کہیں جانہ سکتا تھا کئی بار باتیں کرتے کرتے وہ اپنی بائیں گال کے تل کو جڑ سے اکھاڑنے کی ایسی کوشش کرتی کہ مجھے اس کی کیوکس لگنا خنوں سے نفرت ہو جاتی۔۔۔۔۔ سیبی جا چکی تھی صرف اس کی خوشبو باقی تھی۔۔۔۔۔ تار پر سوکھنے والے کپڑوں کی طرح چارپائی پر رومال پڑا تھا اور اس کے جانے والی کی ذات کا کمپیوٹر چل رہا تھا۔

میں نے پہلے تو اس رومال اُکے باوجود پڑھنے کی کوشش کی پھر مجھے خیال آیا کہ جب تک وہ ایک لاوارث بچے کی طرح چارپائی پر بلکتا رہے گا میں توجہ سے نہ پڑھ سکوں گا۔ میں نے رومال اٹھایا سو نگھا اس کی تہیں بالکل ویسے جمائیں جیسے پہلے تھیں پھر اسے پاس رکھ کر پڑھنے لگا لیکن اب رومال بلی کے بچے کی طرح بڑا جاندار ہو گیا تھا۔ وہ پنکھے کی ہوا میں پھول رہا تھا۔ شکلیں بدل رہا تھا فضا میں اپنی خوشبو کو آنسو گیس کی طرح پھیلائے جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے بار بار میری آنکھیں نمناک ہو جاتی تھیں اور جب میں آنکھیں پونچ کر دوبارہ اسے میز پر رکھتا تو وہ پہلے سے زیادہ نڈرا اور کھلنڈرا ہو جاتا۔

اس رومال کو ٹھکانے لگانے کے لیے میں کوڈرینگل سے نکل کر انارکلی کی طرف

رات گئے اکادوکا آنے والوں کو پروا نہ تھی کہ کوئی لیڈیز رومال سے آنکھیں پونچھتا
کہا جا رہا ہے۔

آج رات سیمی نے میرے دل کے بازار سے کچ خریدے بغیر اس میں ساری
ٹریفک بند کر دیا تھا۔۔۔۔۔ جیسے اس نے اپنا تری ٹریڈ گلی کے ناکے پر لاکھڑا کیا۔
اب پچھلی گاڑیاں ہارن بجا رہی تھیں۔ پی پی پاں پاں کر رہی تھیں کچھ بے چین
کاروں سے اتر اتر کر اس کھڑے مٹری کے تھری ٹریڈ کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ گلی کے
دہانے پر جما کھڑا تھا۔۔۔۔۔ اس کی بریکیں فیل ہو گئی تھیں سلف جواب دے گیا تھا۔
سیمی اس رومال کی صورت میں میرے اندر ایک تھری ٹریڈ کھڑا کر گئی تھی میں اس
رومال کے ہوتے ہوئے نارل آمدورفت کا حامل نہ ہو سکتا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں
نے پہلے سے تنکے تلے رکھا پھر میز کی دراز میں ابن خلدون کی کتاب کے بایسویں
صفحے کے اندر چھپایا ابھی میں تین صفحے بھی پڑھنے نہ پایا تھا کہ میں نے اسے وہاں
سے نکال کر اپنی جیب تنگے لگی تو میں نے اسے سوٹ کیس میں بند کر دیا۔

پہلا بوسہ، پہلا تحفہ۔۔۔۔۔ پہلی مرتبہ اقرار محبت میں گرمیوں کی اولین بارش جیسی
کیفیت ہوتی ہے سارے میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیل جاتی ہے۔

حالانکہ یہ رومال نہ تحفہ تھا نہ بوسہ نہ اقرار محبت۔۔۔۔۔ پھر بھی سیمی سے وابستہ
پہلی چیز جو میرے ہاتھ آئی تھی کچھ دیر بعد میں نے رومال کو سوٹ کیس سے بھی نکال
لیا۔۔۔۔۔ اچانک وہ بہت غیر محفوظ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد پڑھائی، رومال اور میں
آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔۔۔۔۔ میں ہر پانچ منٹ کے بعد اس کی جگہ تبدیل کرنے لگا۔
۔۔۔۔۔ کبھی اس کی باری مغلرے تلے آتی۔۔۔۔۔ کبھی میں اسے بش سرٹوں کے اوپر رکھتا۔
۔۔۔۔۔ یہاں سے نکال کر پتلون کی اندرونی تہہ اس کا پڑاؤ بنتی۔۔۔۔۔ آخر میں بہت
سوچنے کے بعد میں نے اسے سوٹ کیس کے نیچے بچھے ہوئے اخبار تلے بچھا کر
سوٹ کیس کو تالا لگا دیا۔

بچپن میں ہمارے گاؤں میں اسی طرح میرے چچا ایک نیا سائیکل لے کر آئے تھے۔۔۔۔۔ ابھی اس کے ڈنڈوں پر خاکی کاغذ چڑھا تھا اور مچھلے مڈگاڈ پر لگا ہوا تالا بڑی مشکل سے کھلتا تھا۔۔۔۔۔ چچا کی سائیکل نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی سائیکل پر چڑھنا میرے مقدر میں نہ تھا میں صرف اسے صاف کر کے باہر والی حویلی میں کھڑا کر دیتا تھا چچا کے اٹھنے سے بہت پہلے میں اسے ہتی والے نلکے کے پاس لے جاتا سائیکل صاف کرنے کا سارا سامان میرے پاس ہوتا پرانے ٹوتھر برش، گریس کا ڈبہ صاف اور گندے چیتھرے، ڈھیریاں کنسنے کے پیچ کس، ہتھوڑی، موم۔۔۔۔۔ میں نے سائیکل صاف کرنے کے لیے جو سامان اکٹھا کر رکھا تھا وہ کار کی سروس کے لیے کافی ہوتا۔ ایک بار سائیکل صاف ہو جاتی تو پھر کبھی آنگن میں کبھی گھڑونجی کے پاس کبھی برآمدے میں اس کے پارک کرنے کی مشکل پیش آتی جس طرح ماڈرن لڑکیاں دھوپ سے بچتی ہیں اور اپنی جلد کا خیال رکھتی ہیں۔۔۔۔۔ میں سائیکل کے پینٹ کے لیے فکر کرتا رہتا۔

پھر چچا اٹھتے باہر کی حویلی سے سائیکل اٹھاتے۔ کچی مٹی سے بھری سڑکوں پر اونچی نیچی منڈیوروں پر کھلیانوں میں بنجر گزر گاہوں پر ہول کے کانٹوں سے بھری پٹریوں میں نہر کنارے کنارے والی سڑک پر یہاں وہاں جانے کہاں کہاں سائیکل لیے پھرتے۔ واپسی پر جب وہ گھر لوٹتے تو سائیکل گرد کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی۔

بازار سے واپسی پر میں کافی دیر اپنے نئے ٹائم ٹیبل کے مطابق خالص انداز میں بظاہر پڑھتا رہا لیکن سندرہی سندر کہیں سوچ کی ٹکٹکی اور لگی ہوئی تھی۔ جیسے گھڑی کی بیرونی سوئیاں منٹ گھنٹے دکھاتی ہیں لیکن اندر کی گراہیوں کی رفتار سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا گو میں بظاہر بیڈ لیپ جل کر اس روشنی میں رات کے تین بجے تک سوشیا لوجی پڑھتا رہا لیکن میرے اندر بار بار آفتاب کی شادی ہوتی رہی کبھی کاروں سے بڑے

تکلف کے ساتھ اترتی عورتیں نظر آنے لگتیں۔ کبھی بیرے چائے کے ٹرے اٹھائے نظروں میں گھوم جاتے کبھی آفتاب صاف دکھائی دیتا۔ اس کی اچکن شلوار سر سے بندھا ہوا سنہری تاروں والا سہرا اور گلے میں پڑے ہوئے بڑے بڑے نوٹوں کے ہار۔۔۔۔۔ کس طرح وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا تھا اور کس طرح اس نے اپنی اچکن اور ہار بیٹھنے کے بعد درست کیے تھے۔

”لڑکی کوئی نہیں آئی۔۔۔۔۔“ اس نے بہت آہستہ سے مجھ سے پوچھا تھا۔

پتہ نہیں وہ کس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔

آفتاب کی شادی کے پلے بیک پر سیمی کی آہوں کا مسلسل میوزک سو پر امپوز ہو چکا تھا کوئی بینڈ کوئی ڈھولکی کوئی گیت میرے ذہن میں نہیں ابھرا رہا تھا۔ بلکہ مسلسل سیمی کا رونا آہستہ آہستہ بیک گراؤنڈ میوزک کی طرح ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔۔۔۔۔

سوشیالوجی کی کتاب میرے سامنے کھلی تھی رات کا پچھلا پہر تھا اور م، یں ماسٹر غلام رسول کی طرح اڑا ہوا تھا کہ پڑھ کر دم لوں گا۔

سونے پڑھنے پریشان خواب دیکھنے کا یہ تیسرا Phase تھا جب دروازے پر دستک ہوئی اور جمال داخل ہوا۔

”کون ہے؟۔۔۔۔۔“ میں کئی خوابوں کو توڑ کر جواب دیا۔

”جمال۔۔۔۔۔ جمال رشید۔۔۔۔۔ دروازہ کھولو۔۔۔۔۔“

جب میں نے دروازہ کھولا تو تھوڑی دیر کے لیے وہ بھی مجھے اپنی سوچ کا ہی ایک حصہ نظر آیا۔

”کیا ہے۔۔۔۔۔ کیا چاہیئے۔۔۔۔۔“

جمال نے اپنے ہونٹ کا لے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بولا

”یا راجد کا Accident ہو گیا۔۔۔۔۔ مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔“

”کس کا۔۔۔۔۔ کس کا۔۔۔۔۔“

”امجد کا۔“

”وہ آفتاب کی شادی سے میرے ساتھ واپس آیا۔ بیوقوف کی عقل ملاحظہ ہو، موٹر سائیکل پر پنڈی گیا راستے میں اینٹوں سے لدے ہوئے ٹرک سے اس کا موٹر سائیکل ٹکرا گیا۔۔۔۔۔ وہیں Finished پھڑک گیا۔۔۔۔۔ یار ہم سب اس کی ذہانت سے کتنا کھتے تھے؟۔۔۔۔۔ ہم سب اس کو Beat کرنے کی کتنی کوشش کرتے تھے۔۔۔۔۔ کیا شہزادگی سے منہ کی مار گیا۔۔۔۔۔ خدا قسم مجھے اس وقت بڑی Guilt ہو رہی ہے۔“

”یار ابھی تو وہ ہمارے ساتھ تھا۔۔۔۔۔ آفتاب کی شادی پر۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”کئی بار میں نے آرزو کی تھی کہ۔۔۔۔۔ کہ اگر وہ امتحان نہ دے تو میں فسٹ آسکتا ہوں۔۔۔۔۔ یار میری آرزو نے اس کی جان لے لی۔“

”احق نہ بنو۔۔۔۔۔ ایسی آرزو کبھی پوری تھوڑی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن اسے مصیبت کیا تھی کہ آدھی رات کو موٹر سائیکل پر۔۔۔۔۔“

”وہ فسٹ انا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ کہنے لگا ہوٹل میں میرا نام ویسٹ ہوتا ہے راتوں رات پہنچ جاؤں گا۔۔۔۔۔ صبح سے تیاری کروں گا سنجیدگی کے ساتھ۔“

وہ یہ کہتا ہی پھر کر کی جیسا گھوم کر واپس چلا گیا۔

میں واپس آ کر سوشیالوجی کی کھلی کتاب کو پڑھنے لگا۔

ہر منزل پر پہنچنے سے پہلے عمو ماراہ گیروں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔

کرسمس کی چھٹیوں سے بعد اور امتحانوں سے کچھ پہلے عمو عجیب عجیب واقعات ہونے لگتے ہیں کرسمس کی چھٹیوں کے بعد سی کالج میں نہیں لوٹی فائل کے امتحانوں سے اس قدر قریب آفتاب کی شادی کا ہو جانا حادثہ تھا پھر اب سپورٹس مین امجد کی

موت!

کیا ہر امتحان سے پہلے نیچرل سلیکشن بھی ہوتی ہے؟

کیا فطرت کچھ افراد کے فیمل ہو جانے سے خود ڈرتی ہے۔

کیا پاس ہو جانے کی خوشی کچھ پر پیش از وقت اثر انداز ہوتی ہے۔

ہر منزل پر پہنچنے سے پہلے امتحان گاہ میں جانے سے پہلے نفری کم ہو جانے کی آخری وجہ کیا ہے؟

آفتاب کی شادی سے بہت پہلے سہمی لاہور چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی؟

ایم اے سوشیالوجی کا امتحان دینے کے بعد میں اپنے بڑے بھائی کے پاس ساندہ چلا گیا۔ میرے پاس جانے کے لیے اور کوئی جگہ نہ تھی۔ میرے بڑے بھائی مختار سیکرٹریٹ میں ملازم تھے اور ان کے لیے یہ رہائش گاہ دفتر سے قریب تھی۔ کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ تک ہم بسوں میں آتے اور ہواں سے چل کر ساندہ پہنچتے۔ راستے میں بوچڑ خانہ گندے نالے سے سیراب کھیت، گدھے اور تعفن ہر روز ملتا۔

ساندہ کلاں کا یہ گھر دو منزلوں پر مشتمل تھا۔ نچلی منزل میں بھائی مختار ان کی ایف اے پاوی صولٹ اور دو بیٹے رہتے تھے۔۔۔۔۔ اوپر والی منزل کے اکلوتے کمرے میں کاسنی رضائی، سیکنڈ ہینڈ کتابیں تیل سے جلنے والے سٹور لیمپ اور میں رہتے تھے۔۔۔۔۔ باقی ضروریات کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی تھیں لیکن کاسنی رضائی کتابیں اور سٹور لیمپ میری طرح جاندار تھے ان میں حدت تھی اور وہ اپنی گم سم زندگی بالکل میری طرح چپ چاپ بسر کرتے تھے۔

بھابھی کم گو کم آمیز اور تیوری دار عورت تھی۔ اسے خوش گپی خوش گفتاری اور ہنسوڑ بازی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اس کے چہرے پر مردنی کا ایک غلاف چڑھ گیا تھا۔ پھلہری جیسے سفید چہرے پر براؤن تیلیوں جیسی چھائیاں پڑی ہوئی تھیں صولت بھابھی کے چہرے کے بجائے ان کے بازو اور پاؤں زیادہ جاذب نظر

تھے۔ ان کے ساتھ رہنے میں سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ وہ کام کی بات کرنے کے بعد جھٹ روپوش ہو جاتی تھیں۔

”تمہارے کپڑے دھو بی کو دے دیے تھے۔“

”اچھا جی۔“

”کھانا نعمت خانے میں دھرا ہے۔“

”اچھا جی۔“

”رات کو دیر سے آؤ گے“

”اچھا جی۔“

ہم دونوں کی گفتگو میں ہر دس قدم کے فاصلے پر خود بخود بریک لگ جاتی اس لیے رفتہ رفتہ ہم نے ایک دوسرے سے ضروری باتیں کرنا بھی چھوڑ دیں بھابھی کے دو لڑکے کرشن نگر کے کسی سکول میں پڑھنے جاتے تھے، ان کی نیکریں ڈھیلی کف گندے اور بستے ہمیشہ پھٹے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مجھے گھر سے باہر ایک پیڈل پر سائیکل چلاتے نظر آ جاتے تھے پتہ نہیں وہ واقعی بھابھی صولت کی طرح کم گو تھے کہ ان کے دل میں اپنے چچا کا تہور بیٹھ گیا تھا۔ گھر پر وہ اول تو محسوس نہ ہوتے اور اگر کبھی پڑھائیوں سے فارغ ہو بھی جاتے تو انہیں ایک ہی کھیل آتی تھی برآمدے میں رکھے ہوئے ایک تخت پوش پر چڑھ کر وہ گھنٹوں ڈیڈھ فٹ نیچے فرش پر چھلانگیں لگاتے رہتے اور ہر چھلانگ کے بعد ان کو پہلے سے زیادہی خط حاصل ہوتا۔

بھائی مختار درمیانے درجے کے ایسے افسر تھے کن کی ذہنیت کلرک کی ہوتی ہے آفس ڈاک، پالیسی، فائیل، کیس ڈی او وغیرہ ان کا روزمرہ تھا۔ وہ ایم اے پاس تھے اپنے وقت کے ذہین آدمی تھے لیکن اب نوکری ان پر مسلط ہو گئی تھی وہ نوکری کے علاوہ اور کسی چیز کے متعلق جان داری کے ساتھ سوچنے کے اہل نہ رہے تھے۔

اوپر والی منزل میں رزلٹ آنے تک میں اور میرے خیالت دست پیچھے ملا کر

رہے۔ کالج کے تمام ساتھی آخری پرچے کے بعد غائب ہو گئے۔ کبھی کبھی اچانک کسی دوکان پر کسی بس میں کوئی آشنا چہرہ مل جاتا رسمی سی گفتگو ہوتی اور پھر راہیں علیحدہ ہو جاتیں میرا معمول تھا کہ ہر روز صبح کے اخبار میں نوکریوں کی تلاش کرتا سینما پیج اور Wanted دیکھنے کے بعد میں تھک کر پلنگ پر جا لیٹتا۔

یہ برساتوں کا موسم تھا۔

بارش نہ ہوتی تو جس ہوتا۔۔۔ بارش ہوتی تو سلاخوں والی کھڑکی سے ہوا اور بارش اچانک آکر پرانی کتابوں سے لدی ہوئی میز پر حملہ کر دیتی۔ امتحانوں کے بعد ہر موسم چاہے کوئی بھی ہو لیکن برساتوں کا موسم خاص کر فریب خیال کا موسم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ سیمی کرسمس کی چھٹیوں کے بعد کالج نہیں آئی تھی۔ لیکن اب خدا جانے کیوں اور کیسے ہر بارش کے ساتھ وہ اندر آ جاتی اس نے تو موموں سون کے ساتھ ٹھیکہ کر لیا تھا خوش آمد خواہوں سے لے کر نسیاں تک اور سیمی کے پوتے نواسے پرورش کے سے لے کر جنگل تھل بیلے میں الف پھر نے تک ہر دہشت میں پھر چکا تھا۔ کبھی کبھی اپنی جنون آمیز سوچوں کی وجہ سے میں پہروں بغیر پنکھے کے لیٹا رہتا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا گردن کے نیچے نمکین سویاں چھنھنے لگتیں پھر سلاخوں والی کھڑکی کی خود بخود کھل جاتی اور برسات کی پھوار کے ساتھ سیمی کمرے داخل ہو کر سب کچھ بھگو دیتی

اس روز اخبار میں ایک نوکری کا اشتہار دیکھ کر میں نے درخواست لکھی گو مجھے یقین تھا کہ میں مر رہا ہوں اور مجھے نوکری کی حاجت نہیں ہوگی، پھر بھی میں نے بھائی مختار کو خوش کرنے کے لیے ایک عرضی لکھی اور اسے رجسٹر ڈکرانے کے لیے جی پی او چلا گیا۔

یہاں ہی اچانک سیڑھیوں پر میری ملاقات آفتاب سے ہوئی۔ وہ کچھ خط لفافے اٹھائے برآمدے میں آ رہا تھا۔ گو وہ کافی دیر میرا روم میٹ رہا لیکن ہم دونوں میں

دوستی تو ایک طرف بے تکلفی بھی نہ تھی یکدم وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا اور بیرونی ممالک سے آئی ہوئی ڈاک کے نیلے لفافے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔

”واہ قیوم کیا خوش نصیبی ہے میری۔ میری بروقت ملاقات ہوئی“

”کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔ آجکل۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں پوسٹ بکس ہے میرا۔۔۔۔۔ ڈاک لینے آیا تھا۔۔۔۔۔“ آفتاب نے

فرش سے لفافے چنتے ہوئے کہا۔

”میرا یہ مطلب نہیں۔۔۔۔۔ کیا کر رہے ہو آج کل؟ نوکری، بزنس، یا عیش۔“

”تا جبر کا بیٹا کیا کرے گا تا جری۔۔۔۔۔ اے کا کاروبار ہے۔۔۔۔۔ ہم بھی

دھنس گئے ہیں قالینوں میں۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دیر تک باتیں کرتا رہا۔۔۔۔۔ میں اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتا تھا

لیکن آفتاب کی مسکراہٹ ہمیشہ سے ایسی رہی کہ اس کی ہر بات مان لینے کو جی چاہتا،

ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے کے بعد جب میں بائیں برآمدے کی جانب بڑھا تو

پھر آواز آئی۔

”قیوم۔۔۔۔۔“ میں رک گیا۔

آفتاب میرے پاس آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔۔۔۔۔ ”یار میں لندن جا

رہا ہوں۔“

”بزنس مین ہو تمہارے لیے یہ عام بات ہے۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں میری

Immigration کے تمام کاغذات پورے ہو چکے ہیں بس اب سٹیٹ بینک کا تھوڑا

ساکام رہ گیا ہے۔“

”کب؟“

”ہفتے کو شام چار بجے کی فلائیٹ سے۔۔۔۔۔ پہنچ جانا انٹر پورٹ پر میں تمہارا

انتظار کروں گا۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔“

میں آفتاب کا دوست نہیں تھا

میں ایئر پورٹ جانا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے باوجود میں وہاں گیا کیونکہ آفتاب کا سیمی سے گہرا تعلق رہا تھا۔ آفتاب کو دیکھ کر کئی قسم کے جذبات سے دوچار ہونے کی مجھے عادت تھی۔ یہ تمام جذبات تکلیف دہ تھے مجھے نچوڑتے تھے، میرا سانس بند کرتے تھے پھر بھی میں ایئر پورٹ جانے سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔

بڑے ہال میں داخل ہوا تو دور دور تک آفتاب کہیں موجود نہ تھا۔۔۔۔۔ مسافر یوں کچا کھج بھرے تھے جیسے یہ ریل کا پلیٹ فارم ہو۔ سیلنگ فین بکثرت چل رہے تھے۔ لیکن اتنے جسموں کی گرمی کے باعث ہوا کہیں نہیں لگ رہی تھی۔ ایک گرم گرم تر کی حمام تھا۔ جس میں لوگ Baggage ٹکٹ اور سیٹ نمبت لیے آ جا رہے تھے۔ لوگوں کے ٹخنوں سے لوہے کی ریڑھیاں بچا بچا کر خاکی وردی والے پورٹر آڑے ترچھے راستہ تلاش کر رہے تھے۔۔۔۔۔ سیاہ لیدر کے صوفوں کے ارد گرد سوٹ کیس ٹوکریاں وینٹی بکس اپنی اہمیت کی وجہ سے کچھ پھولے پھولے سے تھے۔ اند جنگے کی جانب قطاروں میں کھڑے ایسے مسافر جو اکانومی میں سفر کر نیوالے تھے۔ اس کوشش میں مصروف تھے کہ انہیں ہوئی جہاز میں وہاں جگہ ملے جہاں سے فسٹ کلاس شروع ہوتا ہے اور ناگوں کی لگی خوب کھلی ہوتی ہے۔ غالباً کراچی جانے والے کی ایک انسائمنٹ میرے آنے سے پہلے ہو چکی تھی کیوں کہ کچھ مسافر جنگلے کے پاس کھڑے الوداعی بغل گیریوں میں مشغول تھے۔ پھر ان کے ملنے والے چھٹیوں کے فرائض سے سبکدوش ہو کر بغلی رستے سے باہر اس طرف جانے لگے جہاں جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو کر کھلا ایئر پورٹ نظر آتا ہے۔ میں نے سب طر نظر دوڑائی لیکن آفتاب کا کہیں پتہ نہ تھا کہ اس کے ملنے والے بہت امیر ہیں۔ لڑکیاں

کیوں غصہ آنے لگا تھا۔ جس نے بچوں کی اچھی پرورش نہ کی ورنہ آج وہ بھیجے کو خدا حافظ کہنے نہ آتے بلکہ اپنے بیٹے کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کرنے کے لیے حاضر ہوتے۔۔۔۔۔ ماموں برادری اداس تھی یکدم انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ ان کی بہن بوڑھی ہو گئی ہے اور بھانجے بھانجیاں جوان ہو گئے ہیں۔

ایئر پورٹ کا ہال نکھڑنے اور ملنے کی وجہ سے جذبات سے بوجھل ہو رہا تھا۔ میں شاید اور نہ ٹھہرتا اچانک دونوں کندھوں پر بیگ لٹکائے سیاہ چشمہ پہنے آفتاب جلدی جلدی چلتا ہوا داخل ہوا اس کے پیچھے زیبا تھی۔ تھوڑی تھوڑی صوفیہ لورین۔۔۔۔۔ زرا سی فردوس ایکسٹرس اور کچھ کچھ سکول کی استانی۔

یکدم لیدر کے تین سیاہ صوفوں پر سے بھاری بھر کم سفید عورتیں اٹھیں یک چھانا سادارہ بن گیا اور آفتاب اور اس کی بیوی اس دائرے میں بوسی بازی اور بغل گیری کرنے لگے۔ وقت کم تھا ملاقاتی زیادہ تھے۔ رومال سے آنسو پونچھنے والی نوعمر لڑکیاں دوپٹوں کے کنارے بھگوانے والی عورتیں، عینکوں کے پیچھے بھیگی آنکھوں والے مرد خوشی خوشی چھپی ڈالے والے لڑکے اور دائرے کے باہر سے اندروالوں کا منظر دیکھنے والے لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔

میرا ارادہ اس وقت کھسک جانے کا تھا اور شاید میں چلا بھی جاتا اگر یکدم آفتاب کی نظر مجھ پر نہ پڑ جاتی۔ وہ دائرہ توڑ کر مجھ تک آیا۔ زور سے مجھے سینے سے لگا کر بولا۔۔۔۔۔ ”یار دیر ہو گئی وہاں جنگلے کے پاس پہنچو۔“

baggage کارڈ بنا کر وہ جنگلے کی دوسری طرف آ گیا۔ اس وقت ہم دونوں کے درمیان پھر جنگلا حائل تھا اور اس کی بیوی وینٹی بکس اتھائے آہستہ آہستہ لاؤنج کی طرف جا رہی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سسرال والوں کو رومال ہلا کر الوداع کہتی اور پھر آفتاب کی طرف دیکھ لیتی۔

ہم چپ چاپ کھڑے تھے، پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا

پتہ نہیں مجھے کیا کہنا چاہیے تھا

بالآخر میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”یا تمہیں دیر ہوگئی ہے اب اندر چلے جاؤ۔“

”گھر پر ایک جم غفیر تھا۔۔۔۔۔ دراصل ہم کشمیری لوگ کوے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔

ذرا سی بات ہو تو اکٹھے ہو جاتے ہیں ان ہی کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ کبھی لندن آؤ تو

میرے پاس ٹھہرتا۔“

”ضرور۔۔۔۔۔“

”اچھا بھئی۔۔۔۔۔“ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

”اچھا بھئی۔۔۔۔۔“

”ایسے ہی ہے۔۔۔۔۔“

”ہاں بس ایسے ہی ہے۔۔۔۔۔“

”وطن بھی چھوٹ جاتا ہے آخر۔“

میں چپ رہا۔۔۔۔۔ مجھے وطن سے محبت کرنے کی عادت نہ تھی۔

اسی وقت اس کے ملنے والے گروپ میں سے ایک نوجوان ہمارے پاس آیا وہ

جوانی کی اس سٹیج پر تھا جہاں آواز بدلتی ہے۔ اور ایک جملے میں دو تین Tones بدلتیں

ہیں۔

”چاچا جی۔۔۔۔۔ بہت دیر ہوگئی ہے اباجی کہتے ہیں اب آپ چلے جائیں۔“

”ہاں دیر ہوگئی ہے۔۔۔۔۔ جارہا ہوں۔۔۔۔۔ بس ابھی گیا۔“

آفتاب کھویا ہوا تھا جیسے انیر پورٹ پر نہ ہو دھند میں راستہ تلاش کر رہا ہو۔

فاصلے پر ایک ہاتھ میں وینٹی بکس اور سورے میں رو مال پکڑے زیبا آفتاب کو

دیکھ رہی تھی۔

”جاؤ آفتاب دیر ہوگئی ہے۔“

”ہاں۔“

”خدا حافظ۔“ میں نے ہاتھ بڑھایا۔

”تم سیمی سے ملے۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔“ نظریں جھکا کر اس نے پوچھا۔

”تمہاری شادی کے روز ملا تھا پھر وہ پنڈی طلی گئی۔“

”کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہی ہوگی۔“

”میں کوشش کروں گا۔“

”کیسی کوشش؟۔۔۔۔۔“ میں نے پوچھا۔

”کہ۔۔۔۔۔ کہ پاکستان کبھی نہ آؤ۔۔۔۔۔ شاید وقت۔۔۔۔۔ فاصلے۔۔۔۔۔

شاید دوری۔۔۔۔۔ اچھا خدا حافظ۔“

”سنو آفتاب۔۔۔۔۔ سنو وہ جب بھی مجھ سے ملے گی ضرور پوچھے گی۔۔۔۔۔“ پتہ

نہیں یکدم میں نے کیا سوچ کر کہا۔

”کیا؟۔“

”بس پوچھے گی سب کچھ۔۔۔۔۔ تمہاری بیوی سے لیکر تمہارے متعلق۔“

”مثلاً کیا۔۔۔۔۔“ اب اسے بیگ وزنی لگنے لگے تھے اور وہ کندھے جھکنے پر مجبور

ہو گیا تھا۔

”مثلاً یہی یہی کہ۔۔۔۔۔ کہ آفتاب خوش تھا؟“

وہ ہنس دیا۔۔۔۔۔ قالین فروش باپ کا بیٹا۔۔۔۔۔ تازہ ٹیشو پیپر جیسی تازہ

مسکراہٹ والا آفتاب۔

”قیوم آگے جانے والے پیچھے رہے ہوئے لوگوں کی طرح کبھی یاد نہیں کرتے

گھر سے بندھی ہوئی گائے اور طرح یا د کرتی ہے اور تانگے میں جتا ہوا گھڑا اور طرح

جن سے یاد کرتا ہے جس کو کچھ مل جائے۔ اچھا یا برا اس کی یادداشت کمزور ہونے لگتی

ہے جن کو سب کچھ کھو کر اس کا ٹوٹا پھوٹا نعم البدل بھی نہ ملے ان کا حافظہ بہت تیز

ہو جاتا ہے۔ اور ہر یاد بھالے کی طرح ترقی ہے۔۔۔۔۔ دل میں۔۔۔۔۔ یسی۔۔۔۔۔
اور۔۔۔۔۔ میری پچولیشن میں بہت فرق ہے قیوم۔“

”آفتاب۔“

”کہو۔“

”تمہیں یسی سے محبت ہے؟۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ تمہیں یسی سے محبت ہے کہ
نہیں؟ وہ مجھ سے پوچھ گی۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔“

آفتاب نے مڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا رشتہ داروں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا
اور کندھوں پر بیگ درست کرتا ہوا بیوی کی جانب مڑ گیا۔

مجھے خدا جانے کیوں شبہ ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔

کچھ دیروہیں کھڑا رہا پھر باہر نکلا۔ بھائی مختار کی موٹر سائیکل سٹینڈ سے لی اور ایئر
پورٹ سے باہر نکل آیا۔

پتہ نہیں میں ایئر پورٹ کیوں گیا تھا۔

آفتاب میرا دوست نہیں تھا اس سے میری کوئی بے تکلفی نہیں تھی پھر بھی مجھے لگ
رہا تھا کہ پتہ نہیں کیوں اگر میں کبھی لندن گیا تو اس سے ملے بغیر نہ رہ سکوں گا۔۔۔۔۔
دنیا میں آفتاب سے زیادہ کوئی میرے قریب نہ تھا
کیا اس کی وجہ یسی تھی۔

کیا ان دونوں کی محبت کی وجہ سے میں انہیں ملنے پر مجبور تھا؟۔۔۔۔۔ میں سوچتا جا
رہا تھا۔

چھاؤنی میں پڑنے والی شام کا سکوت میرے موٹر سائیکل کے شور سے ٹوٹ رہا
تھا۔

عجیب بات ہے شام کے وقت بجلی کی روشنی کے باعث غروب آفتاب کو کوئی نہیں
پہچانتا پر ہمارے اندر رہنے والے پتھر اور دھات کے زمانے والے انسان کے ساتھ

بہت کچھ بیت جاتی ہے۔۔۔۔۔ تہذیب کے ہر قیدی کے اندر سانس کے ساتھ شام داخل ہوتی ہے شام چاہے سردیوں کی ہو چاہے برساتوں کی چاہے اس میں گرمی کی لوشامل ہو یا خزاں دیدہ چٹوں کی سرسراہٹ۔۔۔۔۔ شام کا انسان کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔۔۔۔۔ کندھے پر شکار کیا ہوا بارہ سنگھالٹکائے ہزاروں سال پہلے غار کا رہنے والا جس طرح گھر کو بھاگتا تھا۔ آج بھی اپنی اپنی جان کو کندھوں پر مشکیر ہے کی طرح لٹکائے سب شہری لوگ پناہ کی طرف بھاگتے ہیں

سب شام سے بدکتے ہیں

اندھیرے سے ڈرتے ہیں

ان ہونی ان دیکھی ان کہی سے سب کے ہونٹ سوکھتے ہیں

شام کو بسوں کا رنگ، تاغلوں کی رفتار، کاروں کا مڑنا، دوکانوں کے شوکیس، سائیکلوں کی گھنٹیاں، رکشا کے گنیر سب۔۔۔۔۔ سارا شہر خطرے کی گھنٹیاں بجانے لگتا ہے بے جان عمارتیں اپنی کھڑکیاں دروازے کھولنے بند کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتی ہیں خوفزدہ لوگ گھروں سے کافی ہاؤس، کلب، سینما، ہوٹل میں پناہ لیتے ہیں۔۔۔۔۔ کسی آشنا کا چہرہ، کسی محبوب کا لمس، کسی دوست کی غم آشنا آنکھیں، کسی بچے کی کھلی بانہیں، کسی عورت کے ڈھیلے قدموں کی چاپ، بریک لگنے والی آواز کسی سٹینڈ پر سائیکل کھڑی کرنے کا شور۔۔۔۔۔ بلانے بٹھانے قریب ہونے کی گھڑی یہ سب کچھ اور اس سے سو اور بہت کچھ۔۔۔۔۔

یہ سب شام کو جانے کا عمل ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ شام رات سے زیادہ غمگین ہوتی ہے، جب اتنا اندھیرا نہیں ہوتا کہ سب کچھ چھپ جائے۔ ایسے نظر نہیں آتا جسے دن کو سب کچھ دکھائی دیتا ہے سارے منظر یوں لگتے ہیں جیسے بارش کھڑکی پر پڑ رہی ہو، اور آپ دوسری منزل کی کھڑکی سے دیکھیں کہ آپ کا قریب نہیں ہے۔ کبھی آپ کو گمان گزرے کہ یہ آپ کی محبوبی نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ شام خوف اور گمان سے بھری

چلی آتی ہے۔

رات آنے سے پہلے لحاف کی کوکھ میں چھپنے سے بہت پہلے اور نیند کے گھٹنے پر سر رکھنے سے بہت پہلے سب ذی روح سورج سے بچھڑنے کا سوگ کرتے ہیں نظام شمسی کا تعلق سورج سے بہت پرانا ہے وہ دور رہ کر ایسے گرم کرتا رہتا ہے کہ موسموں کے آنے جانے کی چھاپ دل پر نہیں رہتی۔ سورج غروب سے پہلے زمین کا روشن حصہ ہر روز شعلہ رو ہو کر سلگتا ہے پھر اس کے کناروں کو آگ لگ جاتی ہے جیسے سٹی ہونے والی عورت کے پلو آگ پکڑ لیں کچھ سورج گنوا نے کا غم کچھ آفتاب کا کسی اور خطے میں طلوع ہونے کا حسد روشن زمین کے حصے کو کالسی جیسا روپ عطا کرتا ہے۔ جب بچھڑنا رفتہ رفتہ یقینی ہو جاتا ہے تو شام بیراگنوں جیسا لباس پہن لیتی ہے جیسے بجھی ہوئی راکھ ہو۔ روشنی رہتی ہے لیکن نور نہیں رہتا اندھیرے میں سیاہی پوری طرح حلون نہیں کر پاتی۔ پھکیاں بن کر سب طرف بکھر جاتی ہے۔

یہ وقت شام کے سے ہر شخص کے لیے بڑا اداس ہوتا ہے۔

لوگ دفتروں کو چھوڑ کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں عورتیں گھر چھوڑ کر دہلیز پھانکوں اور دروازوں پر جا رکتی ہیں بوڑھے سیر کا بہانہ بنا کر چا دیواری سے باہر بھاگنے چاہتے ہیں بچے پارکوں کو پلے گراؤنڈ سے بھاگ کر ماؤں کی طرف سرپٹ آتے ہیں سب وہاں نہیں رہنا چاہتے۔ جہاں وہ پہلے موجود ہوتے ہیں۔

موسموں کے تغیر سے کہیں زیادہ رات کی آمد انسان کو خوفزدہ کرتی ہے۔ انسان کی سائنسی سے نباتات کی روئیدگی سے جانداروں کی نشوونما سے جمادات کی پوشیدہ طاقت و پختگی کے ساتھ، ہواؤں سمندروں چاند ستاروں سے سورج کا رشتہ بہت پرانا ہے اگر کبھی کوئی شخص کھلی جگہ میں ہو، دریا کا کنارہ، پہاڑ کا دامن کھیتوں کی پگڈنڈی، کھلے کھلیان میں اگر وہ سورج سے بچھڑتے تو اس ی سائنسی کا یہ گونگا پن اجتماعی سائنسی کے گونگے پن چھا جاتا ہے اس طرح فرد فرد کی سائنسی کا یہ گونگا پن

اجتماعی سانگہ کے گونگے پن کو جنم دیتا ہے ایسی جگہوں میں جہاں لوگوں کا ہجوم ہو، جیسے سینما گھر، ہسپتال، ہوٹل ان میں بھی شام کے وقت عجیب قسم کی خاموشی ٹھہر ٹھہر کر وارد ہوتی ہے بولتے ہوئے چہرے اجتماعی گونگے پن سے نجات حاصل کرنے کے لیے بولتے چلے جاتے ہیں اور خاموش لوگ اور اندر دھنستے جاتے ہیں اور اندر۔۔۔

- اور اندر محفلوں میں تنہائیوں کی نسبت بڑھنے لگتی ہے۔۔۔۔ جلوت خلوت کا روپ دھارتی ہے اور لوگ الگ الگ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا یہ احساس کہ وہ مجلس میں رہ کر کس قدر تنہا ہیں بڑھتا جاتا ہے۔

مجھے شام اس پل پر ملی جو چھاؤنی کو شہر سے ملاتی ہے۔ اس پل کے عقب میں سٹیڈیم تھا اور سامنے دو رو یہ سڑک تھی۔ لاہور شہر تھا پل کے نیچے ایک دیریل انجن شنٹ کرنے کی حالت میں آ جا رہا تھا کچھ آفتاب سے ملنے کا اثر تھا کچھ پل پر اچانک شام سے ملاقات ہو گئی پھر پل کے نیچے شنٹ کرتے ہوئے انجن نے احساس دلایا کہ میں بھی ساری باتوں نے ایک لخت مجھے اداس کر دیا۔

ان دنوں میری عادت تھی کہ جب بھی میں خود ترسی کا شکار ہوتا تو ہمیشہ لانس باغ چلا جاتا۔

پتہ نہیں لارنس باغ کا نام بدل کر کیوں جناح باغ کر دیا گیا؟ کچھ شہر والوں کی صلاح سے ملکہ وکٹوریا کا بت اٹھوایا جا چکا ہے یا دوستوں نے سڑکوں کے نام اسلامی دیئے ہیں پر انے شہروں کو نئے ناموں سے نواز دیا تا کہ پچھلی تاریخ کا نشان نہ رہے نئی نسل پر انے مظالم کے نشانات نہ دیکھ سکے۔ پھر ان کے دل میں وہ نفرت نہ جاگ سکے جو ایسے سبیل دیکھ کر عموماً جوان سال لوگوں میں جاگتی ہے اس طرح بچے اپنی تاریخ سے بھی کٹے رہیں اور روایت کا حصہ بھی نہ بن سکیں۔

میں تنگمیری ہال کی طرف سے باغ میں داخل ہوا چھوٹے سے ٹی سال کے پاس
میں نے اپنی موٹر سائیکل پارک کی ایک ڈبیا سگریٹ خریدی پلٹ کر ان چڑھ کے

درختوں پر نظر ڈالی جو پہاڑوں کو چھوڑ کر شرمندہ شرمندہ میدانوں میں آباد ہو گئے تھے۔ لیکن جن کے دل میں ابھی تک پہاڑوں کو دیکھنے کی آرزو اتنی شدید تھی کہ وہ آسمان کی طرف بہت اوپر نکل گئے تھے۔

باغوں سے محبت کرنے والے لوگ بچوں پر سڑکوں پر گھاس کے ٹکڑوں پر موجود تھے کہیں دور ریستوران کے سپیکر سے گانے کی آواز آرہی تھی کھلی لانوں میں اب اکا دو کا کوئے موجود تھے اگر میں گھنٹہ پھر پہلے یہاں پہنچتا تو کوؤں کی ٹولیاں ہزاروں کی تعداد میں لانوں کے گھڑے پانیوں میں نہاتی نظر آتی۔

میں بار بار آفتاب سے ملاقات کی جگالی ذہن میں کر رہا تھا۔
سیسی کہا تھی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ آفتاب ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ وہ پنڈی میں کس کے پاس رہتی تھی۔۔۔۔ کیا کرتی تھی سیسی جیسی لڑکیاں کس قدر بے وقوف ہوتی ہیں جو پچھتاہیں نہیں۔ عشق لا حاصل کی قلابازی کھا کر۔

ملک التجار کا بچہ!

وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟

کیا لوگوں کے دل اس لیے ہوتے ہیں کہ اپنے دل بہلانے کے لیے استعمال کیے جائیں۔

کہیں دو رباغ میں ایک کوئل بار بار بلک رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ بابا تر ت مراد کے مزار کو جانے والی سڑک پر جا رہا تھا۔ پھر میں نے سیسی کو دیکھا۔ کافی فاصلے سے۔۔۔ وہ کانور کے درخت تلے زانوؤں پر سر دھرے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ کانور کا درخت۔۔۔۔ سیسی۔۔۔ اور شام مجھے میرے خوابوں کا حصہ لگے۔۔۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا اور دست بستہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ صرف آنسو اس کی گالوں پر بہنے لگے۔ وہ چغتائی کی

تصویروں میں بنی ہوئی غزال روٹڑ کیوں کی طرح اس وقت عشق بلب تھی۔ اس کی روح کا ہر مولیٰ کیول زخمی تھا اور وہ عشق کے پانیوں میں یوا تراہی تھی جیسے شہر سیلاب کے پانیوں میں غرقاب ہوتے ہیں۔

”تم پنڈی سے کب آئیں سیسی۔“

سیسی نے جواب نہ دیا۔

”تم۔۔۔ تم آفتاب کو الوداع کہنے آئی تھیں کہ۔۔۔۔۔“

وہ پہلے سے زیادہ خاموش ہو گئی یعنی جو آنسو بہہ رہے تھے وہ بھی خشک ہو گئے غالباً یہ وقت رجبہ گدھ کا وقت تھا۔ شاید میں نے اس مرتی ہوئی سیسی کو چھاؤنی والے پل پر سے دیکھ لیا تھا۔ شاید اس متعفن لاش کی خوشبو میرے تھکتوں میں ایئر پورٹ پر پہنچی تھی وہ اس قدر دلی ہو چکی تھی کہ اس کی ناک کا تختہ اب چہرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتا نظر آتا تھا۔ ماتھے کی ہڈی ابھرواں ہو کر آنکھوں پر چھبے کی صورت باہر نکل آئی تھی۔ لپ سٹک سے آشنا ہونٹ آج پھیکے بے رنگ اور جھڑبیری کے بیروں کی طرح جھریوں سے بھرے ہوئے تھے سارے چہرے کا ہاتھوں کا رنگ یرقان زدہ تھا۔

میں نے اس لاش کو ہاتھ لگایا۔

”تم ہوناں قیوم۔۔۔۔۔“ اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

”ہاں۔“

”میں جانتی تھی تم آؤ گے۔۔۔۔۔ مجھے پتہ تھا تم ویسے نہیں ہو۔“

”تمہیں کیسے پتہ سیسی۔۔۔۔۔“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”بس پتہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ پتہ چلتا رہتا ہے۔“

”لیکن پھر بھی۔۔۔۔۔ کیسے؟“

”مجھے پتہ تھا تم پہلے ایئر پورٹ جاؤ گے پھر یہاں آؤ گے۔“

”لیکن کیسے کیونکر؟۔۔۔ کیا تم Chairvoyant ہو۔“

”میں نے۔۔۔۔۔ ہی تو تمہیں ارپورٹ بھیجا تھا قیوم۔۔۔۔۔ جب تم۔۔۔۔۔
موٹر سائیکل پر واپس آرہے تھے۔۔۔۔۔ تو میں نے ہی تو تمہیں آواز دی تھی۔۔۔۔۔
بلایا تھا زور سے پوری طاقت سے۔“

”کیا۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو؟۔۔۔۔۔ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔؟“

”تمہیں شاید معلوم نہ ہو۔۔۔۔۔ کہ آج آفتاب نے جب شیو کی تو اس کی ٹھوڑی
پر گہرا کٹ لگ گیا تھا۔۔۔۔۔ تم نے دیکھا نہیں اس کی ٹھوڑی پر زخم تھا جاتے
وقت۔“

میں ہکا بکا رہ گیا۔۔۔۔۔ جب آفتاب رخصت ہوا تو واقعی اس کی ٹھوڑی پر تازہ
زخم کا نشان تھا۔

”تمہیں کیونکر پتہ چلا سیسی۔۔۔۔۔ بولو بتاؤ۔“

سیسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں بازو ڈھیلے چھوڑ دیئے اور کانفور کے درخت
سے کمر لگا کر بیٹھ گئی۔

میں دم دبائے کتے کی طرح اس کے پاس بیٹھا تھا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں بند
تھیں پر وہ حیات کی دنیا سے پرے بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ میں کھلی آنکھوں پاس تھا
اور یہ بھی اور یہ بھی نہ جانتا تھا کہ اسے میرے آنے کی خوشی ہوئی ہے کہ غم۔۔۔۔۔
دراصل مجھے کبھی علم نہ ہوا کہ سیسی کے پاس کس وقت جانا چاہیئے اور کس وقت اس
کے پاس سے اٹھ جانا بہتر ہے۔ کس وقت وہ میری صحبت سے اوب جاتی ہے اور
کس وقت اسے میرے پاس رہ کر لطف ملتا ہے۔ دو طرفہ محبت میں گولگول کی حالت
نہیں ہوتی۔ وہاں ہمیشہ لوہے اور مٹھنا طیس کا میل ہوتا ہے۔ خفگی، ناراضگی غم کوئی بھی
موڈ کیوں نہ ہو ملاقات احساس خوشی کا باعث بنتی ہے۔ ایسے عاشق بن بلائے مہمان

کی طرح میزبان کے گھر میں داخل ہوتے وقت اندباہر نہیں ہو رہے ہوتے۔

ڈرتے ڈرتے میں نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

”تمہاری اس خوبی کا کالج میں تو پتہ نہیں تھا کسی کو۔۔۔۔“

”تب مجھ میں یہ خوبی تھی ہی نہیں۔۔۔۔۔ یہ Sensitivity مجھ میں اب پیدا

ہوئی ہے آفتاب کو کھو کر۔“

”لیکن کیسے کیسے۔۔۔۔۔ کیسے تمہیں ان باتوں کی اطلاع ہوتی ہے۔“

”محبت کرنے والے دلوں پر کئی بھید کھلتے رہتے ہیں آپ اپنی آپ قیوم۔۔۔۔۔ آپ

آپ۔۔۔۔۔“

یکدم اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اندر دھنسی ہوئی پرکشش آنکھیں۔

”پھر چھوڑ آئے اسے؟“

”تم۔۔۔۔۔ تم کیوں نہیں آئیں“

”آ تو گئی ہوں۔۔۔۔۔ پنڈی سے۔“

”اے ایئر پورٹ چھوڑنے کیوں نہیں آئیں۔“

وہ کافور کے پتوں کو مٹھی میں لے کر مسانے لگی۔

”کیا کرتی ایئر پورٹ پر آ کر۔۔۔۔۔ اس کی زنجیر اس کی بیوی کے ہاتھ میں

ہوتی۔ میں تو اس کے رشتہ داروں کے سامنے رو بھی نہ سکتی کھل کر۔“

ایک موٹا سا آنسو اس کی گال پر لڑھک آیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ آنکھیں اپنے

کوٹے کے تمام آنسو بہا چکی ہیں۔

”بیوی۔۔۔۔۔ آفتاب کی بیوی۔۔۔۔۔ کیسا عجیب لگتا ہے کہ۔۔۔۔۔ کہ کوئی اور

آفتاب کی بیوی ہو۔۔۔۔۔ زیبا آفتاب۔۔۔۔۔ زیبا آفتاب۔“

وہ زیبا کے لفظ کو یوں دوہراتی رہی جیسے نئے نئے کپنے لے کر کوئی بچہ انہیں ہتھیلیوں

میں پھراتا ہے۔

میری عقل ڈاڑھ سیکنڈ انچر میں نکلی تھی۔۔۔۔۔ ان دنوں ماموں کے گھر کے لیے یہاں ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔۔۔۔۔ پچھلے مسوڑھے سونج کر چھوٹی چھوٹی گلابی پلاسٹک کی گلیاں بن گئے تھے ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ چہرہ دیے بغیر عقل ڈاڑھ کا ٹکنا ناممکن ہے۔ میں راتوں کو لیٹے لیٹے ان سوچے ہوئے مسوڑھوں پر زبان پھیرتا گلیوں میں دوڑ ہوتی اس دور بھکی سی لذت ہوتی۔ پھر یہ خوف مسلط ہو جاتا کہ جب ڈاکٹر چہرہ دے گا تو کیسی دور ہوگی۔ بار بار آفتاب کی بیوی کا نام لے کر بیسی بھی ایسی ہی خوفزدہ لذت سے آشنا ہو رہی تھی۔

”وہ لندن میں اس کے ساتھ رہے گا کسی Apartment میں۔۔۔۔۔ ہیں ناں
قیوم۔“

میں چپ رہا۔

”اس کے گھر کی کھڑکی کے آگے تین جرینم کے گیلے ہوں گے۔ دروازے کی کال بل ڈھیلی ہوگی۔ جب کبھی آفتاب کال بل پر انگلی رکھے گا۔ زیبا اندر سے جا کر اس کے لیے دروازہ کھولے گی۔ لندن میں ٹھنڈ شروع ہوگئی ہوگی۔ زیبا آفتاب کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں پکڑ لے گی۔“

”جو اذیت تم نے دیکھی نہیں سیمی۔۔۔۔۔ اس تخیل کی مدد سے کیوں اس قدر جان لیوا کر رہی ہو۔“

اس نے میری بات کانٹس نہ لیا وہ کافور کے پتے مسلتی ہوئی بولے جا رہی تھی۔۔۔۔۔

”سردیوں میں۔۔۔۔۔ لمبی راتوں میں ایک ہی تکیے پر سر دھرے وہ آدھی آدھی رات تک باتیں کریں گے۔۔۔۔۔ اور آفتاب اسے میرے متعلق ایسے سب کچھ بتائے گا جیسے۔۔۔۔۔ میں حقیقت نہیں تھی ایک وہم تھی۔۔۔۔۔ ایک

”شاید اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہی تکیے پر سر رکھ کر سبھی سوتے ہوں۔“

”لیکن کوئی بھی اس سے آدھی رات تک باتیں نہ کرتا ہو“

”سب اسی طرح سوتے ہیں سب اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔ تم چپ

رہو تمہاری کوئی شادی ہوئی ہے۔“

میں نے پورے دو سال اس لڑکی سے ایک طرفہ محبت کی تھی۔۔۔ ایسی ایک طرفہ محبت جس میں اتنی امید بھی نہ تھی کہ میری محبت کو قبول ہی کر لیا جائے گا۔ آفتاب درمیان سے نکل گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ کانور کے درخت کا اثر تھا یا شاید جان بلب سیمی کے جسم کی خوشبو تھی ہو سکتا ہے کہ سارے باغ میں گرمی میں جھلسا ہوا اندھیرا چھا گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا چیز تھی جس نے بغیر امید کے میرے حوصلے بلند کر دیے تھے، اس وقت میری جسمانی جذباتی اور قلبی اشتہابت بڑھ گئی تھی۔ میں کبھی ہنستے چہروں سے پیار نہ کر سکا۔ شاید بہتے آنسو دیکھ کر میری روح میں کسی خاص قسم کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔

میں نے اس سارے عشق کے اظہار کا ارادہ کر لیا جو ایک عرصہ سے میرے دل میں دفن تھا۔ مجھے علم تھا کہ اس اظہار سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوگا۔۔۔۔۔ نہ ہمدردی، نہ محبت۔ وہ کسی اور نیوکلس کے گرد کسی اور محور پر گھوم رہی تھی۔۔۔۔۔ میں جانتا تھا کہ جب تک میں اس کی خاطر اپنی ذات کو مٹاتا رہوں گا وہ میرے وجود کو برداشت کرتی رہے گی۔ لیکن جہاں سے میری ذات کے تقاضے شروع ہوں گے وہ دریا کنارے کھڑی سیاہ چشمہ لگائے ڈوبنے والی کشتی کا منظر دیکھ کر ہاؤ سویت کہے گی اور پیٹھ موڑ لے گی۔ میں اس کا کریڈٹ کارڈ تھا جسے دکھا کر بھنوا کر وہ ہمیشہ آفتاب حاصل کرتی تھی میں ہنر ماسٹرز وائس تھا جو نہیں اس کی سونے مجھ پر پڑتی میں آفتاب پکارنے لگتا اس سے پرے کچھ نہ تھا۔

اتناسب کچھ جاننے کے باوجود میں اس کے سامنے بالکل مجبور تھا۔

میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر پوچھا۔۔۔۔۔ ”کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ۔۔۔۔۔ کہ کبھی آفتاب کو تم سے محبت تھی؟“

وہ ہنس دی۔۔۔۔۔ اس کا چہرہ اس قدر قریب تھا کہ باسی چیونگ گم کی خوشبو کے بجائے میری طرف آنے لگی۔

”محبت پانے والا کبھی اس بات پر تو مطمئن نہیں ہو جاتا کہ اسے ایک دن کے لیے مکمل طور پر ایک شخص کی محبت حاصل ہوئی تھی۔ محبت تو قیوم ہر دن کے ساتھ اعادہ چاہتی ہے۔ جب تک روز اس تصویر میں رنگ نہ بھرو تصویر فیڈ کرنے لگتی ہے جیسے۔۔۔۔۔ جیسے روز سورج نہ چڑھے تو دن نہیں ہوتا۔ اسی طرح جس روز محبت آفتاب طلوع نہ ہو رات رہتی ہے۔۔۔۔۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔۔۔۔۔ مجھے غم نے فلسفی بنا دیا ہے۔۔۔۔۔ تمہیں کیا پتہ زمین کا ہر قطعہ سورج کیوں مانگتا ہے جس شخص سے محبت ملے ہمیشہ اسی کے پاس رہنے کو کیوں جی چاہتا ہے۔۔۔۔۔“ وہ خدا جانے کب اور کیسے اتنی اردو سیکھ گئی تھی۔

”اب۔۔۔۔۔ اب وقت ہے۔۔۔۔۔ اتر راجہ گدھ اب وقت ہے۔۔۔۔۔“ میں نے جی کی بات سن کر اندر رہی اندر کہا۔

”کچھ لوگوں کو ایک دن کے لیے بھی اپنا من چاہا۔۔۔۔۔ آفتاب نہیں ملتا۔ سبھی اندھیروں کے متعلق کیا ارشاد ہے جو ہمیشہ روشنیوں سے ہٹ کر رہتے ہیں“ میں نے پوچھا۔

اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور پھر لا تعلق ہو گئی۔۔۔۔۔ اسے میرے اندھیروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرے اظہار عشق سے اس کا وقت ضائع ہوتا تھا۔ دراصل وہ کوئی ایسی بات سن ہی نہیں سکتی تھی۔ جس کا اس کی اپنی ذات کے ساتھ تعلق نہ ہو۔ اس کے اندر کہیں ایسا کٹ آؤٹ لگا تھا جو اپنا ذکر بند ہوتے ہی فوراً ساری بجلی کا کرنٹ

بند کر دیتا۔۔۔۔

”اے مجھ سے بڑی محبت تھی قیوم۔۔۔۔ اب تو۔۔۔۔ میں کوئی ثبوت بھی نہیں دے سکتی۔۔۔۔ لیکن فقہہ انیر میں وہ مجھ سے بڑی شدید محبت کرتا تھا۔۔۔۔ کبھی کبھی مجھے لگتا میرے بغیر وہ مر جائے گا۔۔۔۔ یا شاید۔۔۔۔ یا شاید یہ بھی میرا وہم تھا۔“

”ان باتوں سے حاصل یہی؟ اس توڑ پھوڑ سے کیا بنے گا۔“

”مجھے اب اپنا کچھ نہیں بنانا قیوم۔“

”تم اسے خط لکھنا چاہو گی۔“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”کیا ملے گا خط لکھ کر؟ میرے خط تو شاخوں پر ہی سوکھ گئے نہ میں نے انہیں گلدان میں سجایا نہ کسی نے انہیں گلے کا ہار کیا۔“

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس طرح کسمپانی جیسے غلطی سے تھنڈے پانی کا شور سردیوں میں اپنے اوپر کھل جائے۔

”سنو بیسی تم ماڈرن لڑکی ہو۔۔۔۔ تمہارے کٹے ہوئے بال ہیں۔ لباس چال ڈھال سب ماڈرن ہے۔ تم نے آفتاب کی نقل میں اپنے آپ کو مشرقی کر لیا۔ اردو سیکھ لی یہ اور بات ہے۔۔۔۔ لیکن اندر سے تم Liberated لڑکی ہو۔ خدا قسم ایسی لڑکی قتل کرتی تو اچھی لگتی ہے قتل ہوتی کچھ اوپری سی لگتی ہے۔“

”پھر میں کیا کروں کیا کروں قیوم۔۔۔۔ اس نے زیبا کو مجھ پر کیوں ترجیح دی۔ کیوں کیوں کیوں؟“

”آج کا ماڈرن مرد اور عورت سمجھوتہ کرتے ہیں ماحول سے اپنی غلطیوں سے اپنی Genetics سے۔“

وہ اب رات کے پہلے اندھیروں میں کھو رہی تھی۔ صرف اس کی آنکھوں کی دھنسی ہوئی چمک جگنوؤں کی طرح اندھیا روشن کرنا چاہتی تھی۔

”اس کی خاطر میں نے ایم اے چھوڑا۔۔۔۔۔ گھر چھوڑا۔۔۔۔۔ اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میرا دل مانے بھی۔۔۔۔۔ دل مانتا تو مر جانے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔۔ آفتاب چلا گیا اب کچھ ہو توڑا جاسکتا ہے۔“

میں اس کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔۔۔۔۔ ”سنو سیمی ان باتوں سے کچھ نفع نقصان نہیں ہوتا کبھی۔۔۔۔۔ یہ باتیں ہر جگہ ہر سے ہر رت میں یہاں وہاں ہوتی رہتی ہیں تمہیں کبھی اس اعتقاد سے نہیں ہٹنا چاہیے کہ جیسی محبت اس نے تم سے کی پھر کبھی کسی سے نہ کر سکے گا۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟۔۔۔۔۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟“

”وہ۔۔۔۔۔ بڑا اثر میلا اور محتاط تھا سیمی۔۔۔۔۔ میں نے کسی لڑکی سے اسے بات کرتے کبھی نہیں دیکھا تمہاری جانب وہ خود بخود کھینچتا جاتا تھا۔ اس کی روح۔۔۔۔۔ اس کی سائیکی اس کا جسم سب تمہارے تابع تھے۔۔۔۔۔ اسے نہ بدنامی کا ڈرتا۔۔۔۔۔ نہ بربادی کا۔۔۔۔۔ بس وہ کھینچتا رہتا تھا خود بخود۔۔۔۔۔ خود بخود۔۔۔۔۔“

”مائی فٹ او تم چھوڑو قیوم۔۔۔۔۔ اچھا خود بخود تھا اسی لیے اتنی آسانی سے چلا گیا۔“

ایسی سیمی کو میں کیا بتاتا کہ میں اس سے پورے دو سال عشق کرتا رہا ہوں۔ شاعروں کا عاشق۔۔۔۔۔ مجذوبوں کی سی لگن کے ساتھ۔۔۔۔۔ میں ایسی لڑکی کو کیا بتاتا کہ کچھ لوگ پہاڑوں کی اس جانب ہوتے ہیں جہاں سورج کبھی نہیں چمکتا۔۔۔۔۔ جو سورج کی حدت کو ہواؤں سے اخذ کرتے ہیں کچھ لوگ اپنے جسم پر خوشبو نہیں لگاتے۔ دوسروں کے لباس میں لگی خوشبو کو سانسوں سے اپنے اندر پہنچاتے ہیں۔

”مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔۔۔ سیمی۔۔۔۔۔ کیا یہ تمہارے لیے کافی ہو سکتی ہے؟“

کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت الفاظ تلاش کر رہی تھی جیسے کم بیلنس والے لوگ چیک لھٹتے وقت ذہن میں پڑتا لگاتے ہیں کہ کتنی رقم کا چیک لکھیں تو پیسے مل جائیں گے۔ وہ بار بار منہ کھولتی اور بند کر لیتی اس کے اندر کا پریشر کھلنے کے لیے بے قرار تھا لیکن نکاس کی کوئی صورت نہ تھی۔

شاید اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں اس کے ماتھے اور گالوں کو چوم چکا تھا۔!

”میں پنڈی واپس جانا نہیں چاہتی۔ حالانکہ وہاں مجھے ایک ٹریول ایجنسی میں نوکری مل گئی ہے۔“

”چلی جاؤ“

”نہیں جاسکتی۔“

”پھر!۔۔“

”یہاں لاہور میں میرے Parents ہیں میں ان کے پاس جاسکتی ہوں۔“

”تو چلو۔۔۔۔۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔“

”نہیں جاسکتی۔“

”تو کہا جاؤ گی اتنی رات گئے۔“

”یہیں رہوں گی۔“

”اتنی گرمی میں ساری رات۔“

”جب تک مجھے سمجھ نہ آجائے قیوم۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ اس نے مجھے کیوں

چھوڑا۔ یا میرا دل نہ مان جائے کہ یہ سب کچھ جھوٹ تھا میں کہاں جاسکتی ہوں بھلا؟

بتاؤ ناں۔۔۔۔۔“

مجھے کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ میں کیا کروں۔ اب گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے مال روڈ

کے ٹریفک کی آواز بھی کم ہو چکی تھی۔

گرمی تھی جس تھا۔۔۔۔۔ اور سارے میں کانور کی اندھی خوشبو تھی ایک کونونٹ کی

پڑھی لکھی لڑکی کا منہ زور عشق تھا۔

”تم آفتاب کو نہیں جانتیں۔ وہ کسی پریشرتلے کچھ کرنے کا عادی نہ تھا۔۔۔۔۔ اس نے تمہیں کسی دباؤ تلے نہیں چاہا اور کسی پریشرتلے اس نے شادی نہیں کی ہے۔ اس بات سے تمہیں سمجھوتہ کرنا ہوگا سیسی۔۔۔۔۔ آفتاب کا جسم ضرور زیبا کا ہے لیکن اس کا دل۔“

وہ اب پھر کلاس میں بیٹھی تھی۔۔۔ اس کا چہرے پر سوال بھی تھے اور جواب بھی۔۔۔۔۔ جیسے وہ سوشیا لوجی کی کوئی دقیق کتاب ساری رات۔۔۔۔۔ پڑھتی رہی ہو۔

”جانے دو قیوم۔۔۔ انسانوں کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔۔۔۔۔ آدمی دولت بانٹ سکتا ہے مراعات میں انصاف کر سکتا لیکن اپنے اندر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا، پتہ نہیں تم میری بات سمجھ بھی رہے ہو کہ نہیں۔۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔۔ بنگ مین۔۔۔۔۔ ٹکڑے ٹکڑے انسان سے کسی کی سیری نہیں ہوتی۔ اگر میری اس سے شادی ہو جاتی تو کیا میں برداشت کر لیتی کہ دل میں ہو کسی اور کی پرستش کرتا رہے اور جسمانی طور پر میرا رہے۔ اور جسمانی طور پر میرا رہے۔۔۔۔۔ کبھی گارڈ آدھے یا پونے پیسے پر بھی چلی ہے؟ آدمی پورا مل جائے تو خلا نہیں بھرتا تم آدھے پونے کی بات کر رہے ہو۔“

میں نے سیسی پر نظر ڈالی۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھے کچھ سودا ہے جو میں اس گرمی میں جب کہ زمین اور آسمان دونوں جس میں لرز رہے ہیں گہری رات کے وقت ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ ایسی لڑکی جس کا محبوب اسے چھوڑ کر لندن چلا گیا اور جو اس کے فراق میں آگے پیچھے دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھ سکتی

لیکن ہم تو کرگس کے لوگ ہیں۔ ہم تو ازل سے ان مردوں پر پلے تھے۔ ہم گدھ برداری کے لوگ سیسی کو آدھے پونے کی بات کیا سمجھاتے۔۔۔۔۔ ہم تو گرم خون کے

عادی ہی نہ تھے ہم اسے کیسے سمجھاتے کچھ لوگوں کو صرف جسم کے سہارے زندہ رہنے کا حکم ہوتا ہے

”جب آفتاب نے مجھ سے کہا کہ وہ شادی کر رہا ہے تو۔۔۔۔ تو میں نے اس سے پوچھا تھا۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔ کیوں آفتاب؟۔۔۔۔ پر اس نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔“

”شاید اس کے پاس ایسا کوئی جواب نہ تھا جو اس کی اپنی تشفی کر سکتا ہو۔“
”اس روز اس نے آسمانی کے رنگ سے بھی ہلکی چیز کلاتھ کی قمیض پہن رکھی تھی۔
میں نے اسے کالروں سے پکڑا کر اتنی بار پوچھا کہ اس کے کالر کی سلامتی نکل گئی
قیوم۔۔۔۔۔“
”کیا پوچھا۔“

”دل ساتھ نہ ہو تو شادی کا فائدہ آفتاب۔۔۔۔۔ جسم ساتھ نہ دے تو ہمیشہ کے
نبوگ سے حاصل۔۔۔۔۔ میں سے کھینچتی رہی پوچھتی رہی اور وہ کہتا رہا کیا لنگڑے
زندہ نہیں رہتے کیا اندھے چلتے پھرتے نہیں۔۔۔۔۔ میں مر رہی تھی اور وہ کمینہ
میری بات کا جواب بھی نہ دیتا تھا۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ مر رہی تھی۔

اس وقت ریسوران سے آنے والی موسیقی کی آواز بند ہو گئی۔ دیر سے جانے
والوں کی چاپ بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ کبھی کبھی دور سے کسی سپاہی کی سیٹی اچانک سر
سے نکل کر درختوں پر سوئے پرندوں کو جگا دیتی اور تھوڑی دیر کے لیے درختوں پر پھڑ
پھڑانے کی ہلچل ہوتی اور پھر سب خاموش ہو جاتا۔

ستمبر کی گرم رات کا پچھلا گرم پہر۔

میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اس کے دونوں کندھے جھنجھوڑ کر میں نے
پوچھا۔۔۔۔۔ ”تمہیں محبت چاہیے۔۔۔۔۔ وفا چاہیے۔۔۔۔۔ رفاقت؟“
”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ میں بچپن سے بہت

Pampered ہوں قیوم میں محبت کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی لیکن۔۔۔۔ لیکن اب زندہ رہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔۔۔۔“ بار بار متعدی بیماری کی طرح مایوسی اس پر حملہ کر دیتی۔

”میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔ جس طرح سات ماہ کے بچے کو ہسپتال کے Incubator میں زندہ رکھتے ہیں۔“

”اچھا قیوم؟۔۔۔۔ تم مجھے بچا لو گے۔۔۔۔ اس سے سیسی سے؟۔۔۔۔ میں جانتی ہوں تم بھی مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دو گے کسی دن۔“

”نہیں نہیں سیسی میں تمہیں اپنی روح کی حدت سے زندہ رکھوں گا۔۔۔۔ خدا قسم میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا Never“

یہ صرف گدھ جاتی کی عقل ہے کہ وہ مرے ہوؤں سے زندگی کا وعدہ کرتے ہیں اس وقت میرے پاس کچھ نہ تھا۔ صرف ہمدردی کا ست رنگا جال۔۔۔۔ آفتاب نے یہ غزال شہر شکار کیا تھا مجھے اس مردہ لاش کو کھانے کا حکم تھا۔ وہ نر بل نڈھال کا نور کے درخت تلے نیم مردہ پڑی تھی۔ یہ لارنس باغ کا وہ حصہ تھا جہاں شام پڑتے ہی جنات کا پہرہ ہو جاتا ہے کئی صاحب دل لوگوں کو یہ جنات خود مل چکے ہیں۔ کچھ ان کو مشعلیں جلائے درختوں میں غائب ہوئے دیکھا ہے کچھ ان کے گنجنے سر، نوگزرے قد دیکھ کر باغ سے سرپٹ بھاگے ہیں اس وقت ان ہی جنات کے خوف۔۔۔۔۔

کوئی مالی چوکیدار سپاہی ادھر نہیں آتا۔

سارے میں جگنو میقش لگے دوپٹے کی طرح چمک رہے تھے اور سیسی کا نور کے پتوں پر ہلکے ہلکے سینے میں ٹھنڈی بوتل کی طرح ہولے ہولے بھاپ چھوڑ رہی تھی۔ یہاں سیسی سے میرا ایک نیا تعلق پیدا ہوا۔ جسمانی رفاقت کا بانجھ سفر سیسی کو اپنی پردانہ تھی وہ آفتاب کے بعد کس کی تھی کیوں تھی؟ اس بات کی اسے خبر نہ تھی۔ دراصل

مغربی تعلیم نے اس کے اندر ایک خاص قسم کی منفرد و فاپیدا کردی تھی جس کا تعلق صرف روح سے تھا اسے جسمانی تعلقات کی رتی برابر بھی پروا نہ تھی کا نور کے درخت تلے بیسی سے میں ہمیشہ کے لیے منسلک ہوگا جیسے اسی کے جسم کا حصہ تھا اور وہ اپنے آپ کو میری تحویل میں دینے کے باوجود بالکل الگ تھلگ رہی۔۔۔۔۔ جیسے بنک کا ٹوکن۔۔۔ آپ کی مٹھی میں ضرور ہوتا ہے لیکن آپ کی ملکیت نہیں ہوتا۔

جب آفتاب کو اس کے جسم کی ضرورت نہ تھی تو اس کا جسم کوڑے کا ڈھیر تھا۔ اب اسے فکر نہ تھی کہ اس کوڑے کے ڈھیر پر کون اپنی غلاظت پھینکتا ہے اپنا جسم میرے سپرد کرنے سے کچھ لمحے پہلے وہ ملاتیرے میں شامل ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر یار سے بے دریا ہوگیا جیسی میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ میرا مقابلہ کر سکتی وہ مرنے سے بہت پہلے مرنے کا راز پاگئی تھی اسنے منہ سے ایک لفظ نہ کہا کھلی آنکھوں سے مجھے ایسے دیکھتی رہی جیسے میں موجود نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہونے کا راستہ نہ ہو تو دل تک جانے کے اور بھی کئی راستے ہو سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ دل صرف ایک راہ جاتی ہے اور وہ جسم کا راستہ نہیں ہے جسم کے جتنا شپرا انجن رک سکتا ہے۔ کوئلہ پانی درست کر سکتا ہے لیکن ہمیشہ جتنا شپرا کھڑا نہیں رہ سکتا، جسموں کے اتصال سے ایک نیا جسم ایک نئی روح جنم لے سکتی ہے لیکن ایک روح دوسری روح سے نہیں مل سکتی۔ بشرطیکہ ان کی رو میں پہلے ہی یک رنگی اختیار نہ کر چکی ہوں ویسی صورت میں یہ ملاپ بندوق کی لہلی کا کام دیتا ہے تراہ تراہ کی آواز بھی نکلتی ہے فار بھی چلتا ہے اور دوشکا کا ایک وقت میں مرتے ہیں روحوں کا اتصال پہلے نہ ہو چکا ہو تو جسمانی تعلق احساس گناہ بھی ہے۔۔۔۔۔ اور ہمہ شکستگی بھی۔

جب میں نے اس کا کف دوباری بند کیا تو وہ آنکھیں بند کیے چپ لیٹی تھی وہ نہ میرے ساتھ تھی نہ میرے مخالف۔ وہ کسی ایسے شرابی کی بیوی تھی جو ہزار مجبوریوں

کے باعث مدافعت کے قابل نہیں رہتی۔

یہ بھی عجیب رابطہ تھا۔ مردار کو گدھ ہڈیوں تک شفاف کر چکا تھا لیکن وہ اپنی بے عزتی کا نظارہ کرنے کے لیے موجود ہی نہ تھی وہ تو اس وقت کہیں اور تھی کسی اور کے ساتھ تھی یہ بھی اپنی نوعیت کا رابطہ تھا ادھر سے کوئی مدافعت نہ تھی سو مناتھ کا مندر کھلا پڑا تھا۔ صرف ارد گرد ایک بھی پجاری نہ تھا یہی قسم کی کوئی روح کو سوں میل تک موجود نہ تھی۔

جس وقت ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ ہم مکمل طور پر کھکھلے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہی کبھی میری نہ ہو سکے گی۔ وہ غالباً سمجھتی تھی کہ اپنے ساتھ میری لعنت لگا کر اس نے آفتاب سے بدلہ لے لیا ہے شاید وہ اپنے آپ کو ذلیل کر کے ہی اپنی ذات کو کچھ دیر کے لیے بچا سکتی تھی۔

رات کے پچھلے پہر کا چاند چڑھ کے درختوں میں قرص بن ٹنگا ہوا تھا
”چلیں؟۔۔۔۔“ یہی نے بالآخر پوچھا۔

”کہاں۔۔۔۔؟“

”ڈرونہیں میں وائی ڈبلیو سی اے جاؤں گی۔“

”میں نہیں ڈرتا کسی چیز سے۔“

”اگر میں تمہارے گھر جانا چاہوں تو۔۔۔۔“

”تو چلو ناں۔۔۔۔“ میں نے اس کا بازو گھسیٹ کر کہا۔

”نہیں قیوم میرا کوئی گھر نہیں ہے مجھے وائی ڈبلیو سی اے تک پہنچا دو۔ وہاں میری

ایک سہیلی رہتی ہے۔“

”اتنی رات گئے۔“

”وہ جانتی ہے میں پاگل ہوں Assignment لکھتے وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا

لیکن آج پروفیسر سہیل کو بتا سکتی ہوں دیوانے پن کی اصلی وجہ۔“

جس وقت ہم ٹک شاپ کے پچھواڑے پہنچے تو بیسی نے میرے بازو کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔

”قیوم۔“

”ہاں۔“

”موٹر سائیکل مٹ چلانا باغ میں۔ مال پر جا کر سٹارٹ کرنا۔“

”کیوں۔“

”اس وقت ہمیں کسی سپاہی نے دیکھ لیا تو تھانے لے جائے گا۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں ہے کوئی مجھے تھانے لے جائے کہ جہنم لے جائے لیکن تمہارا رزلٹ نکلنے والا ہے۔ پھر تمہیں نوکری چاہیے ہوگی۔“

”مجھے پروا نہیں۔“

”ہونی چاہیے ناں پروا۔ سپاہی نازیبا حرکتیں کرنے والوں کو تھانے لے جاتے ہیں گندے بچے۔ نقص امن ہے یہ بھی۔“

”وہ ہلکا سا مسکرائی۔ پہلی بار۔“

میں نے محسوس کیا یہ مسکراہٹ دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی میری محبت نے میری جسمانی وارفتگی نے اس کے وجود کو ذرا سا بھی ڈرائی کلین نہیں کیا تھا۔

وائی ڈبلیو سی اے سے میں باہر نکلا تو شہر پوری طرح سویا ہوا تھا۔۔۔ سینٹ انتھونی کے گرجے کی سیاہی مائل عمارت کے پیچھے چاند میری موٹر سائیکل کی رفتار کے ساتھ ساتھ سفید روسی کتے کی طرح بھاگتا چلا رہا تھا۔

دن کے وقت مال کی شکل کچھ اور ہوتی ہے لیکن اس وقت عمارتیں بہت گرائنڈیل سڑکیں کشادہ اور بتیاں بہت زیادہ روشن تھیں اکا دو کا کاریں آ جا رہی تھیں۔ پران کے رنگ اور رفتار کچھ اجنبی سے نظر پڑتے رہے۔۔۔ پوسٹ آفس کی گلابی عمارت

سے لیکر کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ تک سارا دن قریباً بائیں نک رہتا ہے لیکن رات گئے یہاں صرف بتیاں پلکیں کھولے کھڑی تھیں اور کسی کسی راہ گیر کو حیرانی سے تنک رہی تھیں جس وقت میں کرشن نگر سے نکل کر بوچڑ خانے کے پہلو میں بائیں ہاتھ کو مڑا تو مجھے دودھ کو بلوٹے لادے ہوئے ایک گوجر کے ریڑھ سے کر اس کیا۔ ابھی صبح کا ذب بھی نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ شہر کے بیدار ہونے میں اب تھوڑی ہی دیر ہے۔

ساری رات سیمی کے ساتھ کافور کے درخت تلے گزارنے کے بعد مجھے اپنا کمرہ، پرانی زندگی، رات سب کچھ غیر مرئی لگ رہا تھا جب آدمی کافی دیر تک جاگتا رہے اور نیند کو غالب نہ ہونے دے تو اس کے اعضا سست پڑ کر یا تو بہت ہلکے ہو جاتے ہیں اور یا بہت بھاری محسوس ہونے لگتے ہیں اس کے سر سے کچھ بوجھ سا اتر جاتا ہے۔۔۔ حقیقتوں کا بوجھ اور وہ جاگتے میں خواب تو نہیں دیکھتا لیکن اس کی نقل و حرکت کچھ Slow motion جیسی ہو جاتی ہے۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں شہ نشین پر بیٹھا بیٹھا اونگھ گیا ہوں لیکن آنکھ کھلی تو سامنے مختار بھائی کھڑے تھے ان کے سر پر پورا سورج چمک رہا تھا اور وہ تعجب سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

”یار ساری رات یہاں ہی بیٹھے رہے ہو؟۔۔۔۔“ انہوں نے اپنی عینک کے ڈبل شیشے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں میں تو بہت صبح یہاں آ کر بیٹھا تھا۔“

”موٹر سائیکل کہاں ہے۔“

”نیچے گلی میں۔“

میں عموماً جب کبھی ان کی موٹر سائیکل مستعار لیتا تو اسے آنکھیں کی اس بغلی گلی میں کھڑا کر دیتا۔۔۔۔ جس میں میرے کمرے کی اوپر آنے والی میڑھیاں کھلتی تھیں۔

”اچھا۔۔۔ تم پاس ہو گئے ہو۔۔۔ زلٹ آ گیا ہے۔۔۔ اخبار میں۔۔۔

۔۔

سیسی کے عشق میں فیل ہو کر مجھے پاس ہونے کی خبر عجیب سی لگی۔

”نیچے اپنی بھابھی سے اخبار لے لینا۔۔۔۔۔ مبارک ہو۔“

بھائی مختر رومال سے منہ پونچھتے ہوئے بیرونی سیڑھیوں سے باہر اتر گئے۔

جب رات میں گھر داخل ہوا تو مجھے پورا یقین تھا کہ اب میں سیسی سے کبھی نہیں ملوں گا۔۔۔۔۔ اس کے بہت قریب رہ کر مجھے علم ہو گیا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ لیکن ہمیشہ کی طرح سارا دن میں زلٹ کے بجائے اسی کے خیالوں میں الجھتا رہا۔۔۔۔۔ رہ رہ کر اس کی باتیں، بیٹھنے کا طریقہ اس کے بے طور بننے والے آنسو، آفتاب سے اس کی بے ساختہ اور وارفتہ محبت میرا محاصرہ کرتی رہی۔

جس وقت دھوپ ڈھلے میں وائی ڈبلیو سی اے کے سامنے پہنچا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں سیسی سے ملنے جا رہا ہوں زیادہ سے زیادہ میرا یہ ارادہ تھا کہ اپنی ایک ہم جماعت کو سوشیالوجی کا زلٹ سنا دوں گا۔ وہ بغیر پھانک والے بڑے ستون کے پاس کھڑی تھی میں نے مختار بھائی کا ہونڈا اس کے پاس روک۔۔۔۔۔ یوں لگتا تھا کہ ساری رات جا گئے کے بعد وہ دن بھر بھی نہیں ہوئی۔

”آگئے۔۔۔۔۔ مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے۔“

”کیسے؟“

”مریض کو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر آئے گا۔“

”تم کو اتنا کچھ کیسے معلوم ہوتا ہے سیسی۔“

اس نے آج اپنے امرو Pluck نہیں کیے تھے اور چھوٹے چھوٹے نئے بال

چیونٹیوں کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے۔

”ہوتا ہے معلوم۔۔۔۔۔ تعلق ہو تو سب کچھ پتہ لگ سکتا ہے۔۔۔۔۔ رزلٹ نکل آیا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ تم نے اخبار دیکھا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ رزلٹ نکل آیا ہے سوشیا لوجی کا۔۔۔۔۔ میں اخبار دیکھ کر کیا کرتی۔“

”میں پس ہو گیا ہوں۔“

”اچھا؟۔۔۔۔۔ مبارک۔“

صبح بھائی مختار نے دن چڑھے بھابھی صولت نے اور اب سیمی نے ایک سے لہجے میں مبارک دی تھی۔

ان تینوں کا تعلق ایک جیسا تھا۔

”کون سی ڈویشن؟“

”سیکنڈ۔“

”اچھا ہے۔۔۔۔۔ میں اور آفتاب تو یہ بھہ حاصل نہ کر سکے۔“

وہ چپ کھڑی تھی۔

آج پھر اس نے جنیز پر سفید وائل کا کرتی پہن رکھا تھا۔۔۔۔۔ لیس کی باڈس صاف نظر آرہی تھی۔۔۔۔۔ کٹے ہوئے بال اس نے تجاہل کے ساتھ ربر بینڈ سے باندھ رکھے تھے کندھے سے لٹکا ہوا کینوس کا تھیلہ اس کے گھٹنوں تک تھا۔ اور وہ اس وقت تھوڑی سی فقیری تھوڑی سی پپی تھوڑی سی فرانسیسی لڑکی نظر آرہی تھی۔

”چلیں؟۔۔۔۔۔ میں نے سوال کیا۔“

”چلو۔“

”کہاں؟“

”کسی ہوٹل میں۔“

”میری ابھی نوکری نہیں لگی۔۔۔۔ میں زیادہ پیسے نہیں خرچ سکتا۔“

”میری تنخواہ جو ہے۔۔۔ بل میں ادا کروں گی۔۔۔۔۔“ اس نے کیونس کے

تھیلے پر ہاتھ رکھ کر کہا

”پھر کسی روز سہی“

”تو پھر آج کہاں چلیں۔“ اس نے پوچھا۔

”وہیں؟۔“

”وہیں کہاں؟۔۔۔۔۔“ جیسے وہ رات کو، کانور کے درخت کو اور باقی سب کچھ

یکسر بھول چکی تھی۔

اب ہمارا معلول ہو گیا کہ ہم دونوں شام گئے جناح باغ چلے جاتے۔ اس خطے

میں جہاں جنات کا پہرہ تھا اور روہیں آدھی رات کو لائین لے کر پھرتی تھیں۔ یہاں

بیٹھ کر ہم آدھی آدھی رات تک کچھلی باتیں کرتے رہے۔ سیمی میرے متعلق کچھ جاننا

نہیں چاہتی تھی اس لیے میرے تمام دروازے بند رہتے۔ صرف وہ بولتی رہتی۔۔۔

۔ اپنی محرومی کی تمام باتیں ایک ایک کر کے مجھے بتاتی رہتی۔ اپنے بچپن کے

واقعات، آفتاب سے ملاقاتیں، آفتاب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے۔۔۔۔

باتیں وہی تھیں لیکن وہ تاپ کے پتے کچھ اس طرح پھینکتی کہ ہر بار ہم دونوں کے

ہاتھوں میں نئے پتے آ جاتے۔۔۔۔ میرے پاس اور کوئی چاری نہ تھا کہ میں ان ہی

باتوں کی سیڑھی لگا کر اس تک پہنچوں جب میں اس کے بہت قریب ہو جاتا اور اس

کی آستین کو رول کرنے لگتا تو وہ ہمیشہ آنکھیں بند کر لیتی۔۔۔۔۔ اس کے بعد وہ

آفتاب کی آغوش میں ہوتی۔

جسمانی تعلق کے عین تین سیکنڈ بعد وہ ہمیشہ آفتاب کا نام لے کر اٹھ بٹھکتی یہ نام

میری کنپٹی میں گولی کی طرح لگتا۔

”آفتاب تمہارا دوست تھا؟۔۔۔۔۔“ ایک رات اس نے مجھ سے سوال کیا۔

”بہت۔۔۔۔۔“ میں اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

میں اس وقت سیبی کو بتانا چاہتا تھا کہ مجھ جیسوں کا یہاں۔۔۔۔۔ وہاں کوئی دوست نہیں ہے ہماری کوئی محبوبہ نہیں ہوتی۔ ہم صرف لوگوں سے ملتے رہتے ہیں جیسے پائے کھانے والے آفتاب کی محبت میں کیسے بتلا ہو گئی۔ بھنڈی کے پھولوں جیسے زرد رنگ کی آڈری ہیر برن نے خدا جانے بھاری بھر کم شلوار قمیض پہننے والے پنجابی سی اونچی اونچی باتیں کرنے والے آفتاب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کیوں اختیار کیا؟

شاید آفتاب کی ساری کشش اس بات میں تھی کہ خدا نے اسے سرکش بنایا تھا نہ سرشار۔۔۔۔۔ وہ اونچے شملے والوں میں پیدا ہوا تھا لیکن گہنائے ہوئے لوگوں سے اسے کوئی نفرت نہ تھی۔ وہ کنول کے پھول کی طرح پانی اریکچر دونوں سے بنا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہر ماحول میں ہر انسان کے ساتھ بڑی جلدی ہم آہنگی اختیار کر لیتا۔

ایک روز وہ اپنا صابن تولیہ اور برش لے کر کمرے سے رخصت ہوا۔ لیکن چند لمحے بعد ہی واپس آ گیا میں اس وقت اٹھنے کی سوچ رہا تھا۔

”یار قوم۔۔۔۔۔ ٹیوب ہوگی۔۔۔۔۔ تو تھ پیسٹ۔“

میں نے الماری میں رکھی ٹیوب کی طرف اشارہ کیا اس نے ٹیوب سے لمبا سا سفید گل نکالا اور احتیاط سے اپنے برش پر جمالیا۔ کندھے پر تولیہ رکھے اس وقت وہ مجھے خدا خبر کیوں کسی پنجابی فلم کا ہیر و لگ رہا تھا میرا خیال تھا کہ اب وہ اتنی تیزی سے ہی لوٹ جائے گا جتنی جلدی وہ آیا تھا لیکن وہ دہلیز کے ساتھ کندھے جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔ کشمیری آدمی پتہ نہیں کیوں صبح سویرے ڈھیلا ہوتا ہے۔

”یا یہ ہماری چوکھٹ کو دیمک لگ گئی ہے۔۔۔۔۔ یہ دیکھو۔“

میں نے پلٹ کر چوکھٹ کی طرف دیکھا

”رپورٹ کرن ۽ چاہیے وارڈن صاحب کو۔“

”ہاں کرنی تو چاہیے“

وہ مسکرایا۔۔۔۔۔ ”لیکن کیا فائدہ؟ بڑے بڑے عالی شان قالین بودے

ہو جاتے ہیں یہ تو پھر لکڑی ہے دیمک نہ لگے گی تو ایسے اس کی بچ لائف ختم ہو جائے گی“

”آدمی اپنی احتیاط سے تھوڑی دیر کے لیے اس کے آگے بندھ باندھ سکتا ہے

سارے Biocess کو ختم نہیں کر سکتا“

”اچھا۔“

وہ کھڑا رہا چپ چاپ۔

”میں ہاسٹل چھوڑ رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

وہ تھوڑی دیر تک سر کھجلاتا رہا۔۔۔۔۔ پھر بولا۔۔۔۔۔ ”یا میرے خیال تھا کہ میں

پڑھ لکھ کر کوئی Job کروں گا۔ ایک بڑا انفرنوں گا۔ لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ

سب کچھ یہ Put on میرے لہو میں نہیں ہے۔ میرے باپ دادا قالین بیچتے آئے

ہیں کشمیری چائے پیتے رہے ہیں۔۔۔۔۔ کلچے کھاتے رہے ہیں۔ میں پتلون کوٹ اور

ٹائی پہن کر بہت اوپر اگلوں گا۔ اپنے آپ کو ٹکنکی پر لگا لوں گا گورے صاحب کی

طرح۔۔۔۔۔“

”کیا پڑھائی بھی چھوڑ دینے کا ارادہ ہے۔“

”ہاں کچھ ہی۔“

”کیوں؟“

”بھئی کچھ فرق نہیں پڑتا ہماری ٹریڈ میں۔“

میں چپ ہو گیا۔ اس کے چلے جانے سے تھوڑی سی امید بندھتی تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا۔

”عجیب بات ہے کچھ لوگوں کو محبت پائیدار کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے خاص کر لڑکیوں کو۔۔۔۔“ اس نے سر کھجلا کر کہا۔

وہ شاید سب سے کم نام لینا چاہتا تھا۔

”ایسے لوگوں کو وہم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ جوان رہیں گے۔ ہمیشہ محبت کر سکیں گے۔۔۔ ان لڑکیوں کے دماغ میں اس قدر بھوسہ کیوں بھرا ہوتا ہے۔“

”تو کیا آدمی کسی سے ہمیشہ محبت نہیں کر سکتا۔“

”کر سکتا ہے کر سکتا ہے لیکن ہر آدمی نہیں۔۔۔۔ ہم آج کل کی Generation تو بالکل بالکل نہیں۔ ہمیشہ کی محبت بڑا مشکل کام ہے۔“

”تھوڑا وقت تو رہ گیا ہے اگر امتحان دے دیتے تو کوئی خاص ہرج بھی نہ تھا۔“
”لندن والی برانچ کا مینیجر استعفا دے گیا ہے اب جی آفر دے رہے ہیں اگر میں سوچتا رہا تو پھر یہ جگہ پر ہو جائے گی۔“

اس وقت میرا خیال تھا کہ وہ سب سے کم نام لے جائے گا۔ جس روز کلاس میں یہ افواہ پھیلی کہ آفتاب نے نہ صرف کالج چھوڑ دیا ہے بلکہ وہ اپنی کزن سے شادی بھی کر رہا ہے تو مجھے بڑا تعجب اور سکون ہوا۔

”تم کیا سوچ رہے ہو قیوم۔“

”کچھ نہیں۔۔۔ کالج کی پرانی باتیں۔“

پھر اس نے میرا ہاتھ اٹھا کر لمبے سے لگایا۔ دبلے پن کی وجہ سے اس کی ہاتھوں پر کتنی ہی نیسں ابھری ہوئی تھیں اور تیسری انگلی میں فیروزے کی انگوٹھی آگے پیچھے ڈھلک رہی تھی۔

”اگر تم بھی نہ ہوتے تو تم بھی نہ ہوتے تو اس رات میں اس درخت تلے مر جاتی Joke نہیں خدا قسم مر جاتی۔۔۔۔۔ پھر دوسری صبح میرے مٹی ڈیڑی میری لاش شناخت کرنے تھانے آتے۔“

”یسی تم اپنے والدین کے پاس واپس کیوں نہیں چلی جاتیں۔“

”گلبرگ تھری میں۔۔۔۔۔ امریکی ہسپتال کی پشت پر۔“

”ہاں وہین۔“

”جیسے اس وقت میں اٹھا چاہتی ہوں لیکن اٹھ نہیں سکتی۔۔۔۔۔ اس طرح میں وہاں جانا چاہتی ہوں لیکن جانہیں سکتی۔“

”لیکن کیوں آخر کیوں؟“

وہ زار زار رونے لگی۔ اس کے رونے میں ایک ایسے چشمے کی آواز تھی جو پتھریلی جگہ سے سر پھوڑ کر گزر رہا ہو۔

”آؤ آفتاب کی باتیں کریں“ میں نے اسے دلا سہ دے کر کہا۔

یکدم وہ مکمل دلچسپی بن گئی۔

”وہ تمہارا دوست تھا ناں بتاؤ ناں؟ بتاؤ تمہیں اس سے محبت تھی؟ ضرور ہوگی۔

میں نے سنا ہے ہوسٹل میں لڑکے Homo sexual ہوتے ہیں۔ سچ بتانا۔ کیا تمہارا اس کا جسمانی تعلق تھا۔“

میں دنگ رہ گیا۔۔۔۔۔ بھنڈی کے زرد پھولوں جیسی رنگت پر اس وقت ہلکی ہلکی سرخی چھا رہی تھی۔۔۔۔۔ میں سوچنے لگا شاید مجھ سے جسمانی تعلقات استوار کرنے کی بھی یہی وجہ نہ ہو کہ اسے اپنے جسم کی پرانی بلکہ شاید میرے توسط سے اب بھی وہ آفتاب تک پہنچنا چاہتی ہو۔

میں چپ ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ بہت خطرناک پانیوں میں بغیر لائف سیونگ بلٹ کے تیر رہی تھی۔

”اچھا نہ سہی۔۔۔ تم مجھے اپنے متعلق کچھ باتان نہیں چاہتے میں نے تو تم سے کچھ نہیں چھپایا قیوم۔۔۔ اندر سے اندر سے اندر کی باتیں بھی تمہیں بتادی ہیں نہ بتانے والی بھی۔۔۔۔۔“

اس وقت میں نے سیمی کو جو کچھ بتایا وہ میری آپ بیتی تھی لیکن میں نے اپنی کہانی لمحہ بہ لمحہ جذبہ در جذبہ اور واقعہ در واقعہ آفتاب سے منسوب کر کے اسے سنائی۔ آفتاب کا نام میں نے اس لیے لیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میری کوئی بات وہ غور سے نہیں سنے گی اس کا کٹ آؤٹ کام آئے گا اور بجلی کا کرنٹ اس کے دل تک نہ پہنچ سکے گا۔ میں نے بتایا ذرہ ذرہ احوال۔۔۔۔۔ جب پہلی بار وہ کلاس میں آئی تھی۔ اس نے کس سے پہلے بات کی تھی اور وہ کب رخصت ہو گئی۔ میں نے اسے وہ سارے خط سنائے جو میں لکھتا رہا لیکن پوسٹ نہ کر سکا۔ میں نے وہ تمام واقعات بیان کیے جب میں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے مل نہ سکا۔ اپنی ڈائری کے صفحات بیان کرنے میں آسمان کا رنگ پرانی چاندی جیسا ہو گیا اور مجھے شبہ ہوا کہ دن چڑھنے والا ہے۔

”لیکن یہ ساری باتیں تو مجھے آفتاب نے کبھی نہیں بتائیں۔“
 ”وہ جذبات کے اظہار میں گونگا آدمی تھا۔۔۔۔۔ ایسے آدمی کچھ نہیں بتایا کرتے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ ہم دونوں تو گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔۔۔۔۔ تمہیں بھی تو اس نے سب کچھ بتایا۔۔۔۔۔ اتنی ساری حرمیوں کی مجھ سے تو کبھی اس نے شکایت نہیں کی۔ مجھے تو معلوم نہیں کہ وہ مجھے خط لکھتا تھا بغیر پوسٹ کیے۔“

میں اندر ہی اندر ہنسا اور بولا۔۔۔۔۔ میرا تو دوست تھا سیمی۔۔۔۔۔ دوست۔۔۔۔۔
 ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

”آہ ان باتوں کا فائدہ۔۔۔۔۔ اور ان سے حاصل۔۔۔۔۔؟ شاپنگ گم

ہو جائے تو رسیدوں سے فائدہ؟“

میں نے بازو پھیلا کر اسے اپنے وجود کے ساتھ لپٹا لیا۔ راجہ گدھ کو ایسے لمحوں کا بہت انتظار رہتا ہے جب کوئی شخص دنیا کو بے فائدہ سمجھ کر اس سے منہ موڑنے کی کوشش کرے، اس نے اپنے اعضاء ڈھیلے چھوڑ دیے جیسے طوفان کے بعد ٹوٹی ہوئی کشتی اپنے تختے ساکت پانیوں پر چھوڑ دیتی ہے اس گلدستے میں میرے لیے ان گنت کانٹے تھے۔ لیکن ان کانٹوں کے باوجود میں اسے سینے سے لگانے پر مجبور تھا۔

”سیسی۔۔۔۔۔ محبت کی فریم میں کبھی کبھی تصویر بدلنا پڑتی ہے۔“

اس نے آنکھ کی جھری سے دیکھا وہ اس قدر میرے ساتھ نہیں تھی۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں فیروزی مائل سیاہ آئی شیڈ والے پوٹوں کے نیچے ان آنکھوں میں آفتاب کی شکل گھوم پھر رہی تھی۔

”جانے دو۔۔۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔۔۔ میں ان تصورات سے ختم ہو جاؤں گی“

”کیسے تصورات سیسی؟۔۔۔۔۔ کیسے؟“

”وہ دونوں۔۔۔۔۔ ایک ڈبل بیڈ پر ہیں۔ وہ میرا آفتاب۔۔۔۔۔ میرا سے چوم رہا ہے زیبا کو۔۔۔۔۔ تم نہیں سمجھ سکتے قیوم۔۔۔۔۔ یہ تصورات مجھے ختم کر دیں گے۔ پتہ نہیں سارا سارا دن مجھے کیا کچھ نظر آتا رہتا ہے۔“

میں نے غفلی سے کہا۔۔۔۔۔ ”ہم بھی تو ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں سیسی۔“

اس نے ندامت سے سر جھکا لیا اور لجاجت سے بولی۔۔۔۔۔ ”یہ اور بات ہے قیوم۔۔۔۔۔ اسے اپنی زیبا سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ وہ بے وفا ہے۔۔۔۔۔ بے وفا۔۔۔۔۔ اتنی جلدی میرے بعد اسے محبت ہو گئی۔۔۔۔۔ وہ زیبا کے لیے سر ڈھڑکی بازی لگا دے گا۔۔۔۔۔ ہمیں کوئی محبت تھوڑی ہے؟۔۔۔۔۔ ہیں قیوم۔۔۔۔۔؟“

میں چپ رہا۔

جہاں تک سیمی کا تعلق تھا وہ مجھے چومتی ضرور تھی لیکن اسے مجھ سے محبت نہ تھی، کم از کم یہاں تک وہ سچی تھی۔

سیمی با وفا کیونکہ وہ صرف احساس تشکر میں آ کر قیوم کے وجود کو برداشت کرتی تھی۔۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔ میں ان دونوں کے درمیان کیا تھا؟۔۔۔۔۔ میں اپنے آپ کو کس طبقے کس کلاس کس گریڈ میں رکھتا؟۔۔۔۔۔ شاید کر گس جاری کے لوگوں کی کوئی Catagory نہیں ہوتی وہ تو محض لائین ہوتے ہیں نہ دائرہ نہ چوکور نہ مستطیل۔۔۔۔۔ محض لائین۔۔۔۔۔ جو ان دائروں کی مستطیلوں کی سرحدیں متعین کرتی ہے۔

اس وقت سفید چادر میں ملبوس نوٹ کا ایک آڈمی مشعل لیے سامنے ایک جھاڑی سے اُکلا اس کے سر پر کوئی بال نہ تھے اور وہ دائرے میں چلتا تھا اس نے تین مرتبہ اپنی مشعل اونچی کی اور پھر واپس جھاڑی میں گھس گیا۔۔۔۔۔ اس وقت پتہ نہیں کیوں میرے اندر ایک گہرا گیان پیدا ہوا۔ جیسے استخارہ کر لینے کے بعد گوگوں کی حالت ختم ہو جاتی ہے میرے اندر آفتاب نے گھس کر دو چار ہاتھ کراٹے کے مارے اور قیوم کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد میرے اندر آفتاب ایسے بھرتا گیا جیسے بوتل میں پانی۔۔۔۔۔ سر کی اخروٹی ہڈی سے لے کر پیروں کی پیچیدہ ہڈیوں تک آفتاب بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس آفتاب کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔۔۔۔۔ جس وقت وہ چاہتا چلا جاتا اور قیوم سنڈ ٹو ہو جاتا۔ جس وقت وہ آتا قیوم خود ہی ڈرائیور کی سیٹ چھوڑ کر کچھلی نشست پر جا بیٹھتا۔

اس رات کے بعد مشعل والے جن کو کھلی آنکھوں دیکھا اور آفتاب اور قیوم کی ادلی بدلی سے لطف اٹھانا میرا محبوب مشغلہ بن گیا۔۔۔۔۔ اس وقت کو سیمی جانتی تھی۔۔۔۔۔ پہلے میں نے قیوم بن کر اس کے دل میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔۔ لیکن وہ یلغار بے سود تھی۔ اب میں نے آفتاب بن کر بھیں بدل کر اس پر بخون مارا

اور اس کی ایک ایک بوٹی اتار لی۔۔۔۔ میں نے اس کی اداسیوں کو چوم چوم کر اس کے وجود سے اکھیرنا چاہا۔ لیکن جو بیمار عشق ہوتے ہیں ان بہت اس انٹی بائیونک کا اثر نہیں ہوتا۔۔۔۔ ان کی اداسی کوئی پوشیدہ پینٹ نہیں جسے کھرچ کر نئے پینٹ کی تہہ جمادی جائے۔۔۔۔ جوں جوں میں اسے چومتا۔ وہ ہر ہر اداسی کے ساتھ اپنے وجود کی ایک ایک اینٹ بھی اتار پھینکتی جاتی حتیٰ کہ صبح کے قریب وہ صرف ملبہ رہ جاتا۔ پرانی اینٹوں کا تتر بتر ملبہ۔

عموماً محبت میں ناکامی کے بعد لوگ اپنی ہی نفی اور اپنی ذات کی تذلیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ جب بند پستی سے برآمد ہونے والے آبدار موتی کو اصل خریدار نہیں ملتا۔۔۔۔ تو پھر موتی اپنا آپ ریت کے حوالے کر دیتا ہے یہاں لہروں کے ساتھ رننے کے علاوہ اس کی اور کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ناکام عاشقوں کو جسم پر جملہ حقوق محفوظ لکھوانے کی حاجت نہیں رہتی۔۔۔۔ وہ ہر کس ناکس کے ہو کر کسی کے نہیں رہتے۔۔۔۔ رفتہ رفتہ اپنے جسم کی تذلیل میں انہیں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔۔۔۔ زندگی کا ہر وہ رنگ جو انہیں اپنے آپ پر ہنسنے کا موقع دے انہیں دل سے مرغوب ہو جاتا ہے۔ شراب عورت جو اے کئی ذلتوں کی پریس سے مرد نکلتا ہے۔

محبت میں ناکام ہو کر عموماً عورت کے دل سے جسم کی حرمت عصمت اور عزت کو تصور جاتا رہتا ہے۔

کئی باریسی جیسی ماڈرن لڑکی کو علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اوپر لعنت بھیج رہی ہے۔

لیکن آہستہ آہستہ دھنستی وہ بھی چلی ہی جاتی ہے۔

سیبی کو بھی معلوم نہ ہو سکا۔۔۔۔ کہ وہ میری دشتہ بن گئی ہے۔

اور میں بھی پوری طرح سمجھ نہ سکا کہ میں ہی اس کے کفن کا آخری کیل ہوں۔

میں کوٹھے کے فرش پر دری بچھائے پڑا تھا کہ بھائی کے دونوں لڑکے اوپر آئے
ان کی نیکریں اور قمیضیں ایک سی تھیں۔ شاید تو ام بھائی تھے۔ کیونکہ ان کی شکلیں
عادتیں، کپڑے بول چال سب ایک طرح کا تھا۔ وہ تخت پوش سے ایک ہی سائل
میں چھلانگ لگاتے تھے

”آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔“

پتہ نہیں کیوں بھابھی صولت۔۔۔۔۔ بہت کم کوٹھے پر آتی تھیں؟
”کیا کام ہے۔“

”پتہ نہیں۔۔۔۔۔“ بڑے بھائی نے کہا۔

”پتہ نہیں۔۔۔۔۔“ چھوٹے بھائی نے نقل کی۔

”ادھر آؤ مسعود۔۔۔۔۔“ میں نے محبت سے کہا۔

”ہم جا رہے ہیں۔۔۔۔۔“ مسعود بولا۔

”ہم جا رہے ہیں۔۔۔۔۔“ فرید نے بھی کہا۔

وہ دونوں باغ والے نوگزے کی طرح زن سے غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے
بعد سفید طباق چہرے پہ چھائیوں کی تتلیاں سجائے بھابھی صولت آئیں۔ یہ عورت
اس قدر سنجیدہ نہ ہوتی تو مزے دار ہو سکتی تھی۔

”قیوم۔“

”میں آ رہا تھا جی۔۔۔۔۔ وہ ذرا۔۔۔۔۔“

”کوئی بات نہیں۔“

”بیٹھے بھابھی۔“

بھابھی صولت کھڑی رہیں

”تم جانتے ہو۔ اباجی کی زمینوں سے اب کچھ نہیں ملتا۔۔۔ مختار صاحب مجھے یہ

اخبار دے گئے ہیں اس میں جو نوکری ہے اس کے لیے عرضی دے دو آج ہی۔“
 ”آپ۔۔۔ آپ چاہتی ہیں۔۔۔ میں یہاں سے چلا جاؤں۔۔۔“ میں
 نے سوال کیا۔

”ہے نا پاگل۔۔۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اب تم بے کار نہ رہو، نوکری کر
 لو۔۔۔“

میرے سامنے اخبار رکھ کر بھابھی صولت چپ چاپ نیچے چلی گئی۔
 اخبار میں ریڈیو سٹیشن کی طرف سے پروڈیوسر کی آسامی کا اعلان چھپا تھا۔۔۔۔
 اس نوکری کے لیے میری تعلیمی سند کافی تھی لیکن پتہ نہیں یہ دن اور راتیں کیسے گزر
 رہی تھیں۔ میں کہیں پارٹ ٹائم نوکری تو کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کسی مستقل نوکری کے
 لیے ابھی ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔

رات گئے تک میں کوٹھے کے بیرونی صحن میں ٹہلتا رہتا۔۔۔ چاند رات میں گھر
 کی چھت سے لگ کر جب چاند مجھے دیکھتا تو طے کرتے میں میرا سایہ گدھ کی طرح
 نظر آتا۔ میری انگلیاں ہونٹ دانت سب مسلسل سگریٹ نوشی کے باعث براؤن
 ہو چکے تھے۔ میں نے ان لمبی راتوں میں سیمی سے لے کر Abiogenesis ایک ہر
 مسئلے پر دماغ کو کھپایا تھا ان سوچوں کی وجہ سے میرے وجود کی حالت بھوے سے
 بھرے ہوئے مراد چیتے جیسی ہو جاتی۔۔۔ جسے دیکھ کر بچے ڈرتے ہیں اور جو بالکل
 بے ضرر ہوا کرتا ہے۔

بھائی مختار اور ان کا گھرانہ بڑے سکھی لوگ تھے۔

بھائی مختار اپنے گھریبوی اور بچوں سے پیار کرتے تھے۔ انہیں اپنی ساری ملکیت
 سے پیار تھا۔ متوسط عقل، متوسط اخلاقی قدریں دیموکریسی کی پرستش اور سرمائے دار
 نظام کی برکتوں کے سہارے ان کا گزارہ چلنا تھا۔۔۔ بھائی مختار کی ساری منزلین
 مادی تھیں۔۔۔ وہ ساندھے سے گلبرگ تک پہنچنا چاہتے تھے۔۔۔ ان کے

وہ چپ رہتی جیسے اندر ہی اندر اس نے کوئی پروگرام بنا رکھا تھا لیکن وہ اسے مجھے بتانا نہ چاہتی تھی۔

ایک روز میں نے بہت عملی بن کر کہا۔۔۔۔۔ ”آج کے اخبار میں ایئر ہوسٹس کا Job نکلا ہے تم اس کے لیے اپلائی کیوں نہیں کر دیتیں؟“

وہ مسکراتی پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔۔۔۔۔ ”اچھا Ideal ہے۔“

”سچ سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں تمہارا فکر بھی اچھا ہے انگریزی خوب بولتی ہو تمہیں بہت جلد Select کر لیا جائے گا۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہتی گئی۔۔۔۔۔ ”پھر میں فارن فلائیٹ پر لگ جاؤں گی۔۔۔۔۔ کراچی بیروت لندن۔۔۔۔۔ لندن فرانک فرٹ تہران کراچی۔“

پھر کسی روز آفتاب میرے طیارے میں چڑھے گا اپنے چھوٹے سے بیٹے کی انگلی پکڑ کر۔۔۔۔۔ اسکی زیبا کے ہاتھ میں وینٹی بکس ہوگا۔۔۔۔۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ سیٹوں پر بیٹھیں گے اور میں ان کے سامنے ناشتے کی ٹوے لگاؤں گا۔۔۔۔۔ کافی کی پیالی بنا کر دوں گی۔ آفتاب مجھ سے کہے گا ذرا اس ہفتے کا ٹائم تو پکڑا دیجے۔۔۔۔۔ میں جب اسے ٹائم پکڑانے کے لیے بڑھاؤں گی تو اس کی بیوی پہلے رسالہ مجھ سے پکڑے گی اور کہے گی دیکھئے ہمارے نوئی کو ذرا با تھ روم لے جائیے۔

”چپ کرو یہ بکواس۔“

”اور جب میں نوئی کو با تھ روم میں لے جاؤں گی تو وہ مجھے کہے گا آپ مجھے چوم کیوں رہی ہیں مس۔“

”تم اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے کیا کچھ سوچتی رہتی ہو۔“

وہ بولتی چلی گئی۔۔۔۔۔ ”اور جب میں نوئی کی نیکر کے بٹن بند کر کے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کو لون سے بھیگے ہوئے ٹیشو سے پونچھوں گی تو وہ پوچھے گا مس آپ رو کیوں رہی ہیں۔۔۔۔۔ بتائیں نا کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”خدا کے لیے یہ۔۔۔۔۔ باتیں چھوڑ دو“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے مجھے ایئر پوسٹس لگنا چاہیے یہی میری سزا ہے یہی یہی یہی۔“

میں اپنے مشورے پر عجیب طرح سے شرمندہ ہو گیا
دراصل آفتاب سے پچھڑے کریمسی کشش ثقل سے آزاد ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ لیکن
کشش ثقل سے آزاد ہونے اور آزاد رہنے کے بعد جو بے سمتی پیدا ہوتی ہے اس
سلسلے میں اسے کوئی ٹریننگ نہ دی گئی تھی فلا بازوں کو فضائی سفر میں جہاں اور بہت سی
تر بیت دی جاتی ہے وہاں دو طرح کی ٹریننگ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جب وہ
فضا سے نکل کر خلا میں جاتے ہیں اس وقت جسم کا اندرونی پریشر تو رہتا ہے لیکن اس
کا کاؤنٹر بیلنس کرنے کے لیے بیرونی دباؤ نہیں رہتا ایسے میں تمام شریانوں کے
پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اندر اور باہر کے پریشر برابر رکھنے کے لیے خاص قسم
کے Space Suit بنائے جاتے ہیں اور ان کے استعمال کا طریقہ سکھایا جاتا ہے
دوسرا مسئلہ کشش ثقل سے آزاد ہو کر بے سمت وقت گزارنے کی ٹریننگ ہوتی ہے اس
کی ٹریننگ کے لیے خلا بازوں کو ایک Capsule میں بند کر کے چھوٹی چھوٹی
ڈھیریاں کنے روٹی کھانے خلائی جہاز میں آنے جانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے

سمی کے اندر پریشر بہت بڑھا ہوا تھا

سمی کشش ثقل سے آزاد ہو چکی تھی۔

لیکن بے سمت زندگی گزارنے کی ابھی تک اسے کوئی ٹریننگ نہیں ملی تھی۔

وہ گویا ان دنوں مورفیا تلے سانس لے رہی تھی۔ جہاں بیٹھ جاتی پہروں بیٹھی رہتی
کہیں جب اس کی نظر جم جاتی تو پھر چینی گڑیا کی طرح اسی طرف دیکھ جاتی
ایسے میں آفتاب کے نام کے علاوہ اور کوئی ٹیکہ کارگر نہ ہوتا۔ اس خلائی دور سے کئی
کیفیتیں وابستہ ہوتیں۔ خود ترسی، بیزاری، تنہائی پسندی، مردم گزیدہ محرومی۔۔۔۔۔

جس وقت میں ریگل کے چوک میں بس پر سے اتر تو مجھے معلوم تھا کہ سیمی مجھے آج وائی ڈبلیوسی اے میں نہیں ملے گی۔ اس کے باوجود میں آہستہ آہستہ اس کے ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ دھوپ میں اب حدت نہ رہی تھی اور سینٹ انتھونی سکول سے ملحق گرجا آج سورج کی کرنوں میں دھلا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک فادر سیاہ چغے میں ملبوس گرجے کے مرکزی پھانک کو کھول کر اندر چلا گیا گرجے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور میں سوچتا رہ گیا کہ اندر جانے والا کون تھا۔۔۔؟ دیسی عیسائی۔۔۔ امریکی فادر۔۔۔ یا ڈچ برادر۔۔۔؟ لوگ اپنے دیس کو چھوڑ کر کیوں پردیس میں جا بیٹھتے ہیں۔۔۔؟ پردیس میں کیا چیز انہیں باندھے رکھتی ہے۔۔۔؟ عقیدہ؟۔۔۔۔۔ محبت؟۔۔۔۔۔ عمارت۔۔۔۔۔ یا انا؟

اس مختصر سڑک کے اختتام پر پٹرول پمپ کے پاس میں بائیں مڑ گیا۔ لیکن پٹرول پمپ سے شارٹ کٹ کرنے سے پہلے میں نے پلازا سینما کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس قسمیں چاہتا تو سیدھا جناح باغ جناح جا سکتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا شاید سیمی ابھی وائی ڈبلیوسی اے میں موجود ہو پلازا سینما میں ابھی ساڑھے تین بجے کا شو ٹوٹا تھا۔ فری مین کی بلڈنگ سے لے کر پٹرول پمپ والے چوراہے تک کاریں۔ رکشا سائیکلیں پیدل سب بڑی افراتفری کے ساتھ جلدی گزر جانے کی آرزو میں ٹریفک کے لیے اڑچنین پیدا کر رہے تھے۔

میں نے ساری بھیڑ کی طرف نگاہ دوڑائی اور جی میں سوچا۔۔۔۔۔ اس ساری خلقت کو علم نہیں کہ وائی ڈبلیوسی اے میں ایک دہلی پتلی لڑکی۔۔۔۔۔ ایک ماڈرن لڑکی اپنے آپ پر تیل چھڑک کر مرنے کے لیے تیار کھڑی ہے ہم شہر والے ایک دوسرے سے کتنے بے خبر تھے۔ پٹرول پمپ کے سامنے بڑے سائن بورڈ پر ایک پنجابی فلم کا اشتہار لگا تھا۔ ہیروین کی آنکھیں حیران کن حد تک سیمی جیسی تھیں۔ آفتاب کا نام سنتے ہی جیسی کیفیت سیمی کی ہوتی ویسی ہی سائن بورڈ والی لڑکی کی

آنکھوں سے عیاں تھی میں نے ہاتھ ہلا کر فلم والی کو خدا حافظ کہا اور وائی ڈبلیو سی اے چلا گیا۔

یہ ہوشل بھی چمگا ڈروں کی آماجگاہ تھی۔

اس ہوشل سے لے کر فاطمہ جناح تک آزاد عورتیں اور لڑکیوں کا ٹریننگ کمپ تھا گھروں سے بیزار، روزگار کی تلاش میں پریشان، ڈاکٹر بننے اور مستقبل سنوارنے کی آرزو میں بے قرار، عاشقوں سے رنجیدہ، شوہروں کی تلاش پر مصر، گھر رہتی تھیں رات کے پچھلے پہر جب کبھی میں یہاں سے گزرا ہوں مجھے فاطمہ جناح کالج سے لے کر وائی ڈبلیو سی اے کے ہوشل تک اور حضرت یقوب زنجانی کے مزار تک آہوں کا ایک مرغولہ اس رقبے پر معلق نظر آیا خاموشی ہوتی تو ہلکی ہلکی سرگوشیاں اور آہیں بھی سنائی دیتی ہیں جیسے ایک ساتھ کئی چوٹھڑے ہوئے پانیوں میں ہولے سے اتریں۔ ڈاکٹری سیکھنے والیاں چوک کے اس پار رہتی ہیں ٹائپ کی کلاسوں میں حاضر باش رہنے والیوں سے کئی بار میرا ٹاکرا ہوا وائی ڈبلیو سی اے میں پلازہ سینما کے شو کے ساتھ ساتھ یہاں بھی کلاس لٹا کرتی تھی۔۔۔۔۔ سب خوش لگتی تھیں۔۔۔۔۔ سب کی سب خوش فہمیوں میں مبتلا تھیں۔۔۔۔۔ شام کے باوجود اکثریت کے چہرے پر سیاہ چشمے ہوتے جو سائیکلوں پر تھیں وہ اپنے آپ کو زیادہ ماڈرن سمجھ رہی تھیں۔ جو پیدل تھیں وہ اپنے آپ کو زیادہ باجیا سمجھنے پر مجبور تھیں۔۔۔۔۔ لیکن سب کے چہرے پر کسی نہ کسی طرح کی Disillusionment ہلکی سی گرد۔۔۔۔۔ ازالہ سحر کی عدم میلان طبعیت۔۔۔۔۔ کی۔۔۔۔۔ ہلکی سی میک اپ کی تہہ۔۔۔۔۔

یہ تمام عورتیں لڑکیاں کسی نہ کسی طرح مردوں کے نارمل نیوکلس سے کٹی ہوئی تھیں ہو کستا ہے ان میں سے بیشتر عورتوں کو مردوں کا قرب زیادہ ملتا ہو، لیکن معاشرے کے رسمی طریقے کے مطابق وہ Carrier گر لڑتھیں۔ ایسی مینڈکیاں جن کو ہا کا ہا کا زکام ہو چکا تھا وہ اعلانیہ سگریٹ پیتی تھیں ماسپیوٹ کی طرح گھروں میں پیسے بھیجتی

اگر سبھی مر گئی میں نے پہلی بار سوچا تو کیا میرے علاوہ کوئی جان سکے گا کہ اسے کیا بیماری تھی۔۔۔۔؟ میرے پاس تو نہ کوئی ہمایوں تھا نہ اودھ بیچ نہ ادبی دنیا۔ پھر میں تو اس کے لیے اپنے عہد والوں تک بھی کوئی داستان چھوڑ کر نہ جاسکوں گا اپنے عہد میں بھی اس کے عشق کی داستان فلک پیانہ ہو سکے گی۔۔۔۔۔ یہ بھہ کیسا الیمہ تھا؟

باغ بہت رونق تھی۔ منگمری ہال پر شام کی آخری روشنی پڑ رہی تھی۔ بار بار کہیں سے پاؤں بیچنے والے کی آواز باغ کی خاموشی پر گرتی اور برف کی طرح چکنا چور کر دیتی تھی۔ لذت کا باغوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جب گھروں کی گھٹن بہت بڑھ جاتی ہے جب مرد کسی عورت سے بند کمر میں مل نہیں سکتا یا ملنا چاہتا تو پھر وہ باغوں کا رخ کرتا ہے باغوں میں انتظار، وصل، بھوک اور نیوگ کے بونے جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھے ملتے ہیں درخت پودے گھاس پھول سب ان عنصر تئوں کی کھیلوں میں بار بار کے شریک رہتے ہیں اسی لیے باغوں کی خوشبو میں ایک سحر ہوتا ہے یہاں کئی کہانیاں ایک ساتھ بولتی ہیں جیسے ستاروں کے اوپر والے تار مضرب سے چھیڑو تو تر ہیں آپنی آپ بول اٹھتی ہیں۔

میں نے سارے میں تلاش کیا لیکن سبھی کہیں جہیں تھی۔۔۔۔۔ میں نے تیسرا سگریٹ سلگایا اور کانور کے درخت تلے بیٹھ گیا۔ لوگ شاید اپنے گم شدہ وجود، اپنی سائیکی آزادی اور جلی آرزوؤں کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ کیونکہ آک خلاف معمول سڑکوں پر بہت جھوم تھا لوگ کس خوشی سے باغوں کا رخ کرتے ہیں اور کتنی جلدی کیسی مایوسی کے ساتھ لوٹ جاتے ہیں شاید مصنوعی باغوں میں باڑھوں سے، فواروں میں، بنجوں پر، کیاریوں سے کینے کی میز کرسیوں کے اوپر نیچے باغ میں پھیلی پکی سڑکوں سے مہذب چہری زندگی کا بلاوا اتار رہا ہے ہمارے اندر کارڈیواس آواز کو ہوا سے پکڑتا رہتا ہے ایسے میں سیر کرنے والے دوستوں میں گھسٹتے ہیں۔ فطرت سے رشتہ بحال کرنے والے بادل، درخت پھول ہریا دل، پرندو سب اسے جنگلوں

کی طرف کھینچتے ہیں اور مصنوعی فوارے، سڑکیں، کیفے، موزیک، کی پتھریلی بنجیں، اسے تہذیب کلچر اور شہر کی طرف موڑتی ہیں اسی کشمکش میں کئی بار اندر سے انسان بد کے ہوئے گھوڑے کی طرف الف ہو جاتا ہے لیکن چھوٹ نہیں سکتا۔

باغوں کی سائیکی بہت اداس ہوتی ہے رکے ہوئے آنسو بند خیالات، جمہ ہوتی آہیں۔۔۔ قدرتی اداسی پولن کی طرح جھڑتی ہے اسی لیے کسی عہد کسی قوم کسی چہر کی سائیکی کو سمجھنے کے لیے اس کے باغوں میں بیٹھنا بہر ضرور ہے۔

جس وقت رات گئے تیزی آئی تو مجھے پچا نے بغیر میرے پاس سے گزر گئی۔۔۔۔ میں نے سگریٹ کی خالی ڈبیا درخت تلے پھینکی اور اس کے تعاقب میں چلنے لگا۔ حالانکہ میں اس سے صرف دو قدم پیچھے تھا۔ لیکن میں نے اسے آواز نہ دی۔ بابا ترت مراد کے مزار کے پاس جا کر وہ اچانک رک گئی اس نے جوتیاں اتاریں۔ سر پر ایک پھول دار رومال باندھا اور مزار کی دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ بڑی دیر تک وہ وہاں ایک ٹرسٹ کی طرح کھڑی قوالی سنتی رہی۔ پھر سر سے پھول دار ریشمی والا چشمہ اتار کر اور لکڑی کی ہیل والی جوتیاں پہن لیں میں نے اسے بلانا چاہا لیکن کوئی شے مجھے بھی مانع رکھ رہی تھی۔

وہ بگری کو اپنی کدھب جوتیوں سے کوٹتی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ پھر اس نے رک کر دیہاتی لوگوں کی طرح ہاتھ سے ناک صاف کیا تو میں نے آگے بڑھ کر اسے رومال پیش کر دیا۔

”تم کب آئے قیوم؟“

”میں تمہارے ساتھ ساتھ تھا۔“

”کب سے۔“

”کافی دیر سے“

”پھر بھی؟۔۔۔ تم مجھے نظر کیوں نہیں آئے“

”کیونکہ نظر لانے اور نظر نہ آنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی۔“

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ لب خشک تھے اور میک اپ کی ہلکی تہہ کے باوجود وہ تمام تر بے رونق تھی۔

”تم کو معلوم ہے مجھے لگتا ہے آج کل میں زلزلہ آئے گا اور میں۔“
”کیوں؟“

”بس لگتا ہے بڑی دیر ہو گئی زلزلہ آئے۔“

”زلزلے کی یہ کوئی خاص وجہ نہیں۔“

وہ کان فور کے درخت کے پاس پہنچ کر عادیٹا گراؤنڈ میں اتر گئی۔

”کیا یہی اچھا ہوا اگر اس بار زلزلے میں گورنمنٹ کالج کا ٹاؤر گر جائے۔“

”کیوں کیوں۔۔۔۔۔ کیوں۔“

”ہائے کچھ تو گر جائے اس سال کرسمس سے پہلے پہلے۔“

”کرسمس کی کیا شرط ہے سیمی۔“

”پچھلے کرسمس کو میں آخری بار آفتاب سے ملی تھی۔۔۔۔۔ قائد اعظم کی سالگرہ

والے دن اس سال بھی کچھ ہونا چاہیئے بخدا۔۔۔۔۔ اور کچھ نہیں تو گورنمنٹ کالج کا

ٹاؤر ہی گر جائے۔“

”یا بخاری آڈیو ٹوریم۔۔۔۔۔ میں آگ لگ جائے۔“

”ہاں کچھ تو ہو۔۔۔۔۔ کچھ تو ہو پرانی یادوں کی یاد تازہ کرنے کو۔“

بڑی دیر تک ہم سومر تہہ دوہرائی ہوئی باتیں از سر نو یاد کرتے رہے آفتاب کا

پوسٹ مارٹم ہوا۔ لیکن آج اس پر حسد غالب تھا۔ اس کا لب و لہجہ زہریلا اور باتیں

کڑوی تھیں۔ حسد کی گیس پیلے رنگ کی ایسی مسموم گیس ہے جس میں کاربن مونو

آکسائیڈ کی تمام خوبیاں موجود ہیں جہاں یہ موجود ہوا انسانی پھیپھڑے متاثر ہوئے

بغیر نہیں رہ سکتے۔ پچھلی ملاقات سے اب تک اس گیس کے اثر تلے وہ بہت بدل گئی

تھی۔ ماتھے پر سوچوں کی وجہ سے ایک نس ابھری ہوئی تھی۔ لہجے میں قطعیت اور لب ٹیڑھے تھے ہاتھوں میں ہلکا ہلکا پسینہ تھا جیسے وہ نوکری کا انرویو دینے آئی بیٹھی ہو۔
 ”یہ مجھے ہوا کیا ہے۔۔۔ میں تو کبھی حسد سے آشنا نہ تھی۔۔۔ بتاؤ قیوم کیا ہوا ہے؟ اب مجھے آفتاب کا خیال کیوں نہیں آتا۔۔۔ میں سارا دن زیبا کے متعلق کیوں سوچتی رہتی ہوں۔۔۔ ایک بات بتاؤں“
 ”کہو۔“

”زیبا حاملہ ہے۔“
 ”تمہیں کیسے پتہ چلا۔“
 ”بس مجھے پتہ چل جاتا ہے۔۔۔ پہلے ہی۔۔۔ مجھے ہوتا ہے ناں پتہ۔۔۔ وہ آج کل سونف کھاتی ہے سارا دن۔۔۔ ہتھیلی پر لیے پھرتی ہے سونف۔“
 ”چپ کرو۔“
 ”مجھے نظر آتی ہے زیبا۔۔۔ میں اسے دیکھ سکتی ہوں پانچ مہینے کی Pregnancy کے ساتھ۔“

”لیکن تم نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔“
 ”دیکھا ہے دیکھا۔۔۔ ہے میں تو اسے فوراً پہچان لوں لاکھوں میں۔“
 وہ چپ چاپ ہاتھ مروڑنے لگی۔

سامنے جھاڑی میں سے ایک نوگزا آدمی نکلا۔ اس نے بدھ مت کے بھکشوں جیسا لباس پہن رکھا تھا ہاتھ میں اونچا بانس تھا۔ اس بانس پر ایک سبز رنگ کی مشعل روشن تھی۔ وہ دائرے میں چلتا رہا اور پھر مشعل کو نگل کر جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔۔۔ تھوڑی دیر مشعل سمیت جھاڑی چکر لگاتی رہی اور پھر جھاڑی مشعل نوگزا سب کچھ غائب ہو گیا۔

”یہ سب کیا ہے؟“

”جو سامنے ہو رہا ہے۔“

”نہیں جو میرے دل میں پھوٹ رہا ہے لادے کی طرح۔“

”حسد میں یہ خوبی ہے جیسی کہ انسان اس میں کھو کر محبوب کے تصور کو کھو بیٹھتا ہے۔ پھر رقیب کے خیالات غالب رہتے ہیں یہ خیالات اس قدر غصیلے زہر آلود اور ہم انگیز ہوتے ہیں کہ محبت کی نازک سوچیں اس گیس بھری فضا میں سانس نہیں لے سکتیں۔ ایسے میں انسان محبت کرتا ہے لیکن باز گشت سے۔۔۔۔۔ اصل آواز سے نہیں۔۔۔۔۔ اصلی محبوب تو کہیں اندر ہی اندر گم ہو جاتا ہے حسد کا محبت سے کیا تعلق؟“

وہ احسان مندی سے بولی۔۔۔۔۔ ”تم بڑے ذہین ہو قیوم۔۔۔۔۔ سوشیا لوجی کی کلاس میں بھی سب تمہاری تعریف کرتے تھے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ لیکن پتہ نہیں تمہاری ان باتوں سے میری تسلی کیوں نہیں ہوتی۔“
اس کے ماتھے پر چڑھی ہوئی نس پر میں نے انگلی پھیری۔
”یہ بتاؤ اب میں کروں تو کیا کروں“

”اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔۔۔۔۔ تمہیں کیا پتہ قیوم۔۔۔۔۔ تم میری کتنی بڑی کمزوری بن گئی ہو اگر میں تمہیں نہ ملوں۔۔۔۔۔ اگر میں کسی سے آفتاب کی باتیں نہ کر سکوں تو اس کی یادوں کے پر پیر تلے میں پھٹ جاؤں میں۔۔۔۔۔ سارے شہر میں اس کی باتیں کس سے کروں قیوم۔۔۔۔۔ بتاؤ ناں؟“

میں نے کمینگی کے ساتھ کہا۔۔۔۔۔ ”تم مجھے صرف اس لیے ملتی ہو۔۔۔۔۔ جیسی کہ تم مجھ سے اس کی باتیں کر سکو۔“

چور سپاہی کے کھیل میں وہ اچانک پکڑی گئی۔

”اور بھی وجہ ہے۔۔۔۔۔ وجہ ہے ایک اور۔۔۔۔۔ پر پر۔۔۔۔۔“

”اور کیا وجہ ہے جیسی۔۔۔۔۔“ میں نے امید سے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ اس

وقت وہ اعتراف کر لے گی کہ رفتہ رفتہ وہ میری محبت میں مبتلا ہو گئی ہے اور اب وہ آفتاب کا نم بھی لینا نہیں چاہتی لیکن اس کی بات سن کر میرے اندر پھیپہ جام سٹرائیک ہونے لگی۔۔۔۔

”اگر تم نہ ہوتے قیوم۔۔۔۔ اگر تمہاری ہمدردی محبت نہ ہوتی تو میں کبھی کی خود کشی کر لیتی۔ تمہاری محبت نے مجھے یہ قدم اٹھانے نہیں دیا جب مجھے پتر الیقین ہو جاتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں۔۔۔۔ تو یہ تمہاری ہمدردی ہے تمہاری محبت جو مجھ میں خود اعتمادی بحال کرتی ہے۔ تم سمجھ نہیں سکتے قیوم میری انا کس حد تک مجروح ہو چکی ہے مجھے اپنی شکل، عقل، عادات، گھرانے اپنے مکمل وجود سے نفرت ہے۔ مجھ میں اگر کچھ بھی اچھا ہوتا تو کیا آفتاب مجھے چھوڑ کر جاتا؟۔۔۔۔ جاسکتا۔۔۔۔؟ بتاؤ نا قیوم بولو۔۔۔۔ کبھی وہ مجھے چوڑ سکتا؟۔“

گفتگو کا کرونا میٹر پھر آفتاب کی ٹک ٹک بجانے لگا۔

”میں شاید احساس کمتری کا شکار ہوں ان دنوں۔۔۔۔ میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہوں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔ پھر بتاؤ ناں۔۔۔۔ تم میرے محسن نہیں تو اور کیا ہو۔۔۔۔ تم نے تمہاری محبت نے۔۔۔۔ مجھے روک رکھا ہے اس دنیا میں۔“

ففتھ ایئر کی سیسی سے یہ لڑکی کتنی مختلف تھی۔ گفتگو میں۔۔۔۔ لباس میں کردار میں۔

”صرف محسن؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”اور اور۔۔۔۔ کیا؟“ لا تعلقی سے اس نے منہ پھیر لیا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اگر اوپر سے دل سے بھی انکار وجود مان لیتی تو بھی میرے لیے بہت کافی ہوتا۔

”قیوم کیا وہ بھی ایسی باتیں کرتا ہو گا زیبا سے؟“

میں اس نام سے اچھی طرح آشنا تھا۔ بارش سے پہلے چلنے والا جھکڑ۔۔۔۔ جبلی

کے کھمبے، چھتھنارے درخت بوسیدہ دیواریں گرانے والی ہائی وولٹیج کی بجلی۔
”کیسی باتیں سیمی؟“

”ویسی باتیں بیڈروم ٹون میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔۔۔۔۔ کرنے نہ
کرنے والی سب باتیں۔۔۔۔۔“
”کیا تم بے وفا ہو سیمی؟“

”نہیں قیامت تک نہیں۔۔۔۔۔ مجھے آفتاب سے محبت ہے اور قیامت تک
رہے گی لیکن وہ بے وفا ہے۔“

میں نے کہنا چاہا کہ اچھی وفا ہے کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو
اس کا سمجھ رہی ہو۔ لیکن کوئی چیز میرے اندر بتا رہی تھی کہ وہ سچی ہے اور درست کہہ
رہی ہے۔

”شادی کا خوشی سے اور محبت کا اختیار سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔۔ حقوق و فرائض کا
وارثگی سے کیا ناٹھ؟“

اس وقت میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نئے بوٹ پہن کر سیدھا ساندھا کلاں
سے چلا آ رہا ہوں۔ میرے انگوٹھے کے قریب گھٹے پڑ گئے ہیں۔ جن میں اس وقت
بہت درد ہو رہا ہے۔ لیکن وہ کب سنتی۔ کب سمجھتی؟

”کچھ کہو نا۔۔۔۔۔ کوئی فیصلہ کن بات جس سے یہ حسد کی آگ ٹھنڈی پڑ
جائے قیوم بولو۔۔۔۔۔ تو سہی۔۔۔۔۔ اپنے جوتوں کو پھر Admire کر لینا۔“

میں نے لمبی سانس لی اور اس کی تشفی لے کیے کہا۔ ”ہر شخص کی یہی مجبوری ہوتی
ہے سیمی۔ وہ ساری عمر ایک ہی سزا نہیں بھگت سکتا ایک ہی خوشی کے سہارے زندہ
نہیں رہ سکتا۔ پھانسی کے تختے سے اتر کر بجلی کر کرسی پر بیٹھنا۔۔۔۔۔ بجلی کی کرسی سے
اٹھ کر صلیب چڑھنا، تہہ آب ہونا اور نہ مرنا۔ پانی کی گہرائیوں سے نکل کر سر کو
ہسارے سے چھلانگ لگا جانا۔ سیمی جان ہم سب ایک کرب سے نکل کر کسی دوسری

تکلیف کے حوالے ہو جانا چاہتے ہیں۔ ایک خوشی سے منہ موڑ کر کسی اور خوشی میں ڈوبنا چاہتے ہیں۔ یہ انسان کے لیے اتنا ہی نیچرل ہے جیسے وہ ایک ٹانگ پر ہمیشہ کے لیے کھڑا نہ رہ سکے۔ آفتاب بھی تمہارے نا اسودہ لا حاصل عشق کے کرب سے ٹکنا چاہتا تھا۔ شاید اس تکلیف سے نکل کر وہ پہلے سے بھی زیادہ مصیبت میں ہو لیکن انسانی دل ایک ہی مصیبت ایک ہی غم ایک ہی بوجھ ساری عمر نہیں اٹھا سکتا۔ کرب بھی رنگ بدلتا ہی رہے تو قابل برداشت رہتا ہے۔“

”تمہارا بہت بڑا دل ہے قیوم۔۔۔۔۔ ہو پوٹمس جتنا۔۔۔۔۔ میں تم سے محبت نہیں بھی کرتی پھر بھی تم مجھے تسلیاں دیتے رہتے ہو۔۔۔۔۔ تھینک یو۔۔۔۔۔ تھینک یو۔۔۔۔۔ تھینکس۔“

اس وقت میں سیمی کا کف اوپر کر رہا تھا
معایعے دل میں خیال آیا کہ قلب کا راستہ جسم سے ہو کر نہیں گزرتا۔ قلب تک پہنچنے کے لیے صرف ٹیلی پیٹھی، وجدان، ہپ نوٹزم میگزیم کی ضرورت ہے۔ جسم روحانی عمل کو زمین میں ارتھ کر دیتا ہے میں نے بڑی تقدس سے سیمی کے کف بند کیے اور دل میں عہد کیا کہ اب میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔

انسانی روح کے لیے سب سے زیادہ مقطر اور طیب محبت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب سے بنی قابیل بنی ہابیل پر غالب آئے اصلی اور صادق محبت کا چشمہ قریب قریب سوکھ گیا اب جا بجا ہوس تھی۔۔۔۔۔ جنسی تجربات تھے۔۔۔۔۔ معکوس رابطے، نافرمانی اور نا اسودگی کی محبت تھی لوگ ایک دوسرے کو لتا جیض کی طرح استعمال کرتے اور چھوڑ جاتے۔ محبت میں کچی اور کم فہمی کا رواج عام ہو گیا۔

مخلوں میں ان کی نا اسودگی کہانیاں پھر نے لگیں۔ اخباروں میں بے امن قصے بیان ہونے لگے۔ جب سے بنی قابیل غالب آئے تھے سچی اور پاک محبت کی بارش

کے لیے کوئی دمانہ مانگتا۔ سب ہی جنسی محرومی، قلبی تنہا اور روح کے کلاء کی وجہ سے دیوانے ہو رہے تھے ہر وہ شخص جس کی روح میں حرام مال پہنچ رہا ہو، چہرے بشرے سے رلجہ گدھ بن جاتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں دھنسی ہو یہ چہرہ سبزی مائل پیلا، بال بکھرے ہوئے اور ہڈیاں نمایاں ہوتی ہیں روح کا حرام کھانے والا ہزاروں میں پہنچانا جاتا ہے ہزاروں میں لاکھوں میں پھر عجیب تھا کہ میرا بمشکل ساندھا کلاں میں دوسرا کوئی نہ تھا۔

میں اپنے محلہ کا اپنے کالج کا سب سے بڑا رلجہ گدھ تھا!

یہی کی نا آسودہ محبت اب اپنے اثرات دکھانے لگی تھی۔۔۔۔۔ گوا سے ملے مجھے کئی دن ہو چکے تھے لیکن میں ابھی تک اس کے مورفیا تلے پھرتا تھا۔ چاند راتوں رات کے پچھلے پہر مجھے Visious دکھائی سینے لگے Ballueination کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی مجھے اپنا سر گھومتا نظر آتا۔۔۔۔۔ گلاس کے پانی میں مجھے چھوٹے چھوٹے مائیکروسوپ سے نہ نظر آنے والے جرثومہ صاف صاف نظر آتے۔۔۔۔۔ پھر بجلی کی تار پر آنے والی چھپکلی ڈانسا سواس جیسی بڑی اور مہیب دکھائی دیتی۔ آسمان پر بادلوں کے رنگ آپس میں جڑ کر بڑی بڑی مدینہ ناز شاندار عورتوں کی تصویریں بن کر لٹک جاتے اور اخبار کی اصلی سرخیوں کے اندر اور الفاظ اور ان الفاظ کے اندر اور تصویریں پر محض نظر آتیں۔ ان دنوں میں تلاوت الوجود میں مبتلا تھا بچپن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات اور ان واقعات سے منسلک تمام لوگوں کی ورق گردانی میں دن کا زیادہ حصہ گزرتا ہے میں بظاہر شیو کرنا کرتا کپڑے بدلتا، بھائی مختار کی موٹر سائیکل مانگ کر ریڈیو سٹیشن جاتا وہاں اپنی درخواست کی پیروی کرتا۔۔۔۔۔ لیکن میرے اندر کا توازن بالکل بگڑ چکا تھا میں بیرونی حالات و واقعات میں زندہ نہیں تھا۔ میرے اندر شرح در شرح ایک ہی کتاب لکھی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ اور جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ اتنا ہی بے ربط تھا جیسے بندروں کا ایک جتھہ ٹائپ رائیٹروں پر کتاب لکھنے

کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔۔

یہ رجبہ گدھ کی زندگی ہے۔

بیرونی کوائف سے کٹی ہوئی۔۔۔۔ اندرونی ہیجان میں اٹھی صراحی کی طرح
معلق۔۔۔۔ ایسی صراحی جس سے قل قل کر آواز تو آتی رہے لیکن ایک بوند پانی بھی
کبھی نہ گر سکے۔

شاید ہمارا سارا گھرانہ ہی بن باسیوں کا تھا

ہم پرانے گدھ جاتی کے وہ راجپوتی لوگ تھے جنہوں نے راجستھان میں پناہ لی
تھی اور جو کھیتی باڑی کو منفعہ بخش کام سمجھ کر اب پنجاب کی سر زمین میں آباد ہو گئے
ہم راجپوتی لوگ اب غیرت اور ان کی تمام کہانیاں بھول چکے تھے وہ تلواریں خدا
جانے کہاں تھیں جنہیں میدان کا راز بلاتا رہتا تھا اب محبت غیرت سچائی ساری غیر
مرئی باتوں پر کٹ مرنے کی روایات ختم ہو گئی تھیں صرف تھوڑا تھوڑا دیوانہ پن رہ گیا
تھا۔ اسی لیے کچھ کچھ وارداتیں اب بھی ہو جاتیں۔۔۔۔۔ ہماری ناکس عقاب
جیسی اور مونچھوں کے بال گرگٹ کے پٹھوں کی طرح تنے ہوتے تلوار کی سچی زبان
ہمیں بھول چکی تھی لیکن اس کے باوجود لمبی چوڑی بحث، کٹ جیتی اور بے ہودگی میں
ہم نے پناہ لی تھی بس خواب ہمیں پریشان کرتے تھے۔ ہر دیوانے کی طرح خوابوں
میں ہمیں زیادہ حقیقت نظر آتی ماڈرن آدمی پر تہذیب اور تعلیم کا شہری زندگی کا جو بھی
بوجھ ہے وہ ہمارے ہم قوم لوگوں پر بھی پڑا رہا تھا ہماری اندر کی جبلت ہمیں مارنے
مرنے پر اکساتی تھی۔ کھلی ہوا چوڑے میدان کی طرف کھینچتی تھی اور معاشرہ ہمیں تال
میل سمجھوتے پر اکساتا تھا۔ اسی لیے ہم بھی کئی صدیوں سے چوراہے پر کھڑے تھے
ایک ایسی اندھی بتی کے نیچے جس کی بتیاں فیوز ہو چکی تھیں۔ لیکن ہم اشارے کے
منتظر تھے ہمیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ چاروں راستوں میں سے کون سا بہتر ہے، ہم کس
راستے پر چل کر نجات ملے گی؟۔

ایک راہ گاؤں کو جاتی تھی۔۔۔۔۔ جہاں دن لمبے ہوتے ہیں نیند سکون سے آتی ہے لیکن غریبی میں تفریح کے بغیر قناعت کی ڈھال نہ ہوتے ہوئے یہ سفر بہت لمبا اور تھکا دینے والا ہوتا ہے جہاں آدمی ہر روز کے اطمینان سے گھبرا جاتا ہے۔۔۔۔۔

دوسرا رشتہ شہر کو جاتا ہے چھوٹے شہر کی سڑکیں بڑے شہروں کو بڑے شہروں کے ہوائی جہاز اور بڑے چہروں کو اور وہاں سے جانے والے راستے کئی اور ملکوں میں نکلتے ہیں نئی کلچر، نئی تعلیمات، نئے لباس نئی زبانیں نئی چہرے نئی آگاہی۔۔۔۔۔ اس راستے کے ہر سنگ میل پر نہ صرف اپنے اعتقادات مذہب کلچر اور سوچ کا پٹرول ہی جلتا ہے بلکہ ہر موڑ ہر سیاح بے اطمینانی کی سوغاتیں سواہن روح یادوں کے بیج ٹکٹ اپنے پرس میں اکٹھے کرتا جاتا ہے ہر جگہ اسے اپنی ذات، مذہب ملک اور قوم کا ٹریولر چیک بھونا پڑتا ہے اور دوسرے ملک کی نقد البدل کرنسی حاصل کرنا ہوتی ہے

تیسری پگڈنڈی جنگل کو نکلتی ہے

یہاں ساری طرف اونچی اونچی گھاس ہے جس میں انسان کی اپنی جلی آرزوئیں پھن اٹھائے کھڑی رہتی ہیں ہر آرزو دلاؤ بیز بھی ہوتی ہے اور سر پر کلہاڑی مار کر ختم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے آرزوؤں کا یہ جنگل بڑا اطمینانی ہے اس میں اپنے مرنے اور دوسرے کو مارنے کا کھٹکا ساتھ ساتھ رہتا ہے تہذیب کی زنجیروں میں جکڑے انسان کو یہاں پہنچ کر بھی ہار کیری کرنے کے سوائے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ یہ راستہ بھی منزل نا آشنا ہے صرف اسی گریڈ ٹرنک میں اور کئی راستے آکر ملتے ہیں سڑک اور چوڑی ہو جاتی ہے لیکن ہمیشہ جنگل میں ہی چلتی ہے اس راستے میں اتنے پل آبشاریں نشیب اونچائیاں آتی ہیں کہ جہلت کی تلوار ہاتھ میں رہ جاتی ہے اور انہی زرہ کے بوجھ تلے آدمی مر جاتا ہے

چوتھا راستہ غاروں کی طرف جا نکلتا تھا اور کسی کو معلوم نہیں کہ یہ غاریں کہاں جا نکلتیں ہیں۔ سب ان بروحوں جنوں اور آسپی رنگوں سے ڈرتے ہیں جن میں ڈبو

ڈبو کر انسان ہر پڑاؤ پر رنگ بدلتا جاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ مافق الفطرت راستہ گو مشکل نظر آتا ہے لیکن غاروں کے اندر کبھی کبھی پناہ بھی ملتی ہے اور ٹھنڈک بھی ہم راہ چوت تھے اور آج تک اسی چوراہے پر کھڑے تھے کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ہم سب کے اندر خواب اور حقیقت گڈمڈ ہو گئی تھی۔

بھابھی صولت کا چہرہ؟

بھائی مختار کی شکل؟

اماں۔۔۔۔۔؟ ابا۔۔۔۔۔ کیا ہم سب انسانوں میں سے تھے؟

کیا ہماری شکلیں گدھوں سے مشابہ نہ تھیں

ہم لوگ ضلع شیخوپورہ کے چند راگاؤں میں رہتے تھے۔ جس طرح چندرے آدمی کا ساتھ بالآخر چھوڑنا پڑتا ہے اسی طرح بالآخر ہم سے بھی یہ گاؤں چھوٹ گیا پتہ نہیں چند راں چند راں سے بگڑا ہوا لفظ تھا کیونکہ جب بھی ہم گاؤں سے نکلے اس کی یاد چاندی کی طرح دیکھنے لگتی۔

چند راں کو جانے والی کچی سڑک جس کے ارد گرد ڈیلے کی خود رو خاردار جھاڑیاں تھیں بہت لمبی تھی۔ گاؤں میں غریب غربا کے استعمال کی چیزیں بیچنے والی دوکانیں، آنا پسینے والی خراس تال میں ڈوبی بھینسیں، مٹی اڑانے والے کیکے، چارہ کترنے والی مشینیں دو تنور اور بہت سی یادیں تھیں جو فاصلے کی وجہ سے خوبصورت ہو گئی تھیں بی اے کے بعد ان ساری یادوں کو تازہ کرنے میں دوبارہ چند را گیا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ سارا گاؤں سیم اور تھور کی وجہ سے اس حد تک برباد ہو چکا ہوگا پورے چار سال گاؤں سے باہر رہنے کی وجہ سے میں ان خبروں کی عینی شہادت نہ رکھتا تھا جو کبھی کبھار ابا کے خطوں میں درج ہوتی تھیں ماں کے مرنے کے بعد ہم دونوں بھائی چند راں نہیں گئے۔ پہلے بھائی مختار نے ایک رسالے میں سب ایڈیٹری کی اور پھر جب وہ سیکرٹریٹ میں ملازم ہوئے تو اپنے خاندان سمیت وہ

ساندہ کلاں میں آگئے۔

گاؤں میں ماں جو نہیں تھی!

گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے میں ہمیشہ ماموں کے پاس قصور چلا جاتا۔ کبھی مجھے چند راں کا خیال نہیں آیا۔

جس وقت بیگ اتھائے گاؤں پہنچا میں نے دیکھا

ارد گرد بڑے بڑے سور کے ڈھیر تھے کلر کے تختوں میں پرانے مرے ہوئے جانوروں کے ڈھانچے تھے کہیں کہیں زمین میں دلدل تھی کھارے پانی کے جوہڑ تھے۔ جن کے کنارے سبز گاجنی رنگی مٹی میں پیاسے جانوروں کے کھروں کے نشان گہرے ہو کر خشک ہو چکے تھے یہ جانور پانی کی تلاش میں آئے تو ضرور لیکن پیاسے لوٹ گئے۔

سارا گاؤں بے آباد پڑا تھا کسی کسی آنکھیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لیکن گلیاں سونی تھیں بہت سے کپے کپے گھروں کے دروازے جانے والے مکینوں کی یاد میں کھلے پڑے تھے اب ان گھروں میں چرانے کو بھی کچھ باقی نہ رہا تھا اول تو جانور کم تھے اور جو باقی تھے ان کی ہڈیاں کو لہے نکلے ہوئے تھے۔ بیلوں کی آنکھوں میں اداسی تھی اور بھینسیں ہراس کی وجہ سے آنکھیں نہ ملاتی تھیں بچے دہلیزوں پر چپ چاپ بیٹھے وقت گزارنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اور گھٹنے بہت نمایاں ہو چکے تھے۔

یہ وہ چند راں نہیں تھا جس سے چار سال پہلے میں رخصت ہوا تھا

تب تو ہرے ہرے کھیتوں میں تانگہ جاتا ہوا نظر بھی نہ آتا تھا۔ تب تو ہماری حویلی میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی قیام پاکستان کے بعد اس گاؤں میں کئی رنگ کے کچھیرو آباد ہو گئے تھے بڑے لونگ اور سنتواں ناک والی راجپوتنیاں، گول گول دہنوں والی کشمیریں چوڑے طباق والی مٹی رنگی جاٹ عورتیں، چکنی جلد پر نارنگی کے چھلکے ملنے والی مغل زادیاں، خوشامد سے دوسہری ہو جانے والی میراثیں، پل میں

صحن کارنگ بدل دینے والی سکے زینیں ناپ تول کی تکرری کے باٹ جیسی زندگی بسر کرتی شیخانیاں، جلدی ڈھل جانے والی زرد زرد آرائیں استریاں کھلی بیسن سے نہائی دھوئی کجریاں چوڑے چھکانے اور طعنے دینے والی مسلمیں۔۔۔۔۔ ماں زندہ تھی تو چند راں کا گاؤں اور پھر ہماری حویلی کچھ اور ہی چیز تھی۔

سارے درخت ہرے بھرے تھے سب کھیت لہلہاتے تھے۔ ہر کنوئیں میں میٹھا پانی تھا ہر کسان کے گھر میں دانے تھے اب سارے میں کمر ہی کمر تھا موت ہی موت تھی۔ اور اماں کہیں بھی نہیں تھی۔

جب میری ماں زندہ تھی تو حویلی کے آنگین میں ہر سے میلے کی سی کیفیت رہتی دو آرہی ہیں دو جا رہی ہیں میری ماں ان عورتوں میں نظر نہ آتی۔ پھر بھی اس کی وجہ سے میلہ لگا رہتا۔ وہ جہاں بیٹھی وہی جگہ آباد ہو گئی اور کچھ نہیں تو اس کی چارپائی تلے چیونٹیوں ہی راستہ بنا لیتیں۔ ماں عام طور پر حویلی میں کسی جگہ بھی نہ ہوتی تھی پر اس کے کیے ہوئے کام ہر جگہ اس کی گواہی دیتے کہیں چارہ کٹا ہوا ملتا کہیں نارنگیوں کے چھلکے سوکھنے کے لیے پڑے ہوتے۔ سوئی کپڑوں کی رنگین کٹرنیں مکئی کے خالی تکیے گنوں کے چھلکے۔۔۔۔۔ بادام کی زاہ کھلی۔۔۔۔۔ ماں تھی تو آنگین آباد تھا۔ گاؤں زندہ تھا۔

اب ہماری حویلی کے تمام دروازے کھڑکیاں کھلی تھیں۔۔۔۔۔ میں نے ابا کو آواز دی۔۔۔۔۔ ”ابا“۔۔۔۔۔ اندر والے کمرے سے ایک کبڑا بوڑھا کچھ پہچانتا کچھ بھلاتا میری طرف بڑھنے لگا۔

اس بڑھے گدھ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے آنگین کے سارے فرش کی کی اینٹیں کمر چاٹ گئی تھی اور اب جب ان پر پاؤں پڑتا تو پھک سے سفید ذرات اوپر کواٹھتے تھے ٹوٹی ہوئی ربڑ کی ہوئی چپل میں جو شخص مجھے بھولتا اور پہچانتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا جس کے سر کے تمام بال سفید تھے۔ اور

جڑے کی ہڈیاں کسی ہوئی تھیں۔ یہ شخص میرا باپ تھا۔

چار سال سے میں نے کبھی اس کا پتہ نہیں لیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زمین کمرزدہ ہو جانے پر اب وہ کیسے گزر رہا کرتا ہے۔

آنکھوں کا چشمہ ناک پر جماتے ہوئے وہ بڑھتا آ رہا تھا۔۔۔۔۔ ”کون ہے کون ہے بھی بولتے کیوں نہیں؟“

میں سوٹ کیس ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ جو حویلی کے کئی طاق کھلے تھے کئی دروازے ہوا میں جھول رہے تھے۔۔۔۔۔ ہوا میں ایسا نمک تھا جو پسینے والے بدن سے پچک کر خارج میں بدل جاتا ہے۔

”کون ہے بھی؟“ ابا نے پاس آ کر کہا۔

پھر اور قریب آ کر اس نے بازو پھیلائے۔ لمحہ بھر کو بازو پھیلے رہے پھر شرمندہ ہو کر اس اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا اور بولا۔۔۔۔۔ ”آؤ قوم آؤ کھڑے کیوں ہو۔“

ہم دونوں چپ چاپ اس تحت پوش پت بیٹھ گئے جس پر بیٹھ کر کبھی اماں سارے گاؤں میں حکم چلایا کرتی تھی

”ابا۔۔۔۔۔ بھائی مختار نے کہا ہے۔“

”کس نے؟“

وہ اونچا سننے لگا تھا

”بھائی مختار نے کہا ہے۔۔۔۔۔ کہ اب تو چندرا چھوڑ دے میں تجھے لینے آیا

ہوں۔“

”آمیرے ساتھ۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ ذرا۔۔۔۔۔“

میں ابا کے ساتھ چلنے لگا وہ مجھے ساری حویلی میں لیے پھرا۔۔۔۔۔ گھر کی حالت ساختہ تھی، کہیں رنگین پائے کا پلنگ آخری دموں پر تھا، کہیں حسی ٹرنک کمر میں ڈوبے

تھے۔۔۔۔۔ ساری جگہ آسب زدہ تھی وہ گھوم پھر کر میرے ساتھ باہر آ گیا اور پھر تخت پوش پر بیٹھ کر بولا۔۔۔۔۔ ”دیکھتا نہیں تیری ماں کی کتنی نشانیاں ہیں یہاں۔۔۔۔۔ کس کس کو چھوڑ کر جاؤں؟“

میں چپ ہو گیا۔

”ابا بھائی مختار ساندھا کلاں میں رہتے ہیں۔“

”رہے جم جم جی صدقے۔“

”بھابھی صولت نے بھی ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ تو میرے ساتھ تو

چل ابا۔۔۔۔۔ میری پڑھائی کے بھی دو سال باقی رہ گئے ہیں۔“

وہ کھانسنے لگا مدافعت کے طور پر۔۔۔۔۔ شرمندگی کے احساس تلے وہ اس وقت

مجھے اپنا باپ نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا جانور لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ معصوم جانور جس نے سونے کے فریم کی عینک پہن رکھی تھی۔

”تو نہیں سمجھتا ناں۔۔۔۔۔ یہاں وہ اور میں باتیں کرتے رہتے ہیں سارا دن

وہاں شاید شہر میں وہ میرے ساتھ جانا پسند نہ کرے۔“

میں نے غور سے ابا کی طرف دیکھا۔

جب ماں زندہ تھی تو ہم نے ان دونوں کو کبھی باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن

جب ماں مر گئی تو پھر ابا اس کے شیشے لگے بڑے پلنگ پر لیٹ کر پہروں منہ میں

باتیں کرتا نظر آتا۔ اماں کے ہوتے ہوئے ابا ہمیشہ کھیتوں پر رہتا تھا اندر صحن میں

رنگ رنگ کی عورتوں کا میلہ دیکھ کر گھر لوٹنے پر بھی وہ حویلی کے باہر ہی مونڈھا

منگوا لیتا۔ لیکن اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ امریکہ کا پریزیڈنٹ ہو۔ اس

کے حقے کی نے مونڈھے کی بٹھاوٹ اور نشست وہاں سے صاف نظر آتی جہاں صحن

کے اندر ماں کا تخت بچھا ہوتا۔ دونوں میں شاید کوئی پیغام جاری رہتے ہوں اس کا

ہمیں علم نہ تھا۔

ماں کے مرنے کے بعد حویلی دم چھوڑ گئی۔۔۔۔۔ میلہ ٹوٹ گیا۔۔۔۔۔ گاؤں کے ارد گرد تو بہت پہلے سے سیم نالہ بہتا تھا اور زمین شور زدہ ہو رہی تھی لیکن اب ابا بھی پڑا رہا آہستہ آہستہ ہماری زمینوں پر بھی کلر ریگنے لگا ابا کی آواز میں خوف پیدا ہو گیا۔ اس کے بازوؤں پر جھریاں نظر آنے لگیں۔ اب ابا جھکتا تو کھڑے ہونے سے پہلے کمر پر ہاتھ رکھ لیتا۔ اس کی آنکھوں میں اب تیل والے خشک چراغ جیسی کیفیت تھی۔ جیسے کبھی جلتا تھا لیکن اب صرف گلیاں رہتا ہو۔ دسویں جماعت میں نے قصور میں ماموں کے پاس رہ کر پاس کی۔ اس وقت تک مختار بھائی لاہور میں ملازم ہو گئے تھے ان کی بیوہ اور بڑا بیٹا ساندہ کلاں میں کرائے کا مکان لے کر رہنے لگے تھے میں نے باقی تعلیم ہوٹل میں رہ کر مکمل کی۔ لیکن ساری چھٹیاں میں ماموں کے پاس قصور میں گراتا تھا۔ مجھے کبھی چند راجا جانے کا خیال نہیں آیا۔۔۔۔۔ میں اماں کے بغیر چند راکا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابا سے ملنے کو جی چاہتا۔ لیکن ہم دونوں بھائی ہمیشہ سے باہ سے دور دور رہے میرے ذہن میں ابا ساندل کا سائڈ تھا جس کا جسم لس لس کرتا ہے، جو کھیتوں میں کھڑا چرتا ہے بے ضرر لگتا ہے لیکن کوئی کسان اسے کھیت سے نکالنے کی جرأت نہیں کرتا۔ پاس جانے پر آمادہ بھی نہیں ہوتا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے گاؤں کو کلر نگل رہا ہے۔ لیکن میں کلر کھائے گاؤں کو کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایک کلر ایسا بھی ہوتا ہے جو ساندل بار کے سائڈ کو بھی کھا جاتا ہے۔

”دیکھو قیوم۔۔۔۔۔! یہ میرا گھر ہے۔۔۔۔۔ میرا۔۔۔۔۔ اگر میں اسے چھوڑ گیا تو گاؤں والے کیا کہیں گے۔“

میں پلٹ کر اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ کسان نہیں تھا۔ ساندل بات کا سائڈ نہیں تھا۔ وہ صرف راجا گدھ جو ایک مری ہوئی عورت کے لاحاصل تصور میں اپنی زندگی کی ڈوری لٹکائے بیٹھا تھا

میرا باپ دیوانہ ہو چکا تھا۔۔۔ اس کی آنکھوں میں کلر نے چھڑکاؤ کر رکھا تھا۔
 ”ابا یہاں اکیلا مت رہ ناں۔۔۔ وہاں ہم دونوں ہیں تیری خدمت کریں
 گے۔۔۔ چل ناں۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ایک تہاڈھے کی مجروح نہی۔
 ”اور اس کی قبر کو کلر کے حوالے کر دوں؟۔۔۔ یہاں تو روز قبر دیکھنے نہ جاؤں تو
 چوتھے دن قبر کا منہ پھٹ جاتا ہے۔“
 ”ابا۔۔۔ یہاں بڑی مشکل ہے وہاں۔“

ابا نے حویلی پر نظر دوڑائی اور بولا۔۔۔ ”یہاں وہاں کچھ نہیں بیٹے۔۔۔ مجھے
 جسم کا آرام نہیں چاہیے۔۔۔ یہاں میری روح خوش ہے وہ اسی گھر میں آئی تھی۔
 یہیں سے اس کا جنازہ اُٹا۔۔۔ اوئے احمق مجھے مرد ہو کر اتنی توفیق نہیں کہ میں اس
 کے مرنے کے بعد اس کے گھر خیال رکھوں؟۔۔۔ اس نے تو ساری عمر میرے گھر
 کی اینٹ اینٹ سے پیار کیا۔“

میں ساری دوپہر ابا کے پاس چپ بیٹھا رہا دھوپ ڈھلنے کے وقت میں نے
 سوٹ کیس اٹھایا اور سٹیشن کی طرف چلنے لگا۔

آخری بار اس جگی کھڑے ہو کر میں نے اندر نظر ڈالی جہاں جوانی میں ابا
 کا مونڈھا ہوتا تھا

سارا صحن خالی تھا

تین طرف بنے ہوئے کمروں کے کچھ دروازے کھلے کچھ بند تھے۔ لیکن سب کا
 پلستر کلر کی ہوا چاٹ گئی تھی۔۔۔ جہاں ماں کا تخت پوش اینٹوں کے پایوں پر پڑا تھا
 اس کے نیچے دو دو انچ شور کھڑا تھا۔۔۔ سارے آنگن میں نو کیلی جھاڑیاں اک آئی
 تھیں نہ کہیں اناج تھا نہ پانی۔۔۔ نارنگیوں کے کٹے ہوئے چاند، سوکھے ہوئے
 گنوں کا انبار، چا پائیاں گھڑونجی۔۔۔ چاری کاٹنے والی مشین اماں کی پہاڑی

بکریاں۔۔۔۔۔ندی بلیاں۔۔۔۔۔چھوٹے چھوٹے لڑکے۔۔۔۔۔مینھڈیاں
کروانے والی تیل میں سنے ماتھے نکالنے لڑکیاں۔

چولہا۔۔۔۔۔دھواں۔۔۔۔۔اماں کے سپی۔۔۔۔۔اناج تولنے والا ترازو۔۔۔۔۔
توشکیں اور ان میں نگندے ڈالنے والی عورتیں
وہ سارا کاروبار۔۔۔۔۔وہ ساری زندگی کہاں گئی؟۔ کیا کل صرف ماں کے جانے
کا انتظار کر رہا تھا۔

جب میں گلی میں کافی دور نکل گیا تو میں نے پلٹ کر ایک بار پھر حویلی کی طرف
نظر کی۔

ابا اوپر مٹی پر کھڑا تھا۔۔۔۔۔اس کے دونوں بازو آگے کو بٹھے ہوئے تھے۔
رابعہ گدھ۔۔۔۔۔عمارت کی آخری اونچائی پر مائلجولیا کی لپیٹ میں کھڑا تھا۔
میں نے دل میں سوچا جب بھی روح لا حاصل محبت کرتی ہے یہ دیوانے اپن
سے کیوں ہمکنار ہو جاتی ہے؟

کیا روح ہمیشہ لا حاصل راستوں پر جانا پسند کرتی ہے۔
کیا اس کے لیے دیوانگی کے علاوہ اور کوئی پناہ نہیں۔۔۔۔۔؟ کوئی پناہ نہیں؟

سٹیشن کے سامنے یکے پر سے سامان اتارتے ہوئے غریب کوچوان نے
شرمساری سے کہا۔۔۔۔۔”قیوم بھائی آپ بہت دیر بعد گاؤں آئے ہیں۔“

میں نے اسے پہچاننے کے لیے غور سے دیکھا۔

”میں عزیز گاتن کا چاچا ہوں فضل کریم۔“

”عزیز گاتن؟“

”ہاں عزیز گاتن۔“

میں نے فضل کریم کو چھٹی ڈالی وہ میرے گر مجوشی سے واضح طور پر متاثر ہو گیا۔

غالباً پینٹ سوٹ والے سے اس کا یہ پہلا معائنہ تھا۔

”عزیز گاتن کا کچھ پتہ چلا؟“

”کہاں جی۔۔۔ وہ تو پتہ نہیں کہاں غایب ہو گیا اچانک؟“

فضل کریم مجھے سلام کر کے بڑے موندب طریقے سے واپس چلا گیا۔ میں پلیٹ فارم پر اکیلا مسافر تھا۔ جب تک گاڑی نہیں آئی میں اپنے اکلوتے سوٹ کیس پر ہاتھ رکھے سوچتا رہا۔

عزیز گاتن، ہبھا، ہمبلی ٹا، سب کہاں گئے؟۔۔۔ گاؤں میں پہنچ کر میں نے اس میں سے کسی کو بھی تو یاد نہیں کیا؟

ہم نے کئی سال اکٹھے ٹیانا پوکھیا تھا۔۔۔ کونلے سے دیواروں پر لکیریں کھینچی تھیں۔ گاؤں کی ہر چھوٹی بڑی پگڈنڈی اور بڑے چھوٹے درخت پر ساتھ رہے تھے۔

یہ وقت کیا کرتا رہتا ہے

یہ وقت۔۔۔ آخر چاہتا کیا ہے؟

عزیز گاتن؟۔۔۔ فضل کریم کا بھتیجا۔۔۔ عزیز گاتن؟

وہ جھپور تھا۔ گاؤں کے بڑے پپل تلے اس کی ماں تندو رتپایا کرتی تھی۔ سردیوں کے موسم میں سہ پہر کے وقت روٹیاں لگانے سے بہت پہلے جب وہ منجھیوں کا بالن جلا کرتندو کو ابتدائی سینک دیتی تو گاؤں کی لڑکیاں لڑکے اس سے دانے بھونانے آیا کرتے، میں بھی دو چار بھٹوں کے دانے اتار کر چھابے میں ڈالتا اور ماسی الفت کے تندو پر پہنچ جاتا۔

عزیز گاتن سے میری بچپن کی دوستی تھی۔ وہ نالے قد کا چوڑا چوڑا چکدار لڑکا تھا اس کے سر پر ہمیشہ استرا پھرا ہوتا۔ جو کئی دونی اس کی ماں اسے خرچنے کے لیے وہ اپنے کان کے اندر والے کٹاؤ میں پھنسا کر رکھتا۔ اس کی قمیض کو کبھی بٹن نصیب نہ

ہوئے۔ اسی لیے سیاہ گانی والا تعویذ ذرا سا جھکنے پر آگے کوچھو لئے لگتا۔ وہ ایک پاؤں کا پنچہ اندر کو ڈال کر چلتا تھا۔ اسی لیے رات کے وقت اس کی چال میں تھوڑا سا جھلید اپن پیدا ہو جاتا۔

عزیزے گاتن کا اوپر والا ہونٹ پیدائشی کٹا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اسی لیے وہ ہمیشہ ہنستا دکھائی دیتا۔ لیکن میں تو عزیز گاتن کو بچپن سے جانتا ہوں وہ چھوٹی عمر سے غلیظ باتیں سننے کا عادی ہو گیا تھا۔ پرانے بھٹے کے پاس جہاں مائی تو بد تو بہ کی جھونپڑی تھی۔۔۔۔۔ وہاں مجھے اور زمبلی کو لے جا کر وہ ایسی ایسی گالیاں سکھاتا کہ ان کے معنی نہ سمجھتے ہوئے بھی ہم دونوں کے کان جلنے لگتے۔

شاید عزیز گاتن ہنستا نہیں تھا بچپن سے اسے اپنی ماں کے متعلق باتیں سننی پڑی تھیں۔ جب کبھی اس کی ماں کے متعلق گفتگو ہوتی۔ لوگ اچانک ہی بہت بے پروا ہنسوڑ، ننگے اور جنسی ہو جاتے کسی کو خیال بھی نہ رہتا کہ عزیز گاتن سن رہا ہے وہ چونکیل جانور کی طرح ادھر ادھر دیکھتا رہتا۔ ایسے میں اس کے کان میں پھنسی ہوئی اکئی چونی بہت چمکنے لگتی۔۔۔۔۔ پہلے وہ نظروں سے بھاگ جانے کی راہ تلاش کرتا لیکن راہ نہ پا کر کھڑا رہتا۔۔۔۔۔ یوں لگتا جیسے وہ ہنس رہا ہے سب کے ساتھ۔۔۔۔۔ اپنی ماں پر۔۔۔۔۔ ماسی الفت کی ننگی حرکتوں پر۔

شاید اس کی پیدائشی بے بسی تھی جو ہنستی رہتی تھی۔ شاید اوپر والا کٹا ہوا ہونٹ اسے مصنوعی ہنسی ہنسنے میں مدد دیتا تھا۔!

ماسی الفت مونہجداڑو کے زمانے کی پتلی تھی۔ اس کا رنگ بھیٹ میں پکی ہوئی سرخ اینٹ جیسا تھا ہاتھ روٹیاں گھڑنے میں جتنے تیز تھے اتنے ہی چٹائی پر دھرے ہوئے اس کے بھاری کو لے سست تھے۔ وہ ہمیشہ چیپنٹ کی شلوار اور مکمل کا سیاہ کرتا پہنتی تھی شاید بتوں کا اسے بھی خیال نہیں آیا کیونکہ جب کبھی وہ رفیدے پر روٹی ڈال کر تنور کے اندر جھکتی تو گلے سے رسنے والا پسینی اندر جڑے ہوئے پٹیروں پر گرتا

نظر آتا۔ میں نويس جماعت ميں تھا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ ماسی الفت بڑی شے ہے وہ سر پر بھاری کھيس ڈالے روٹياں نکالنے والی سیخ پھرتی سے تندوری ميں ڈالتی۔ ایسے ميں اس کے سست کو لہے کئی زاويے بناتے جب کبھی وہ مجھے چوری چوری اپنی طرف دیکھتا پالیتی تو سادگی سے ہنس دیتی۔ ”لے لو۔۔۔۔۔۔ اب تو حویلی والوں کا قیوم بھی جوان ہو گیا۔“

ماسی الفت کی بہت بکری تھی۔۔۔ اپنی بھی اور روٹیوں کی بھی اس کے گاہک روٹیوں کی قیمت علیحدہ چکاتے تھے اور اس کے لیے الگ نذرانے لاتے تھے لیکن سنا ہے وہ سارا مال جوڑتی رہتی تھی عزیز گاتن کے لیے۔

لیکن یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب چندراں کے باہر سیم نالہ دور سے اُکا کرتا تھا اور گاؤں کی صرف باہر والی زمینیں سیم سے متاثر ہوئی تھیں۔ چندرا سے کچھ دور شور، دلدل اور پھٹے ہوئے کھیت تھے۔ لیکن گاؤں کے ساری طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ لیکن گاؤں کے ساری طرف لہلاتے کھیت تھے۔ جھڑ بیر یوں کو بیر لگتے، نیم کی نمکولیوں سے آنگن بھر جاتے تھے اور سیاہ تنے والے کیکروں پر پیلے پیلے پھول اگتے ابھی چندرا میں برسیم کے کھیت اتنے گھنے تھے کہ عزیز گاتن گنا چوستا اس میں جاتا دھوتی کھولتا اور دوبارہ باندھ لیتا کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے۔؟

آج اگر عزیز گاتن چند را میں ہوتا تو کیا میں اسے سیمی کی محبت کے متعلق کچھ بتا سکتا؟ حالانکہ جب تک میں گاؤں میں رہا۔ ہماری آپس میں کوئی بھید نہ تھا۔ وہ سحراں، بیوں، باکی، جنتے کی محبت کو تو سمجھ سکتا تھا۔۔۔ لیکن سیمی کی محبت اسے اب سمجھ نہ آتی شاید میرے حالات سن کر وہ کہتا۔۔۔ ”اچھا جب وہ تمہارے ساتھ سو لیتی ہے تو باقی کیا تکلیف ہے اور کیا چاہئے تمہیں۔“

اگر میں اسے گاؤں میں مل بھی لیتا تو اس کو اپنی محبت کے متعلق کچھ سمجھانہ سکتا ایسی

محبت جو جلی تقاضوں کی آسودگی کے باوجود آسودہ رہتی ہے جس میں ہر وصل میں ہجر کا مزہ ہوتا ہے جس میں ہاتھ ضرور پڑ جاتا ہے لیکن ایسے ہی جیسے بس میں آدمی ہینڈل کو پکڑ کر سوار ہو جائے اور اندر نہ گھس سکے۔

دیوانگی کی سرحدوں کو چھونے والی محبت کا کچھا چٹھہ میں عزیز گاتن کو کیسے سمجھا سکتا۔۔۔۔

لیکن چاچا فضل کریم کا عزیز گاتن تھا کہاں

ماسی الفت کی انکھ کا تارا جانے کہاں چھپ گیا تھا؟ گاؤں سے اچانک غائب ہو جانے کی بھی عجیب داستان تھی۔

اس روز عزیز گاتن حویلی میں داخل ہوا تو اس کے کان میں دس پیسے کا سکہ چمک رہا تھا اس نے کھدر کی قمیض پہن رکھی تھی اور قمیض کی جھولی اس طرح اٹھا رکھی تھی کہ چار خانے والی تہہ کے ڈب اور ناف صاف نظر آتی تھی

’اوئے قیوم۔۔۔۔‘ اس نے حویلی میں داخل ہو کر آواز دی

کئی عورتوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا ماسی الفت اور عزیز گاتن سارے گاؤں کے لیے تفریح کا باعث تھے۔ پھر اس نے اماں کے تخت پر جھولی کھولی کر کچے پکے پیلو ڈھیر کر دیے ہم دونوں کچے کچے پیلو علیحدہ کرنے میں مصروف تھے کہ چاچا غلام رسول اندر سے نکلا۔

چاچا غلام رسول ابا کا کچھ ہٹاں سا رشتہ دار تھا کیونکہ اماں اس سے کاٹا پرودہ کرتی تھی جس وقت چاچا انگن میں آتا۔ اماں کی ساری کلب منتشر ہو جاتی۔ لونگ والی چوڑے والیاں، چھاج پھلکتی، مسالہ پیستی، آنا گوندھتی، مخلوق میں زلزلہ سا آ جاتا، جیسے اچان فائر سن کر چڑیاں اڑ جاتی تھیں۔ ایسے ہی ترنت عورتیں چلنے لگتیں۔

لڑکیاں سروں پر آنچل کر لیتیں اور جوان عورتوں کو اپنی چادریں یاد آ جاتیں

چاچا غلام اشتہاری مجرم جیسا اشتہاری عاشق تھا شروع شروع میں پان سات

معاشقے چند را میں بھی دھڑلے کے ہوئے لیکن دوکان کی مشہوری سے بہت پہلے بات پھیل گئی کہ سارا سودانا کارہ ہے۔ آنگن میں پہنچ کر عموما چا چا غلام اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا کان کی میل نکالتا۔ کسی چھوٹے بچے کو شیشہ پکڑا کر مونچھوں کے بال تراشتا۔ جو بھی باورچی خانے میں موجود ہوتی اس سے باسی روٹی اور کھن مانگ کر کھاتا اور پھر لال نری کی جوتی میں سے لٹھے کی شلوار جیسی شراق شراق آواز نکالتا، وہ کبھی آنگن میں یہاں جاتا کبھی وہاں۔۔۔۔۔ چا چا بڑا حکمتی آدمی تھا اسے ہر لڑکی ہر عورت کی پرسنل ہسٹری معلوم تھی۔ کون سیدانی کس میراثی کے ساتھ کتنی دیر پھنسی رہی۔ کوئی شینانی کا پانچواں بچہ حرامی تھا کس مغلانی نے اپنے مزارع کے بیٹے سے دوستی لگا رکھی ہے کون سی آرائیں گھر سے اودھل گئی تھی۔۔۔۔۔ ایسے قصے اسے بڑی چٹ پٹی تفصیلوں کے ساتھ یاد تھے۔ ایسی کہانیوں کی وجہ سے جوان لڑکے اس کے پاس بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ وہ جوانوں کو محبت کرنے کے طریقے ایسے سکھاتا جیسے پہلوان اپنے پٹھوں کو داؤ پیچ ازبر کراتے ہیں

ابا نے ہمیں چا چا کی صحبت میں بیٹھنے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ باتیں کیا کرتا ہم کسی نہ کسی بہانے وہیں منڈ لایا کرتے۔۔۔۔۔ باتیں کرتے کرتے وہ یکدم گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔ دراصل جونہی کوئی لڑکی اس کی باتیں سن کر ہنستی ہوئی حویلی سے رخصت ہوتی۔۔۔۔۔ چا چا غلام کو بھی کوئی بہت ضروری کام یاد آ جاتا۔

ابا کو چا چا غلام پسند نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کئی سال ہمارے گھر رہا چا چا غلام کوئی کام نہیں کرتا تھا، لیکن بیگار لینا خوب جانتا تھا۔ ہم نے اسے کبھی ابا کے ساتھ کھیتوں پر جاتے نہیں دیکھا۔ وہ گھر کے کسی کام میں بھی دلچسپی نہ لیتا، لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے ابا اس سے بدکتا تھا۔

پتہ نہیں ابا نے چا چا غلام سے کوئی بڑی رقم پکڑی ہوئی تھی

پتہ نہیں ابا کا کوئی گہرا راز چا چا غلام کے پاس تھا
یا شاید وہ دونوں کسی جرم میں شریک رہے تھے؟

ہم چھوٹے تھے ہمیں اصلی وجہ معلوم نہ تھی۔ لیکن ہم دیکھتے کہ چا چا کی تھالی میں
ہمیشہ بوٹیاں زیادہ ہوتیں۔ اسے ملائی مکھن اور پراٹھوں کے علاوہ مکھن میں تلے
ہوئے انڈے بھی ناشتے پر ملتے۔ اس کی چارپائی پر کڑھے ہوئے تکیے کے غلاف
رہتے جب بھی وہ کوئی فرائیش کر دیتا تو پھر اماں اور ابا اسے ضرور پوری کرتے۔ ابا چا
چا غلام کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس کا خیال بہت رکھتا تھا۔

عزیز گاتن اور میں صبح میں اماں کے تحت پوش پر پیلو علیحدہ کر رہے تھے کہ ٹانے
کی دھوتی اور لیس لگا کرتا پہنے چا چا غلام اندر سے نکلا۔ چند منٹوں میں آنگن خالی
ہو گیا۔ صرف باورچی خانے میں دو عورتیں ہماری طرف پشت کیے بیٹھی آتا گوندھتی
رہیں۔۔۔۔۔

عزیز گاتن اس روز بہت خوش تھا

”دنیا داراں دے گھر دینا بیٹے ولی الہی۔ ولیاں دے گھر پیدا کر دامیرے
وانگ گناہی۔۔۔۔۔“ زور زور سے عزیز یوسف زلیخاں گارہا تھا کہ پیچھے سے آکر چا
چا غلام نے اس کی گدی میں دھول ماری۔ عزیز گاتن کی آنکھیں یکدم خوف سے کھلی
ہو گئیں۔۔۔۔۔ اماں تو بتو بہ سے بھی زیادہ ہم چا چا غلام سے ڈرتے تھے۔

”اوئے تیری ماں کو کچھ عقل ہے کہ نہیں؟۔۔۔۔۔ پلید کہیں کی۔“

عزیز گاتن مسکرانے لگا

جب بھی عزیز گاتن سنجیدہ ہو جاتا، ایسے لگتا کہ مسکرا رہا ہے کیونکہ اس کے اوپر
والے ہونٹ میں پیدا آئی شگاف تھا اور منہ سختی سے بند کرنے کی صورت میں وہ مسکراتا
ہوا نظر آتا۔

عزیز گاتن اپنی ماں کے متعلق بہت سے باتیں سننے کا عادی تھا ماسی کو بیوہ ہوئے

چھ سال ہوئے تھے۔ وہ بالکل آزاد تھی اور اسے اپنی آزادی بڑی پیاری تھی۔ عزیز گاتن تو باتیں سن کر مسکرا نے لگتا۔ لیکن میرے ہاتھوں میں پسینہ آ جاتا۔

”اوائے بول تیری ماں ہے ناں اجڈ گنوار ناپاک“

گاتن چپ چاپ سنتا رہا۔

”سن رہا ہے میری بات بل بھٹیا؟“

”جی۔“

پتہ نہیں کیوں میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

”محرمی! اپنی فیشن کی ماری ہوئی ماں کو کہنا، پہلے جسم کی صفائی سیکھے۔۔۔۔۔ بتانا

اسے جسم کے بال ناپاک ہوتے ہیں اسے میرا یقین نہ آئے تو جا کر ملا جی سے پوچھ لے جس میں۔۔۔۔۔ ویسے تو اسے بڑے مسئلے آتے ہیں جسم کے بالوں کا مسئلہ نہیں

”اٹا کو ڈوکو۔۔۔۔۔؟“

”اچھا جی کہہ دوں گا۔“

عزیز نے ہاتھ میں چنے ہوئے پیلو تخت پوش پر رکھ دیے۔ اس سے پہلے کئی بار میں نے اسے لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا تھا لوگ اس کے منہ پر اس کی ماں کو گالیاں دیتے، لیکن وہ کبھی چپ نہ ہوا تھا۔

پہلی بار بل بھٹیا کے چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔

چاچا غلام نے مٹھی بھر کے پکے پکے پیلو اٹھائے اور باورچی خانے کے ڈھارے کی جانب مڑ گیا۔ گاتن نے کچھ نہ کہا گلے کے تعویذ کو میض کے اندر کیا اور باہر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ خود ہی لوٹ آئے گا لیکن اس روز کے بعد اسے کسی نے گاؤں میں نہیں دیکھا۔۔۔۔۔ کچھ دن ماسی الفت نے اس کی تلاش کی پھر ایک دن اس کی ماں نے گلہ اپنے گاہکوں کو دھنوس دے دے کر جمع کیا تھا تندور کے دہانے پر مار کر توڑا اور بڑکے کے درخت تلے سارے روپے اٹھنیاں چونیاں

دس پیسے نوٹ یوں پھینکے جیسے عزیز گاتن کی برات پر سے سوٹ کر رہی ہو۔ وہ پیسے پھینکتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔۔۔۔۔ ”اتھا لو کتو۔۔۔۔۔ اٹھا لو۔۔۔۔۔ میں نے عزیز گاتن پر وارے اٹھا لو،،،،“

اس شام میں پرانے بھٹے پر ہمبلی کے ساتھ غلیل لے کر شکار کے لیے گیا ہوا تھا جب شام پرانے لگی اور ہم نے گھر لوٹنے کا ارادہ کیا تو میں نے دیکھا کہ چندرا کی طرف سے ایک بڑا سا گدھ بھاگتا ہوا آیا اور سیم نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اس گدھ نے خاکی رنگ کے کھیس کی بکل مار رکھی تھی اور پیروں میں کچھ نہ تھا۔

پھر راجہ گدھ سیم نالے کے ساتھ گرتا پڑتا چلنے لگا۔ کبھی کبھی اس کے دونوں بازو آپنی آپ آسمان کی طرف اٹھ جاتے اور پھر بغیر ٹھوکر کھائے گر جاتا۔۔۔۔۔ کچھ فاصلے تک میری نگاہوں نے اس راجہ گدھ کا تعقب کیا اس کے بعد ماسی الفت ہمیشہ کے لیے افق میں کھو گئی۔

اچانک ماسی الفت اور عزیز گاتن کے غائب ہونے پر اور تو کچھ نہ ہوا، صرف چندرا گاؤں کے باہر پھیلنے والا کمر گاؤں کے اندر بڑھنے لگا ہر آندگی کے ساتھ ہر بارش کے ساتھ۔۔۔۔۔ ہر موسم میں اس رفتار تیز تر ہونے لگی۔ اونچے اونچے درخت مند مند ہوئے۔۔۔۔۔ کھیتوں میں لہلہاتے سبزے کی جگہ دلدل، شورا اور نمکین پانی کے جوہر بننے لگے۔ کنوئیں کھاری ہو گئے۔ ہتھی والے نلکوں کی نالوں پر قلمی شورا چڑھ گیا۔ گھروں کی دیواروں سے کلر جھڑنے لگا۔۔۔۔۔ فرش پھول گئے۔ چاگائیں ڈھیلی ہو گئیں۔ زنجیروں پر تگ جھڑنے لگا۔ اور آدمیوں کے چہرے پرانے سکے جیسے گھسے ہوئے نظر آنے لگے۔

اب رفتہ رفتہ لوگ گاؤں چھوڑ کر جانے لگے۔۔۔۔۔ گھروں کے چولہے سرد پڑ گئے اور راستوں کی پھولی ہوئی مٹی پر جانور، چھکڑے، ریڈھے تانگے سامان سے لد لد کر جانے لگے۔ اب پیلو کا بور جھڑ جاتا۔ کیکر کے درختوں میں زرد پھول نہا گتے۔

جب میں ماموں کے پاس قصور گیا ہوں۔ اس سے کچھ پہلے سارے گاؤں میں
کھرنے دھاوا بول دیا تھا۔

ٹرین آئی میں سوار ہو گیا چندرا کے پاس سے پرانے بھٹے کے عقب میں مائی توبہ
توبہ کی جھگی سے لے کر اندر تک کھر کا سیلاب تھا۔ ساری زمین انڈے کی سفیدی جیسی
پھینٹی ہوئی تھی جس وقت چندرا کی حد ختم ہوئی میں نے دیکھا دو اونچے درختوں پر کئی
گدھ بیٹھے تھے، نیچے سیم نالے کے پاس ایک بھینس کا ڈھانچہ پڑا تھا۔

شام اتر رہی تھی۔ ہوا میں نمک تھا
پتہ نہیں مجھے کیوں لگا جیسے ایک درخت سے تیزی کے ساتھ ایک گدھ اتر اور
ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ اس گدھ کو غور سے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں
تھی۔ لیکن وہ گارہا تھا۔ بھاگ رہا تھا۔ ٹرین کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر بہر اونچے
اونچے

صبح گیارہ بجے میری آنکھ کھلی تو ابھی تک میں چندرا میں تھا۔
دانت صاف کرتے ہوئے مجھے خیال آنے لگا کہ کسی نوکری پر لگنے سے پہلے
مجھے ایک بات پھر چندراں جانا چاہیے شاید اماں کی قبر کسی نے پکی کروادی ہو۔ شاید
کھر کی وجہ سے قبر پھٹ گئی ہو اور اماں کا ڈھانچہ چاندنی راتوں میں ڈراؤنا لگتا ہو۔
پتہ نہیں بھائی مختار چندرا جانے پر کبھی رضامند کیوں نہ ہوتے تھے۔۔۔ میں ابھی
دل میں یہ پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ کسی نے غسل خانے پر دستک دی عام طور پر اوپر
آنے کا رواج کم تھا

”قیوم“۔۔۔۔۔ بھابھی صولت نے آواز آئی۔

میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانک ا

”کہیں جا رہے ہو؟“

”جی ریڈیو سٹیشن جاؤں گا۔“

”اچھا؟۔۔۔۔۔“ وہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ مجھے وہاں کیا کام ہے لیکن میری ان کی بے تکلفی نہ تھی۔

”جی۔۔۔۔۔ وہاں مجھے آج ایک سکریپٹ دینا ہے۔“
”سکریپٹ؟“

ریڈیو سٹیشن میں ان دنوں میرا ایک دوست پروڈیوسر لگا ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ بچوں کا پروگرام پروڈیوس کرتا تھا۔ وہ مجھ سے عموماً معلوماتی سکریپٹ لکوالیتا۔
”ایک کہانی لکھی ہے بھابھی ٹیپو سلطان پر۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ یہ میری ڈرائی کلیمز کی چٹ ہے چار روپے رنگنے کے لیے دیئے ہوئے ہیں بانوبازار میں وہ لے آئو گے نا۔“
”لے آؤ گا۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“

انہوں نے دس روپے کا نوٹ ڈرائی کلیمز کی رسید کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔
”نو کری کا کچھ پتہ چلا؟“

”ابھی انٹرویو کے لیے طلب نہیں کیا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ دوپٹے کھول کر دیکھ لینا کہیں ڈب وغیرہ نہ ہوں۔“

بھابھی صولت جس لا تعلقی سے آئی تھی ویسے ہی چلی گئیں۔ ان کا میرا بھابھی دیور کا رشتہ نہ تھا۔ چورسپاہی کی طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے بھاگتے تھے۔

جونہی سیمی سے اچانک کنارہ کشی ہوئی تھی۔ میں کبھی کبھی ریڈیو سٹیشن سعید کے پاس جا بیٹھتا۔ اس کے کمرے میں بڑی رونق ہوتی۔ افسر، ڈرامہ آرٹسٹ، مراٹی، طوائفیں اناؤنسر اتے جاتے رہتے۔ چھوٹے موٹے اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ سعید مجھ سے کبھی کبھی کوئی فچر کوئی اناؤنسمنٹ کوئی کہانی لکھوا لیتا۔۔۔۔۔ بھابھی یا بھائی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے یہ بہتر طریقہ تھا۔ کیونکہ فی

الحال میں ذہنی خواری سے ملتا۔ منت سماجت بھی کرنی پڑتی، لیکن میری آزادی میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔

بھابھی کے دس روپے اور چٹ اٹھا کر میں پیدل کرشن نگر تک پہنچا۔ وہاں سے میں نے سکرٹریٹ تک بس لی۔ چونکہ یہ بس مال پر نہ جاتی تھی اس لیے یہاں سے میں ریڈیو سٹیشن پیدل پہنچنے کا عزم کر کے مال پر چلنے لگا۔ بڑی دیر بعد مجھے پیدل چلنے میں عجیب قسم کی راحت محسوس ہوئی۔ چلنے کی مکینکل انرجی نے خیالات کی چھان پھٹک میں واضح طور پر مدد دی بڑے دنوں بعد مجھے اپنا وجود ایک نارمل صحت مند شہری کا لگا اس وقت میرا سایہ میرے بھائی مختار کے خود اعتماد سائے سے مشابہہ تھا۔ بیسی کا عشق ضرور اپنی جگہ تھا لیکن ذمہ دار شہری کی طرح ان جذباتی مسائل کو سلجھانا میرے بس کی بات تھی۔ اس وقت مجھے کئی پلان سوچھے جس وقت میں جی پی او کے سامنے سے گزر رہا تھا تو چوک بتی کے سامنے انتظار کرتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مقابلے کے امتحان میں داخلہ لینا ہوگا۔ اس وقت یہ امتحان مجھے بہت آسان نظر آیا۔ اپنے وہ دو پروفیسر یاد آ گئے جو بالکل نالائق تھے اور اس امتحان کو پاس کرنے کی وجہ سے آج کل اسلام آباد کے فیڈرل سکرٹریٹ میں بہت بڑے سفید کار عہدوں پر متعین تھے ریگل کے چوک تک پہنچتے پہنچتے میں بہت جاہ طلب ہو چکا تھا میری سوچ یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ میں سویڈن ہالینڈ یا سپین میں اپنے آپ کو ایم بی بی میں فیسٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز دیکھ سکتا تھا۔ میری ڈاک پاکستان ایم بی بی کے تھیلے میں آ جا رہی تھی اور میں جینوا پیرس فرینک فرٹ شاک ہوم سے پکچر پوسٹ کارڈ خرید خرید کر وطن بھیجنے میں مشغول تھا جس وقت میں واپڈا کی بلڈنگ کے پہلے سے نکل کر فلیٹی ہوٹل والی سڑک پر نکلا کار میں بیٹھی ہر خوبصورت لڑکی مجھے اپنی بیوی نظر آئی اور بڑی کار پر اپنی ہونے کا شبہ ہونے لگا۔

ریڈیو سٹیشن سے پہلے چوک میں پہنچتے پہنچتے میں اپنے آپ کو جسمانی، ذہنی،

جذباتی طور پر صحت مند سمجھ رہا تھا اس وقت مجھے شبہ بھی نہ تھا کہ راجہ گدھ کی جاتی سے کوئی بھی زیادتی وقفے تک صحت مند نہیں رہ سکتا۔ پاگل پن اس پر Quanta میں بڑھتا رہتا ہے جب بھی وہ اپنے نیوکلس کے قریب ہوتا ہے اسے شبہ بھی نہیں گزرتا کہ غیر صحت مند عناصر اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں ذرا سا وہ نیوکلس سے ہٹتا ہے اور وہی سراسیمگی وہی دیوانگی ہی دشت نوردی صحرائیائی جو اس کے اندرونی سفر کا حصہ ہے اس پر غالب آ جاتی ہے

ریڈیویشن پہنچ کر حسب معمول میں سعید کے دفتر میں چلا گیا۔ وہ کچھ فلمی گیتوں کی ڈسکیں اٹھائے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کرسی پر سیمی بیٹھی تھی۔۔۔ سیمی کے ساتھ والی کرسی پر حیدر تھا اور ان کے ساتھ پروفیسر سہیل چائے پینے میں مشغول تھے

”اوسر جی آؤ۔۔۔ آؤ آؤ۔۔۔ سعید نے پرتپاک لہجے میں کہا۔“

میں ہلکے سے اشارے سے سیمی کو سلام کیا

”آج تمہاری کہانی یہ پڑھیں گی۔۔۔ سکرپٹ لکھ لائے ہو۔۔۔ پہلے مباحثہ ہوگا، پروفیسر سہیل اور حیدر صاحب کے درمیان پھر۔۔۔“

”ہاں۔“

”انہیں دے دو۔۔۔ ذرا ایک نظر اس پر ڈال لیں۔“

میں نے کہانی سیمی کے سپرد کر دی۔ اس نے اپنے چہرے سے گلابی چشمہ اتارا۔ پھر کرسی کی پشت سے لٹکے ہوئے تھیلے میں سے پڑھنے کی عینک نکالی اور کہانی پڑھنے لگی۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ دلی ہو گئی تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں تلے گہرے سیاہ حلقے تھے اور ہونٹوں کا رنگ کاسنی نظر آتا تھا۔ ہاتھوں کی نیلیں بہت ابھری ہوئی تھیں اور کہانی کا سکرپٹ پکڑتے وقت اس کا ہاتھ تھوڑا سا لرزتا تھا۔

پتہ نہیں میری خوچ اعتمادی ساری کی ساری کہاں گئی۔

”میں ذرا سٹوڈیو کا چکر لگا آؤ۔۔۔۔۔“ سعید یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔۔۔۔۔ اور

پروفیسر سہیل لالعلقی سے چائے پیتے رہے انہوں نے مجھ سے کوئی بات ہی نہ کی،
جس وقت میں گھر پہنچا تو وہ پہلے سے میرے کمرے میں موجود تھی۔ اس نے بال
دھور کھے تھے اور پانی کی ننھی بوندیں اس کالی شال پر چمک رہی تھیں۔

’یہ وقت ہے گھر آنے کا۔‘

میں نے ہنس کر کہا..... ’یہ وقت ہے سر دھونے کا اور وہ بھی سردیوں میں۔‘
وہ ایک ہی جملے سے سیدھی ہو گئی۔

کہاں رہے ہو سارا دن؟‘

’پہلے ریڈیو ٹیشن گیا تھا۔ وہاں سے پروفیسر سہیل کے پاس چلا گیا۔‘

’یہ مرجانا سہیل کون ہے اب؟‘

’ہے ایک پڑھا لکھا آدمی..... بے حد..... پاکستان میں اس جیسا دوسرا کوئی
نہیں۔‘

’پڑھا لکھا ہی ہے نہ کہ آدمی بھی ہے؟‘

میں اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول ہو گیا اور وہ چپ چاپ مونگ
پھلیاں کھانے میں جت گئی۔ اچانک مجھے الماری میں ایک موم بتی نظر آ گئی۔ میں
نے اس کا سنی رنگ کی موم بتی کو روشن کیا۔ اس کے سامنے کاسی رن کا گڈی کا غد
کتابوں کی مدد سے کھڑا کیا اور بجلی کا بٹن بند کر دیا۔

’ہائے یہ کیا اندھیرا کر دیا قیومی؟‘

’دیکھو یہ کاسنی روشنی کتنی پیاری ہے عابدہ۔ اسی روشنی میں چائے پیئیں گے۔‘

اب وہ اپنے اور وحید کے بے مزہ واقعات بیان کرنے لگی۔

ایک روز وحید نے کیا کیا، ایک بیڈ اور لیپ خرید کر لایا۔ کسی فلم میں دیکھا تھا

اس نے کہ ہیرو بیڈ لیپ جلا کر پڑھتا ہے۔ گھر آ کر اس نے ساری شام بیڈ لیپ

فٹ کرنے میں لگ دی۔ تین سو بج بدلے۔ دو بلب فیوز کیے۔ جب بیڈ لیمپ فٹ ہو گئی تو اس کی روشنی میں بیٹھ کر حساب کتاب دیکھنے لگا..... بد بخت کا چھوٹا سا چہرہ ہے اوپر سے..... رکھی ہوئی ہیں لمبی لمبی راجپوتی مونچھیں..... تو بہ بیڈ لیمپ کے سامنے تو پورا پورا لدھر لگتا تھا بیٹھا ہوا۔“

آج میں سیمی کے متعلق باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن میں نے صرف مدافعت کے طور پر کہا..... جب آفتاب لندن چلا گیا عابدہ تو سیمی پر حسد کا دورہ پڑ گیا۔ وہ سارا سارا دن ایسے خیالوں سے اپنے آپ کو لہو لہان کرتی رہتی تھی جو آفتاب اور زیبا سے متعلق ہوتے..... آدمی کتنا اذیت پسند ہے۔“

جب آفتاب نے شادی ہی کر لی تھی تو پھر سیمی کو تم سے شادی کر لینی چاہیے تھی۔ میں خلاف ہوں ایسی باتوں کے۔“
 ”وہ شادی نہیں محبت کی آرزو مند تھی۔“

”ہائے شادی کا محبت سے کیا تعلق..... کسی نکاح نامے پر کبھی تم نے دیکھا ہے محبت کا خانہ معجل اور غیر معجل کا تو ہوا ناں خانہ۔“

”اگر شادی لائسنس بناتا تو تین قسم کے نکاح نامے ہوتے۔ سفید نکاح نامے ان لوگوں کے لیے جو دن رات ایک دوسرے کے قرب کی آرزو رکھتے ہیں۔ گلابی کارڈ دنیاوی وجوہات والوں کے لیے مثلاً تنہائی سے بچنے کے لیے ماں باپ کی ناک بچانے کے لیے..... وغیرہ وغیرہ اور سبز کارڈ صرف ان کو دیا جاتا جو افزائش نسل کے لیے لائسنس چاہتے ہیں۔ صرف سبز کارڈ مستقل ہوتا، باقی سب کارڈ سال دو سال کے بعد renew کرانے پڑتے۔“

”لائسنس سب سفید رنگ کا ہوا تے اور بچے سب کے ہو جاتے پھر..... نئے منہ ایسی سوچ پر۔“ وہ کھکھلا کر ہنس دی۔

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ کاسنی گڈی کا غزموم جی کر طرف جھک کر ہلکا سا جھلس گیا

تھا۔ لیکن کمرے کی روشنی اس وقت بڑی دل فریب تھی۔ میرا دماغ خود بخود دھیل کی باتوں سے گونجنے لگا۔

”بھائی صاحب محبت نہیں ملتی کہیں بھی چاہیے سفید کارڈ بناؤ چاہیے گلابی..... دنیا میں تو گزارہ ہی کرنا پڑتا ہے اور گزارے کے لیے شادی اچھی ہے۔“ اس نے مجھے مشورہ دیا۔

میں نے چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لی اور قریباً اپنے آپ سے بولا۔
”تمہیں کیا پتہ عابدہ..... شکر کرو شکر، تم سوچتی نہیں ہو۔ وجوہات تلاش نہیں کرتی ہو۔ معنی کی جستجو..... نہیں کرتی ہو ورنہ تمہیں بھی سورج کے ارد گرد کئی غلاف نظر آنے تھے۔“

”اب کیا سوچ رہے ہو..... موم بتی بجھا دوں کہیں آگ نہ لگ جائے۔“
”لگ جانے دو آگ۔“

ایسے جملوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا وہ کند چھری سے حلال ہونے والی نہ تھی۔
”میں نے تو محبت کے متعلق کبھی زیادہ نہیں سوچا۔“ عابدہ بولی۔
”اور میں اس کے علاوہ اور کسی چیز کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔“
”پھر کیا سوچا ہے تم نے آج تک؟“

”یہی کہ دولت اور محبت کی ایک سی سرشت ہے۔ دولت کبھی ان جانے میں چھپر پھاڑ کر ملتی ہے۔ کبھی وراثت کا روپ دھار کر ایسے ڈھب سے ملتی ہے کہ چھوٹی انگلی تک ہلانی نہیں ہوتی اور آدمی مالا مال ہو جاتا ہے۔ پھر اکلوتے لاڈلے کی طرح دولت کو اجاڑنے پر باد کرنے میں مزہ ملتا ہے۔ کبھی پانی پانی جوڑتے رہنے پر بھی پورا روپیہ نہیں ہوتا۔ کبھی محبت اور دولت ملتی رہتی ہے لیکن سیری کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ چادر پوری نہیں ہوتی تن پر..... کبھی محبت رشوت کے روپے کی طرح ڈھکی چھپی ملتی ہے لوگوں کو پتہ چل جائے تو بڑی تھڑی ہوتی ہے۔ کبھی

کاسے میں پڑنے والی اکئی دونی کی خاطر ساری عمر تیرا بھلا ہو کہنا پڑتا ہے۔ تجھے کیا پتہ عابدہ محبت اور دولت نے انسانی دل پر کیا کیا حکمرانی کی ہے۔ چاہتے تو سیلاب کی طرح بستی اجڑ جائے، ان کے ہاتھوں چاہتے تو بوند بھرہ بر سے اور ریگستان کے اوپر سے گرجتی چمکتی چلی جائے..... ان سگی بہنوں سے تو جس قدر ناطہ کم ہو آرام ہے۔“

کاسنی کاغذ مجلس کر کالا ہو چکا ہے۔ عابدہ اٹھی اور سانس کی لمبی پھونک سے اس نے موم بتی بجھا دی۔ از سر نو بجلی کا بلب جلنے لگا۔

”قیوم تمہیں کسی دماغی ڈاکٹر سے ملنا چاہیے۔“

”کیوں؟“

”مجھے یوں لگتا ہے تمہارے سر کو گرمی ہوگئی..... ہے۔“

”تمہارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔“

”میری اماں ایک پھنکی بنایا کرتی تھیں۔ بادام کی گریاں چارو مغز، سونٹ۔ چھوٹی

الانچی مصری.....“

”تم کچھ نہیں بنا سکتیں؟“

”میں کیا کر سکتی ہوں..... مجھے وہ نسخہ ہی نہیں آتا۔“

”میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ تم شکلی ہو..... تم مجھ زبل کو طاقت دے سکتی

ہو۔“

”کیسے؟“

اس وقت تک مجھے علم نہ تھا کہ میں سہیل کی باتوں کو عابدہ سے دہراؤں گا۔ مجھے

تو یہ بھی علم نہ تھا کہ عابدہ اور مجھ میں کوئی رابطہ ممکن بھی ہے؟

”مرد اور عورت کے درمیان آٹھ قسم کا لگاؤ ہوتا ہے اور ہر لگاؤ سے انسان کو ایک

خاص قسم کی شکلی ملتی ہے۔“

وہ حیرانی سے میرا منہ تکتے لگی۔

”پہلا تعلق خیال کا ہے..... جب کسی کا خیال دماغ میں بس جاتا ہے اور نکالے نہیں نکلتا تو اسے سرنا نام کہتے ہیں۔ جب اس تعلق کا ذکر کسی سے کریں تو یہ دوسری سیلج ہے۔ جنس لطیف کی صحبت میں رہنا تیسرا تعلق ہے۔ عورتوں کے ساتھ ہنسی دل لگی چوتھا..... عورت سے دلی گفتگو کرنا پانچویں سیلج ہے۔ اس کے بعد جسمانی تعلق کی آرزو چھٹی حالت ہے۔ اس آرزو کو ارادے سے پختہ کرنا ساتواں تعلق ہے اور آخری اور مکمل سیڑھی وہ ہے۔ جب شوجی اور شکتی ملتیک ہیں اور ایسی روح کو جنم دیتے ہیں جو نہ مرد ہوتی ہے نہ عورت۔“

”ہائے ہائے کہیں باتیں کرنا بھی گناہ ہی نہ ہو.....“ وہ کرسی سے اٹھی۔ چھلکے مونگ پھلی کا لفافہ ایک چھنا کے سے فرش پر گرا، میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی چادر پکڑی اور بولا..... ”بیٹھ جاؤ“..... آرام سے مرد اور عورت جب سچے دل سے پریم بھگتی کرتے ہیں تو پھر وہ گناہ نہیں کرتے بلکہ اپنی کنڈالنی کو آزاد کراتے ہیں۔“

”وہ بد بخت کیا چیز ہے؟“

عابدہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

”انسان کے جسم کا ایک حصہ نظر آتا ہے اور دوسرا حصہ نگاہوں سے اوجھل ہے ہمارے غدودی نظام کے ساتھ ساتھ طاقت کا ایک اور وجود بھی چلتا ہے، یہ وہ سر چشمہ طاقت ہے جو آدمی کی orative everygy کہلاتا ہے۔“

”یہ ساری باتیں تم کتابوں سے سیکھتے ہو؟“

”کچھ کتابوں سے کچھ تبادلہ خیالات سے۔“

”بند کردوان دونوں کو۔“

”کیوں؟“

”لادین ہو جاؤ گے دیوانے ہو جاؤ گے سچی۔“

وہ میرے سامنے لب سکیڑ کر بیٹھی تھیا ایسے لگتا تھا جیسے وہ ابھی رونے لگے گی، ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے پھر وہ بولی..... یہ کنڈالنی چنڈالنی کون ہے؟“

” واقعی یہ کنڈالنی ہی چنڈالنی ہے..... یہ وہ سانپ ہے جو ہمارے مقعد اور عضو تناسل کے درمیان استراحت کرتا ہے۔“

”ہائے میں مری۔“

’دوبی کنڈالنی کی قوت آہستہ آہستہ اوپر کو سر اٹھانے لگتی ہے پھر ایک چکر تک پہنچتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے سر تک پھن اٹھا کر جا پہنچتی ہے اس کو کنڈالنی کے سفر میں انسانی کی بقایا فنا ہے..... وہ کس سطح تک پہنچتا ہے اور کیوں پہنچتا ہے۔ یہ سب ارتقا کنڈالنی کی وجہ سے ہے۔“

”یہ..... چکر کیا ہے؟ تمہیں آج کیا ہو گیا ہے.....“ وہ محبوب سی ہو کر میرے پاس بیٹھ گئی۔

”پہلا چکر مقعد اور آلات تناسل کے درمیان ہے۔ اسے مولادھارا کہتے ہیں۔ اس کی چار سرخ پیتاں ہیں۔ اس کے درمیان میں ایک مربع زمین کی علامت ہے۔ اس مربع کے اندر ایک تکنون ہے جس میں تمام psyclie energy بند ہے جسے کنڈالنی کہتے ہیں۔ اس کنڈالنی نے سانپ کی مانند ریڑھ کی بنیاد پر چکر بنا رکھا اور اس کنول جیسے چکر میں چمکتی ہے، بتیوں کی طرح روشن ہے جو شخص اس جگہ پر دھیان لگاتا ہے وہ آرزو، حسد، غصہ پر قابو پا سکتا ہے۔“

تجھے تو کچھ ہو گیا ہے فیومی خدا قسم۔“

” اور کچھ نہیں تو بات ہی سن لو عابدہ۔“ میں نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ دراصل مجھے سہیل نے اس قدر پمپ کر دیا تھا کہ میں ساری گیس کسی اور ذی روح پر نکالنا چاہتا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا عابدہ میری باتیں سننے کی عادی نہیں۔ اگر وہ سن بھی لے، تو ان کا ادراک اس سے ممکن نہیں پھر بھی بولتا گیا۔

”سوا دھس تھانہ دوسرا چکر ہے۔ اس کی چھ سرخ پنکھڑیاں ہیں۔ درمیان میں ایک سفید ہلال ہے اور پانی کے عنصر کی علامت ہے۔ یہ آلات تناسل کی جڑ میں ہوتا ہے اگر یہاں دھیان لگایا جائے تو انسان ostral worlds میں بسنے والوں سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔“

اب عابدہ مکمل طور پر مجھ سے علیحدہ ہو چکی تھی۔

”آج صبح میں ہسپتال گئی تھی، ڈاکٹر نے کہنے لگی۔ تم میں کوئی نقص نہیں۔ تم اپنے میاں کو لاؤ..... بتاؤ قیوم و حیدمانے گا اس بات پر؟“

ہمیشہ کی طرح ہم دونوں الگ الگ بٹری پر چلنے لگے۔

”ناف کے پیچھے ایک سرخ نانچی تکیونی ہے۔ صاحب نظر لوگوں کو اس مقام کا رنگ گھنیرے بادلوں جیسا نظر آتا ہے۔ اس کے وسط میں نارنجی سرخ رنگ کا تکیون ہے جس کے تکیوں طرف سوا ستکا کا نشان ہے۔ یہ جگہ آگ کے عنصر سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس جگہ کو منی پورا کہتے ہیں اور اس solar plaxus پر توجہ رکھنے سے انسان پر دوسرے لوگوں کی شعوری اور غیر گھتیاں آپنی آپ کھلتی جاتی ہیں۔ اسی مقام پر دھیان لگانے والے جلتی آگ پر چلنے کی شکتی رکھتے ہیں۔“

”تم میری بات کیوں نہیں سنتے؟“

”تم بھی تو میری بات سنو نا..... میں نے ضد سے کہا۔

”تم کو تو کچھ کر دیا ہے اس چند النی سیسی نے۔“

”تم کو بھی کچھ ہو چکا ہے لیکن میں نہیں جانتا کرنے والا کون ہے؟“

”سنو قیومی!“

”سنو عابدہ!..... میں جستجو کی بات کر رہا ہوں اپنی جستجو..... اپنی بقا کی.....

انسان کو تلاش ہے..... اپنی..... اپنے خدا کی۔“

’بقا تو صرف بچے میں ہے قیومی..... جن کے سچے نہیں وہ مر جاتے ہیں جن کے

لیے بچے ہوتے جاتے ہیں وہ زنجیر میں پروئے جاتے ہیں ان کا نام رہتا ہے نسل
رہتی ہے۔“

”تم صرف جسم کے بقا کی سوچتی ہو۔“

”جسم نہ ہوا تو روح کس مکان میں رہے گی..... ہمارا تو بونا ہی نہ لگا..... لاکھ

دفعہ کہا میں نے وحید سے کہ تم علاج کروالوں..... پر مانے بھی وہ خبیث۔“

”منو عابدہ..... جب کنڈالنی چوتھے چکر میں پہنچتی ہے تو اسے انا ہاتا کہتے ہیں۔
یہ دل کا کنول ہے۔ اس کا رنگ گہرا سرخ ہے۔ اس میں عارفانہ بارہ ستے ہیں۔
اس کنول کے وسط میں دو تکیوں ہیں۔ اس میں ہماری ذات چراغ کے شعلے کی طرح
رہتی ہے یہ شعلہ آبشاروں جیسی ہے یہاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھلاہٹ چاندی کی
زنجیریں سر کی ہوئی بانسری گھنٹیاں..... بڑے بڑے ٹمک اور مرونگ بجتے ہیں۔
کائنات کی صدا یہاں سے آسکتی ہے۔ ہوا کے عنصر پر اس کا مدار ہے۔ اگر آدمی
یہاں دھیان لگائے تو اس میں کئی روپ دھارنے کی شکتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ
کائناتی محبت پانے والا بن جاتا ہے۔ اسی راستے پر وہ نروان بھی حاصل کر سکتا
ہے۔“

”اور میں تم کو کیا بتا رہی ہوں۔؟ ڈاکٹر نے کہا رہی تھی۔ دو تین معمولی ٹیسٹ
ہیں۔ کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی..... لیکن وحید کو رضا مند کون کرے گا..... میں
بھابھی صولت سے کہوں؟..... بتاؤ ناں؟“

مجھے وحید اور وحید سے جنم لینے والی اولاد میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

”ریڑھ کی ہڈی کے راستے ہم پانچویں چکر پر پہنچتے ہیں۔ اسے وشودھا کہتے
ہیں۔ یہ طاہر طیب پاک مقام ہے۔ یہاں سے ازلی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ گلے
میں جہاں ریڑھ کی ہڈی دماغ سے ملتی ہے۔ واقع ہے۔ اس چکر کی روشنی پورے
چاند جیسی ہے جو بھی thyroid glands پر توجہ دے وہ جوگیوں میں شہزادہ بن کر

رہے گا اور عقل و دانش میں مقدس علم کا پاسبان ہوگا۔“

”اگر بالفرض وحید نہ مانے..... تو یہ بتاؤ مجھے طلاق لے لینا چاہیے ناں؟ اس کی

وجہ سے میں بچے کے بغیر کیوں رہوں؟“

”عین دونوں ابروؤں کے وسط میں جہاں کائناتی مشاہدے کیلئے تیسری آنکھ

ہے۔ یہاں چھٹا چکر ہے۔ سردیوں کے چاند جیسی روشنی سے منور یہاں دو بڑے

بڑے پنکھ ہیں۔ جو سچائی کا مظہر ہیں۔ یہاں پردھیان کرنے والے کو اس کے سچے

گرو کی آواز آنے لگتی ہے۔“

جب پران جسم چھوڑتے ہیں تو اس جگہ دھیان لگانے والے کی روح پچھلے تمام

جنم کے کرموں سے آزاد ہو کر خالق سے جا ملت پیے، یہ وہی جگہ ہے جہاں

pitutay gland ہے۔“

”تم کو..... سوائے اپنے کسی کی پروا ہے..... قیومی؟“

”نہیں۔“

”تم کیا سمجھتے ہو میں یہ تمہاری بکواس سن رہی ہوں؟“

”نہیں۔“

”پھر نعوذ باللہ کیوں ایسی بکواس کر رہے ہو۔“

”شاید..... کہیں سکون ہو..... تلاش سے..... جستجو سے..... شاید کہیں ان سوالوں

کا جواب ملے جو میرے دل میں رات کے وقت آتش بازی کی طرح چھوٹتے

ہیں۔“

”آیۃ الکرسی پڑھ کر سو یا کرو ہر رات“

”آخری چکر..... کنول کا ایسا پھول ہے جس کی ایک ہزار پتیاں ہیں۔ یہاں شکتی

اور شوا کا میل ہوتا ہے..... اجتماع ضدین ہوتا ہے۔ چاند سورج کا ملاپ، بجلی اور

مقناطیس کا شوگ..... یہ سر کا قطبی حصہ ہے..... اور نچلے چھ کے چھ چکر اس کے تابع

ہیں..... ایک رنگت شروع شروع میں زرد ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہیرے جواہرات کی طرح چمکتے لگتی ہے جو شخص کنڈالنی کے اس مقام پر قابض ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دو موہے دشمن پر قابو پالیتا ہے۔“

”دشمن کون؟“

”وقت اور موت!..... یہ دونوں پھر ایسے تنترک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

اس وقت عابدہ پلنگ سے دوبارہ اٹھی۔ اس کی جھولی سے مونگ پھلیوں کے چھلکے خزاں کے پتوں کی طرح ایک بار پھر گرے..... اونچی قمیض تلے کاسنی شلوار کا پورا گھیر گنبد پر چڑھے غلاف کی طرح نظر آیا۔

”تم واقعی پاگل ہو گئے..... خدا قسم کیا بک رہے ہو۔“

”تم شکتی ہو..... شکتی عابدہ!..... تمہارے ملاپ سے مجھے اپنی روح کا نروان..... میرا خدا مل سکتا ہے..... میری لامتناہی تلاش ختم ہو سکتی ہے، تمہاری آرزو کی تکمیل ہو سکتی ہے..... تم ماں بن سکتی ہو..... ماں۔“ میں نے اسے لالچ دیا۔

پھر مننت کے انداز میں مقدس گنبد پر ہاتھ رکھا..... پتہ نہیں عابدہ کیوں خاموش بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھوں میں بڑی حیرانی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا..... تم چاہتے ہو میرے بچہ ہو قیوم..... سچ؟..... سچ؟..... بتاؤ تمہیں ترس آ رہا ہے ناں مجھ پر۔“

شکتی اور شوا کا میل میری کنڈالنی کو اپنے سفر پر روانہ کر سکا۔ میری کنڈالنی حسب عادت ناف سے کہیں نیچے بیٹھی رہی پھنکارتی رہی۔ ریڑھ کے سفر پر ماڑو کے پہاڑ پر چڑھنے سے اس نے انکار کر دیا۔ لیکن بیکار جتجو کا ایک دروازہ کھول کر میں نے پہلے سے ٹنڈ منڈ درخت کو سردیوں کی تخی ہواؤں کے سپرد کر دیا۔ دیوانگی کی ایک اور سمت مجھ پر کھل گئی۔

اس سے پہلے عابدہ اپنے شوہر کی گفتگو کرتی رہتی تھی مجھے یسی کے واقعات کے اعادے کا جنون تھا۔ میں وقت اور موت کو گفتگو میں بند کر کے گھڑی پیچھے کی طرف چلانا چاہتا تھا۔ ہم دونوں کا نقطہ اتصال کوئی نہ تھا شاید ہم دونوں ایک دوسرے سے ہمدردی چاہتے تھے۔ لیکن اس روز کے بعد ہماری گفتگو ہمیشہ شارٹ سرکٹ ہو جاتی۔ اب ہم میں ہمدردی تو کیا ایک دوسرے سے نگاہیں چار کر کے خدا حافظ کہنے کی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی۔

سہیل کی باتوں سے قطع نظر اپنی بے چینی اور لالچنی جستجو کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی، جس نے مجھے عابدہ سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور کیا۔ مرد کے جنسی سیلز کے اندر جو تنوع موجود ہے اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کھجلی ہوتا ہے۔ اس کے صنفی تخم کے اندر x اور Y کا جو تضاد موجود ہے۔ اس کی وجہ سے جنس کے معاملے میں وہ عورت کی طرح ایک طرفہ اور شانت نہیں رہ سکتا۔ اس کے جنسی سیل سے چونکہ لڑکے اور لڑکی کا متفرق تعین ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے جنسی فعل میں بھی کبھی ایک رخا نہیں بن سکتا۔ ہمیشہ دو شانے کی طرح کٹ جاتا ہے۔

جنس کے راستے پر عورت کبھی خوار نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ محبت حاصل کرنے کے لیے آتی ہے اور بچہ حاصل کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ مرد اپنے آپ سے آزاد ہونے کے لیے عورت سے ہمکنار ہوتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دو حصوں میں بٹ جاتا ہے Y یا X..... بیٹا یا بیٹی..... ذات یا خدا..... فنا یا بقا..... اپنی بقا کی کوشش میں کئی بار وہ اپنی فنا سے بغلیں ہو جاتا ہے۔ اسی جنسی جراثیم کے تنوع کے باعث کبھی کبھی لا تعلق حالات میں بھی وہ تعلق پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے..... کیونکہ اس کے صنفی تخم کے اندر..... مرد اور عورت دونوں موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے کبھی تو وہ جغرافیائی قرب کے باعث عورت سے رابطہ قائم کیے بغیر رہ نہیں سکتا..... کبھی وہ موسموں کی رومانیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ کبھی وافر وقت کا بہتر مصرف نہ پا کر کسی نہ کسی کے

قدموں میں جاگرتا ہے..... کبھی اس کے جراثومہ کا مرد اسے عورت کی طرف کھینچتا ہے کبھی اسی جراثومہ کا مرد اسے عورت کی طرف کھینچتا ہے کبھی اسی جراثومہ کی عورت اپنی ہم جنس کی تلاش میں نکلتی ہے۔ کیونکہ اس کے صنفی تخم کے اندر سائیکی کے دو مختلف روپ رہتے ہیں۔

مرد کا روپ..... عورت کا روپ..... یہی تنوع ہمیشہ کی جستجو کا باعث بنتا ہے..... اسی جستجو نے مجھے عابدہ پر..... شہخون مارنے کے لیے اکسایا۔

پہلے عابدہ کچھ اور تھی اس واقعے کے بعد اس نے مونگ پھلیاں کھانی چھوڑ دیں اور انک انک کر باتیں کرنے لگی۔ شاید وہ اس نئے رابطے کو گناہ سمجھتی تھی۔ لیکن ہم کرگس جاتی کے لوگوں پر مردہ تعلقات احساس جرم پیدا نہیں کر سکتے۔ عابدہ جو شگفتگی روپ تھی۔ اس کے ملاپ سے مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ جسم روح کو دعا دینے کے لیے کئی بھیس بدلتا ہے۔ وقتی طور پر کبھی کبھی جسم کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن روح کو ہمیشہ کے لیے جل دینا ممکن نہیں۔ روح کو محبت صرف اس وقت ہوتی ہے جب دو انسانوں کی سائیکی ایک دوسرے کی تلاش میں نکلتی ہے۔ ایسی صورت میں نہ وصل میں بوریت ہوتی ہے نہ نہ جر میں اشتیاق بڑھتا ہے۔ سائیکی کی محبت بھوک کی جنسی کشش کی جبات سے مشابہ نہیں ہوتی کہ سیر ہونے پر مونگ پھلی کے پھلکوں کی طرح محبوب بھی بیکار ہو جائے۔ وہ تو بھاری گھنیرے بادلوں کو اڑانے والی ہوا ہوتی ہے۔ جو جسم کا بوجھ ساری عمر اٹھائے لیے پھرتی ہے۔ جسم اور بادل کثیف ہوتے ہیں۔ محبت اور ہوا نظر نہیں آتیں۔ لیکن ان کا لطیف بہاؤ سمت بدلتا اور رفتار مقرر کرتا ہے۔ ہر قسم کی شدت تندی طاقت کو ان میں جنم دیتا ہے۔

محبت اور ہوا غضب ناک ہو کر چاہیے کیسی بھی تندی کیوں نہ اختیار کر لیں۔ لیکن جسم اور بادل کی طرح کثیف نہیں ہو سکتے۔

عابدہ اور میں ایک دوسرے کی طرف اس لیے بڑھے تھے کہ شاید ہم دونوں اپنی

فنا سے ڈرتے تھے۔ میں سبھی میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ عابدہ بچے کے بغیر اپنا سلسلہ منقطع ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں خوفزدہ تھے۔ اپنی اپنی فنا سے.....

لیکن جسم میں پناہ ڈھونڈنے والے اکثر اوقات تلاش کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ موت سے محبت کرتے ہیں کہ زندگی سے.....

اسی لیے ہم دونوں دو طاقے دروازے کی مانند رہے۔ کنڈی لگی رہی تو ایک.....

ورنہ دونوں پٹ علیحدہ علیحدہ رہے۔ آندھیوں میں بنگا اٹھنے والے..... دیواروں سے چمٹے ہوئے۔

اب عابدہ ناغے ڈال کر اوپر آنے لگی۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوتی تو اس کے پورنماشی چہرے پر آنکھوں کی کھڑکیاں بند ہوتیں۔ ہونٹ لپ سٹک کے باوجود پرانے پردوں کی طرح بے رنگ نظر آتے وہ کبھی سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جاتی۔ کبھی دیوار کے ساتھ بایاں کندھا لگا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرتی۔

بچپن سے جو میخیں اس کے کلچر، مذہب، ماحولیات نے اس کے ذہن میں ٹھونکی تھیں۔ بالآخر اس کے ذہن کے تختے کا حصہ ہو چکی تھیں۔ اگر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن ہم دونوں تو اپنی اپنی تلاش کے باعث ہمسفر ہوئے تھے۔ اس لیے اب فقط احساس گناہ اور خود شکستگی باقی تھی۔

میں بھی عجیب قسم کے بوجھ تلے دبے لگا تھا۔

لیکن خدا جانے وہ کیا کائناتی عمل ہے جو کبھی کبھی بڑے بڑے بوجھ بہت چھوٹے سے لیور سے اٹھا لیتا ہے۔ جیسے بھاری تھری ٹرنرک چھوٹے سے جیک پر اٹھ جاتا ہے اور پنکچر پمپنی بدلنے کی آسانی مہیا آتی ہے۔ جب کبھی Ancient mariner

کی نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی کہ احساس گناہ تلے دبے ہوئے بحری قزاق کو اس وقت تو رہائی نہ ہوئی جب اس نے موت اور زندگی جیسے مافوق الفطرت کردار دیکھے، لیکن چھوٹے چھوٹے دریائی سانپ دیکھ کر وہ الوہی طاقتوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

شاید زندگی کے تمام اہم واقعات قد میں ہمیشہ چھوٹے ہوتے ہیں..... ماں کا مرنا یہی کی موت، چند راگاؤں کا چھوٹنا، یہ بڑے سانچے تھے۔ جیسے شہر بمباری کے بعد تباہ ہوتے ہیں۔ لیکن جنگ دیدہ شہر بڑی شان کے ساتھ سرعت سے جلد ہی تعمیر ہو جاتے ہیں ہرنیکسلا، دلی، لاہور، میر و شیمابڑی جلدی مرمت ہو جاتا ہے لیکن چھوٹے واقعات گھن کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر قد آور درختوں کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ لہلہاتے کھیوں میں کلر کی طرح بڑھتے ہیں۔ جو شہر دریاؤں کے پاس آباد ہوں اور دریا ہو لے ہو لے کروٹیں لیتے رہیں۔ ایسے شہر ہو لے ہو لے ہی برباد ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی آباد نہیں ہوتے..... ان کے ارد گرد بے آب و گیاہ ریت پھیل جاتی ہے۔

ماں کا مرنا بڑا واقعہ تھا..... لیکن اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے چھوٹے واقعات بڑے اہم تھے۔

ماں کا مرنا ایسے زلزلے سے مشابہ تھا جس کے ساتھ اونچی عمارتیں ماتھا جوڑ کر پھٹ جاتی ہیں۔ سڑکوں میں چھتھنارے..... درخت دھنس جاتے ہیں۔ لاوا اڑدہے کی طرح لاوارث پھرتا ہے..... لیکن زلزلہ لمحوں کی بات ہوتی ہے..... ماں کا مرنا ایسے ہی تھا۔ ہزاروں واٹ کی بجلی گری اور بھسم کر گئی..... لیکن ماں کے مرنے سے کچھ سال ادھر کے کئی چھوٹے چھوٹے واقعات اس کے مرنے کے ساتھ ہی اہم ہو گئے۔ جیسے ٹائیفائیڈ مرض کے بعد برسوں سر پر بال نہ اگیں۔ بغیر تلے کی جوتی میں چلنے کی وجہ سے کیکر اور بہوں کے کانٹے پیروں میں چبھ جائیں اور کئی شاہیں کئی

راتیں اپنے جسم کو سونے سے پھولتے نکلیں۔

میرے باپ کا گھرانہ بڑا شان والا تھا۔ چند راتیں ہماری حویلی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ نک طوطے ابا کا سارا خاندان فیوڈل تھا۔ اسی لیے ماں کا میکہ گننام رہا۔ ہم ماں کے کسی رشتہ دار کو نہ جانتے تھے۔ وہ حویلی میں اپنی کلب کی اور خاندان کے اندر ابا کی رعایت سے بڑی چودھرائن تھی۔

لیکن جب ماں بیمار پڑی اور گھر سے بھیڑ کم ہونے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ قصور جا کر اپنے مائیکہ گھر میں مرنا چاہتی تھی۔ باپ کو ماں کی اس آرزو پر منطقی طور پر کوئی اعتراض نہیں تھا، لیکن ساری بات غیرت کی تھی۔ ہمارے گھر کی کوئی بھی بڑی سیانی اپنے میکہ گھر میں فوت نہیں ہوئی تھی.....

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ماں کو عصر کے وقت ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ وہ آنگن کے بڑے پیپل تلے نواڑی پلنگ کو گھسیٹتی رہتی، جدھر جدھر سورج چلتا ادھر ہی کو اس کا پلنگ کھسکتا جاتا، حتیٰ کہ سورج غروب کے وقت اس کی چارپائی عین ان سیڑھیوں سے جا لگتی جو حویلی کی دوسری منزل کو جاتی تھیں۔

سردیوں سے ہوتا ہوتا بخار گرمیوں میں بھی رہنے لگا۔ اب ماں چھواؤں کی تلاش میں چارپائی کھسکانے لگی۔ جس وقت سورج پھیکا پڑ کہہ اندھا ہو جاتا، وہ پیپل کے تنے تلے عین گھڑونجیوں کے پاس چارپائی کھسکا کر پڑ رہتی۔ اب بھی آگن میں شام کے وقت میلہ سالگرہ ہوتا تھا، ماں کی طبیعت کا پوچھنے دو آتیں تو چارٹھ کر چلی جاتیں، لیکن اب ماں کی کھنک دار آواز نہ آتی..... قیومی مختار..... بیٹا سروئی پی لو..... پھر مغرب کا وقت ہو جائے گا۔ میری نماز سچ جائے گی کا کا۔“

اب کوئی نہ کوئی ہمیں سروئی کے گلاس پکڑا دیتا، پھر خالی گلاس گھڑونجی پر پڑے رہتے، رین بسیرے والی چڑیاں گھنیرے درخت میں اس قدر شور مچاتیں کہ جی ڈرنے لگتا لیکن ماں آنکھیں موندے چپ چپ پڑی رہتی۔ اب اسے نماز کے قضا

ہونے کا بھی کوئی فکر نہ تھا۔

چڑیوں کا بلبلانا ایک چھوٹا سا واقعہ بن گیا تھا۔ ان کی تصویر کے اوپر مغرب کی اذان سو پر امپوز ہو جاتی۔ گرمیوں میں دن کا یہ پہلا ٹھنڈا پہر ہوتا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرا جی چاہتا کہ دو پہر چڑھی رہے..... دو پہر کے وقت ہی یہ ڈر نہیں ہوتا تھا، مکہ ماں کہیں جاسکتی ہے..... لیکن مغرب کے وقت پتہ نہیں کیوں کئی قسم کے خوف مجھے گھیر لیتے، مجھے لگتا کہ شاید اسے جھٹپٹے میں ماں چھپ چھپا کر غائب نہ ہو جائے۔

ماں کے مرنے سے کچھ دن پہلے ایک اور بڑا معمولی واقعہ پیش آیا۔

اس روز ماں کو اس کی سہیلی اصغری اور میرا شن برکتے نے غسل کرا کے پھیکے سبز رنگ کا سوٹ پہنایا تھا۔ نومبر کی دھوپ ابھی آنگن میں تھی، وہ دونوں ماں کو سہارا دے کر باہر لارہی تھیں اور میں اوپر جانے والی سیڑھیوں پر گنا گود میں لیے بیٹھا تھا۔ چلتے چلتے میں ماں کی آنکھیں تھیں۔ اس کے ہونٹ یوں جڑے تھے جیسے درد کو باہر نکل کرواویلا مچانے سے روک رہے ہوں۔

اس سے پہلے ماں کے کانوں میں کئی بالیاں تھیں لیکن آج اس کے تمام کان خالی تھے۔ یہ میرے لیے ایک اور چھوٹا سا واقعہ تھا۔ میں بغیر بالیوں والی ماں کا عادی نہیں تھا۔ نومبر کی دھوپ میں پلنگ پر بیٹھی میری ماں کا رنگ سوجی کی مانند پھیکا نظر آ رہا تھا۔ پھر کچے زین اصغری نے ماں کی چٹیا کھینچ کر بنائی، اس کے بال اتنی سختی سے مٹھی میں لیے کہ ماں کی بادامی آنکھیں چینی نظر آنے لگیں۔ کچھ دیر تک وہ دونوں مٹھی چا پی کرتی رہیں اور جب عصر کی اذان ہو گئی تو ماں کی ملتان کی کھیس اوڑھا کر چلی گئیں۔

اس وقت میں ڈرتے ڈرتے ماں کے پاس گیا۔ چڑیوں کے آنے سے پہلے مجھے چڑیوں کے بلبلانے سے خوف آتا تھا۔

”تیری بالیاں کہاں ہیں ماں؟“

ماں نے بڑی مشکل سے پلکیں اٹھائیں دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی

تھیں۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں قیوم..... قیومی۔“

ماں نے آنکھیں بند کر لیں اور آنسو اس کے کانوں کی طرف بہنے لگے۔

”پتہ نہیں تو کب جوان ہوگا..... کتنی دیر لگا دی تو نے جوان ہونے میں۔“

”ہم دونوں جوان ہیں..... دیکھ تو سہی“..... میں نے گاؤں میں سن رکھا تھا کہ

ماؤں کو بیٹوں کی شادی کا بہت شوق ہوتا ہے۔

”تو ہماری شادی کرنا چاہتی ہے تو کر دے۔“

وہ مسکرا دی۔

ایک اور چھوٹا سا واقعہ۔

اس روز کی مسکراہٹ کے بعد پھر میں نے ماں کو مسکراتے نہیں دیکھا۔

”کتنے ہی سال سسرال میں رہو، کتنے ہی بچے جنمو..... کیسے کیسے کاج سنوارو،

کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ سسرال میں تو شوہر بھی اپنا نہیں ہوتا۔ دوسروں کا گلہ کیسا؟ چونکہ

اس وقت میں صرف ساتویں میں پڑھتا تھا اور پوری طرح شادی کے قابل نہیں ہوا

تھا، اس لیے میں رونے لگا۔ میں ماں کی باتیں نہیں سمجھ رہا تھا۔ صرف ماں کی آواز

میں اس کے دکھ تلے ماں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”جب تو جوان ہو جائے گا تو اپنے مامے کے پاس جانا..... منظور الہی قصوری۔

کے پاس۔

پہلی بار میں نے اپنے ماموں کا نام سنا۔

”تو مختار بھائی کو بھیج دے قصور..... وہ تو بی اے میں پڑھتے ہیں جوان ہیں، ہاں

جوان ہے لیکن وہ اپنی دادی کی گود میں پلا ہے۔ جہاں کہیں وادی کا بیر ہے وہاں مختار

نہیں جاسکتا۔“

تو مجھے مامے منظور کا پتہ بتادے میں چلا جاؤں گا۔ کل سویرے سہی۔“

”لاریوں کے اڈے سے بلے شاہ کے مزار کا پوچھ لینا۔ باہر والی گول سڑک پر بلے شاہ کے مزار کے سامنے بازار کو ایک راستہ جاتا ہے..... بازار کی طرف مت مڑ جانا۔ بس گول سڑک پر رہنا۔ ایک بڑا سا احاطہ نظر آئے گا۔ بڑے پھانک سے کوئی سوگڑ کے فاصلے پر۔ یہ احاطہ میرے بھائی کا ہے، جس روز میں گھر سے نکلتی تھی اس روز اس پھانک پر مراٹھی سہرے لگا کر گئے تھے۔ میری بھابی کے لڑکا ہوا تھا، اس روز پتہ نہیں اب تو وہ جوان ہو گیا ہو گا۔

”تو..... کیوں نکلی تھی ماں..... دیہات میں ہم بڑے لوگ نکل جانے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔“

بڑے قحط کا سال تھا۔ بارش کا قطرہ نہ برسا تھا اور بھادوں کا مہینہ تھا جا لگا تھا، درختوں پر مٹی جمی تھی۔ سڑکیں راکھ جیسی ہو گئی تھیں۔ میں چوبارے میں رہتی تھی، بھابی کے ساتھ اور سادہ بلے شاہ کے مزار کی طرف منہ کر کے اس کے بچوں کو کھلایا کرتی تھی..... تین بچے تھے میری بھابی کے..... سب کو میں نے گودی کھلایا تھا۔

مامے منظور کو بلالوں ماں۔“

”ناں نانا اس کا نام بھی مت لینا حویلی میں۔ تیرا باپ ناراض ہو جائے گا۔“

اس سے پہلے کبھی ماں کے منہ سے میں نے مامے منظور الہی کا نام بھی نہ سنا تھا۔

”اس روز سارے قصور پر مٹی کا بادل چڑھا تھا۔ قوال بلے شاہ کے مزار پر چوکی بھر رہے تھے۔ میں تیسری منزل پر کھڑی کبوتروں کو باجرہ ڈال رہی تھی، پتہ نہیں قوالوں کی آواز میں کچھ تھا کہ آسمان چڑھی ہوئی مٹی میں کوٹھے سے اتری۔ بڑے پھانک سے نکلی اور مزار پر چلی گئی۔“

میں چپ چاپ ماں کے پاس کھیس کے اندر گھس کر لیٹ گیا۔ ماں کے جسم سے نما نما سینک نکل رہا تھا۔

قوالوں سے آگے چھوٹے برآمدے میں ستون کے ساتھ سر لگائے تیرا باپ بیٹھا تھا تیرا باپ بڑے سماں کہتا رہا کہ اس وز بلسے شاہ کے مزار پر اس کی دودعائیں ایک ساتھ پوری ہوں گی۔“

”کون سی دودعائیں؟“

”اس روز میں مزار سے گھر واپس نہیں گئی..... میری کون سی ماں تھی گھر پر جس سے میں اجازت لینے جاتی..... جب ہم چندرا میں داخل ہوئے تو بڑی ٹکویں بارش ہو رہی تھی۔ تیرے ابا نے تب مجھے بتایا کہ وہ بلسے شاہ کے مزار پر بارش کے لیے دعا کرنے گیا تھا۔“

تو..... اپنے گھر واپس کیوں نہیں گئی ماں بول..... بتا۔“

میں نے دونوں ہاتھوں میں ماں کا چہرہ لے کر پوچھا۔

دیکھ کسی سے یہ بات کرنا نہیں اچھا تیرا ابا ناراض ہو جائے گا..... وہاں میرا اپنا کوئی نہیں تھا نا..... نہ ماں نہ باپ..... پر یہاں اتنے سال سسرال رہنے کے بعد پتہ چلا..... وہاں منظور الہی تو تھا نا۔

اس کے بعد میں نے ماں کو بہت بلانا چاہا، لیکن وہ میری طرف پیٹھ کر کے ہو لے ہو لے روتی رہی۔ ماں کے مرنے سے بھی زیادہ اس چھوٹی سی شام نے مجھے اپنے اندر گھول لیا تھا، ماں کے مرنے کے بعد جب بھی میں لیڈتا مجھے یوں لگتا جیسے اب بھی وہ میری طرف پیٹھ کیے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی ہے۔

جس روز ماں کا چالیسواں تھا، اس سے ایک رات پہلے میں نے چندرا کو چپکے سے خدا حافظ کہا، آسمان پر دو دور تک مٹی چڑھی تھی، ایک بھی ستارہ نظر نہ آتا تھا اور بلا کی گرمی تھی۔

جس وقت میں قصور کی گول سڑک پر پہنچا تو اس روز بھی بلسے شاہ کے مزار پر قوال چوکی بھر رہے تھے..... آڑھتی منظور الہی کا گھر تلاش کرنے میں مجھے ذرا بھی تکلیف

نہ ہوئی احاطے میں داخل ہوا تو ماں کی شکل کا ایک بوڑھا اندر سے وضو کا پانی کہنیوں سے پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ اس نے لمہ بھر کو مجھے دیکھا۔ ٹھٹھکا اور میرے گلے لگ گیا۔

”کیا حال ہے رابعہ کا؟“

”ماں تو مر گئی۔“

مامے نے میری طرف دیکھا پھر آسمان کی جانب نگاہ دوڑائی..... اس وقت چڑھی آندھی میں کبوتر چکر لگا رہے تھے۔ مانے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کب؟“

بلے شاہ کے مزار پر قوالوں نے پورے زور سے سر لگائے۔ ”ریا میرے اوگن چت نہ دھریں۔“

پتہ نہیں وہ مامے منظور الہی کے وضو کا چھینٹا تھا کہ اس کے اچھے ہوئے آنسو تھے کہ بارش کا پہلا قطرہ..... میرے ماتھے پر ٹھنڈی برف کی کئی گری۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

اس روز پھر بارش شہر کو غرق کرنے کی سوچ میں تھی۔

مامے منظور الہی کی ملاقات کتنا چھوٹا سا واقعہ تھا..... لیکن اس نے مجھے پاؤں میں زنجیریں پہنا دیں اور بی اے کرنے کے بعد تک میں چند رانہ جاسکا۔

عابدہ بہت دنوں کے بعد میرے کمرے میں نظر آئی۔

مجھے کاسنی رنگ کے ہر شید سے نفرت ہے اور وہ سر سے پاؤں تک بیگنی، کاسنی، کیلجی مائل لگ رہی تھی۔ شاید وہ دیر سے یہاں بیٹھی تھی کیونکہ چار پائی کے نیچے مونگ پھلیوں کے چھلکوں کا ڈھیر تھا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں کھڑے ہو کر تھوک سڑک پر پھینکی۔

”قیوم! بری عادت ہے ہر وقت تھوکنے کی۔“

میں چپ رہا۔

”میری مامی تھیں ایک ان کو نظہارت کی بری عادت تھی۔ پوری پوری بالٹی پانی سے کرتی تھیں۔“

ہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ بھی۔“

”آج بہت دنوں کے بعد عابدہ نے اپنے شوہر کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔“

”خدا کی قسم قیوم جیسی خدمت میں نے وحید کی کری ہے ناں ویسی کوئی ماں جنی نہیں کر سکتی..... لیکن اس کو پرواہی نہیں کہ میری گود خالی ہے۔ کہتا ہے بچہ خواہ مخواہ در در ہوتا ہے..... کیوں بچہ کوئی در در ہوتا ہے؟“

میں..... صرف اس کی زکامی آواز سن رہا تھا۔ متن پر میرے کان نہیں تھے۔
”ذرا بچے کی بات زور دے کر کہہ دوں تو فٹ رونے لگے گا کہے گا تمہیں کیا کوئی جے یا مرے تمہیں تو بچہ چاہیے بچہ۔“

میں نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہا..... ”ہاں یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے..... تمہیں صرف بچہ چاہیے اس دنیا میں۔“

”کیا ٹھیک کہتا ہے قیومی؟۔“

”یہی کہ اگر تمہارا اس سے کوئی رشتہ ہوتا تو تم اس کی تکلیف محسوس کرتیں۔“
پلاسٹک کی انگوٹھیوں والا ہاتھ گھما کر وہ بولی..... ”میں اس کی بیوی ہوں نکاحی ہوں اس سے..... اس سے بڑا رشتہ کیا ہوتا ہے۔“

یہی کہ اگر تمہارا اس سے کوئی رشتہ ہوتا تو تم اس کی تکلیف محسوس کرتیں۔“
”بیوی اور پی اے سے کسی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ کوئی اچھا پی اے ہوتا ہے کوئی نالائق..... کسی کو شارٹ ہینڈ آتی ہے کسی کو سپیڈ زیادہ ہوتی ہے کوئی چھٹی اچھی

ڈرافٹ کرتا ہے کوئی ن وٹس لینے میں تیز ہوتا ہے۔ ہر آفیسر پی اے کے ساتھ بندھا ہوتا ہے ہر شوہران کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ بی بی عابدہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوتی ہے دوسری بری۔ اچھی بیوی کھانا پکاتی ہے برتن مانجھتی ہے وقت پڑنے پر پاؤں دباتی ہے۔ چپ رہتی ہے لیکن اسکے ساتھ کبھی اس بیوی سے زیادہ ناٹھ نہیں ہوتا جو گھر کے خرچے سے زیور بناتی ہے فلمیں دیکھتی ہے سسرال والوں سے لڑتی ہے۔ نوکر ملازم خدمت گار کے ساتھ تعلق پیدا ہو سکتا ہے لیکن پی اے کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہوتا بیوی بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔

یہ یہ تم کیا بک رہے ہو آج..... دنیا میں ہر رشتہ سگا بھی ہو سکتا ہے اور سوتیلا بھی..... سگی ماں سوتیلی ماں..... سگا بھائی سوتیلا بھائی..... لیکن بیوی ہمیشہ سگی ہوتی ہے کبھی تم نے سنا یہ میری چوتھی سوتیلی بیوی ہے۔

میں نے محض اس کو چڑانے کے لیے کہا..... سگا سوتیلا ہمیشہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کھرے اور کھولے کی پہچان کرانی ہو..... جہاں رشتہ ہی موجود نہ ہو وہاں سگا سوتیلا کیا معنی؟۔

وہ اپنی پٹری پر بولتی چلی گئی..... اولاد ایک سگی دوسری سوتیلی..... چاچے تائے کچھ سکے کچھ سوتیلے..... بیوی پہلی سگی دوسری سگی تیسری چوتھی..... سب سگی بیویاں۔ میں آج کچھ ضرورت سے زیادہ برہم تھا۔ میں اس سے جھگڑنا چاہتا تھا۔ آج مجھے وہ شکتی سروپ نہیں لگ رہی تھی۔ میں اس کو وجود میں اتر کر تنزاکے سہارے خدا تک پہنچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس راستے نے بھی مجھے تسکین دینے کے بجائے الٹا الجھا دیا تھا۔ میں اسے اذیت دے کر دکھ پہنچا کر حلال کر کے سکون سے سگریٹ پینا چاہتا تھا۔

جان من عابدہ نیگم بیوی فقط Catalyst ہوتی ہے۔ سارے اصلی نقلی رشتے بناتی ہے..... پہلی بیوی کی اولاد ہو تو سب سکے بیٹے بیٹیاں..... دوسری کے تمام سوتیلے نہ

پہلی کے ساتھ کوئی رشتہ نہ دوسری کے ساتھ۔

وہ رضائی گھسیٹے جا رہی تھی اور اب میں اکڑوں تکیے پر بیٹھا تھا۔

ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے قیوم..... تم ایسی باتیں سوچتے ہو جو مذہب اور شریعت نے حرام کر رکھی ہیں سچی۔
مثلاً۔

رشتہ داری، اللہ رسول کے احکامات ہیں ان کے متعلق..... بیوی بچوں کے حق بندھے ہیں مذہب میں..... جو یہ سارے جھوٹے ہوتے تو شریعت ان کی پابندی کراتی..... اتر کر نیچے بھائی بھابھی سے ملا کرو۔ بچے ہیں ماشاء اللہ ان سے کھیلا کرو۔ ان پر بھی پیار نہیں آتا؟“
نہیں۔“

”توبہ..... ایسے کوئی کہتا ہے..... کہیں بھابھی صولت کے سامنے نہ بکواس کر دینا۔“
”وہ جانتی ہے۔“

ساری بات یہ ہے کہ اس بد بخت سیمی نے تمہارے دماغ میں فتور بھر دیا ہے۔ عشق کا بخار چڑھا ہے تمہیں..... مجھے جو کہیں مل جائے تو الو کی پھٹی کو سیدھا کر دوں۔ خود تو مر گئی اس پچارے کو ویسے ہی پاگل کر گئی..... اللہ کی شان۔
”کسی نے میری ریڑھ کی ہڈی پر برف مل دی۔“
”خبردار پھر کبھی سیمی کو کچھ نہ کہنا۔“

”کہوں گی کہوں گی..... اس نے تمہیں پاگل کر رکھا ہے..... ہائے کبھی مسلمانوں کے لڑکے یوگا کرتے پھرتے تھے؟..... وہ بھی تنتر ایوگا..... نجس ناپاک خیالات اسی نے بسائے تمہارے دل میں اپنے گناہ پر نقاب ڈالنے کو..... تم کسی دماغی امراض کے ڈاکٹر سے ملو قیومی سچ خدا کی قسم! اور توبہ کیا کرو اپنے گناہوں پر۔“

’پھر اس کا نام نہ لینا عابدہ..... میں نے اس کے کندھے پکڑ کر کہا۔
’وہ جو سارا دن تم وحید کی دھجیاں اڑاتے پھرتے ہو وہ ٹھیک ہے۔ آخر میرا
مجازی خدا ہے وہ۔‘

’ہوگا لیکن میرا مجازی خدا نہیں ہے۔‘

ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے اس نے اپنے کندھے میری گرفت سے چھڑانے
کی ہلکی سی کوشش کی۔ لیکن میں نے اسے چھوڑا نہیں۔

بڑی دیر بعد میں نے کہا..... ’’سچ بولنے کی کوشش کرنی چاہیئے..... لیکن۔‘‘
اس نے مجھے بات مکمل کرنے نہ دی اور بولی..... سچ بولنا کوئی کمال نہیں ہے سچ
سننا بڑا کمال ہے۔‘‘

کیا مطلب؟

سچ بولنے کی قوت ہمیشہ سچ سننے والوں سے ملتی ہے۔ تم سچ بول تو لیتے ہو لیکن سچ
سن نہیں سکتے..... یہ تمہاری کمزوری ہے سیدھی۔‘

’تمہیں غلط اندازہ ہوا ہے..... مجھ میں سچ سننے کی اہلیت ہے۔‘

ہے؟..... سرمہ لگی آنکھیں ملکا کر اس نے پوچھا۔

ہے۔‘

’جیسی کے خلاف بھی؟.....‘ اس نے شرارت سے پوچھا۔

’ہاں اس کے خلاف بھی۔‘

’کل بولو گے میرے ساتھ..... سچ سننے کے بعد۔‘

’ضرور‘

اچھا..... اب سنو تم درمیانے قد کے دبے پتلے مرد نما لڑکے ہو۔ تمہاری مونچھیں
تمہارے چہرے پر نہیں جھٹکتیں۔ تمہارے بالوں سے خشکی جھڑتی رہتی ہے جو تمہاری
کوٹ کے کالروں پر بری لگتی ہے۔ تمہارے بڑھے ہوئے ناخن گندے ہوتے

ہیں۔ تمہارا مزاج ایسا ہے جیسے راکھ جلتے کوئلے پر چڑھی ہو..... اوپر سے بجھے ہوئے اندر سے جلا دینے والے..... ہر وقت کتابیں پڑھ پڑھ کر تم نیم پاگل فلسفی ہو گئے ہو۔“

میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
وہ میری سخت گرفت کے نیچے کسمائی۔

”پتہ نہیں کیوں میں نے تمہارے پاس آجاتی ہوں قیوم..... مجھے پتہ بھی ہے کہ یہ جائز نہیں..... حرام ہے پتہ نہیں مجھے بچے کی تلاش لاتی ہے کہ اپنی تنہائی..... پتہ نہیں میں تمہیں چپ کرانے آتی ہوں کہ اپنے آپ کو؟۔“
یکدم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اپنے ہونٹ اس کی گال پر رکھ دیے۔

”ناں قیوم! یہ گناہ ہے..... میں نے توبہ کر لی ہے۔“
”کس بات کی۔“

”بس کسی بات کی..... ایسے بچے کا بھی کیا فائدہ۔“

وہ چپ چاپ بستر سے اٹھ گئی۔ چھنا کے سے مونگ پھلیوں کا لفافہ فرش پر گر گیا۔

اب عابدہ نے کوٹھے پر آنا بالکل چھوڑ دیا۔ میری نوکری نئی تھی۔ اس لیے میں نے پوری توجہ سے ریڈیو سٹیشن پر وقت گزارنا شروع کر دیا۔

صبح شیو کرتا تو بار بار بالوں میں برش پھیرتا۔ پتہ نہیں کیوں عابدہ نے میرا جو سچا سراپا بیان کیا تھا۔ اس سے مجھے شرم آنے لگے تھی، سردی اب کم ہو گئی تھی۔ میں بھی ماضی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بہت سی کتابیں خرید لیا تھا..... ”اپنے آپ کو بدل ڈالو۔“

”تم اور تمہارا مستقبل“..... ”بدلنے کے بائیس گر“..... اس نوعیت کی ان گنت امریکی کتابیں ریڈیو سے واپسی پر اب میرے ساتھ ہوتیں۔ میں یوگا سے کھل کر کچھ دنوں ٹی ایم کے چکر میں پڑا رہا۔ Relax کرنے کا یہ ڈھنگ کچھ دنوں مجھ پر سوار رہا۔ پھر میں نے یہ راستہ بھی چھوڑ دیا۔ لمبے سائنس، تپسیا، منتر، زن بدھی زم..... سب بیکار باتیں تھیں..... میں اپنی انا کی پوست میں سمٹا ہوا تھا، مجھے ہر جگہ اپنے آپ ہی سے لڑنا تھا۔ عابدہ سے میرا کوئی ناٹھ نہیں تھا۔ لیکن اس نے مجھے اپنی صحبت کی ہڈی پر سیدھایا ہوا تھا۔ میں اس کی محبت میں مبتلا نہیں تھا۔ لیکن اس کی رفاقت سے اس قدر مل گیا تھا کہ اگر وہ دو چار دن اور اوپر نہ آتی تو از سر نو مجھے چاند میں بونے کھیلنے نظر آتے اور آنگن میں دن چھپنے پر سیسی بیٹھی نظر آتی۔

اس روز میں نے پہلا دیہاتی پروگرام پروڈیوس کیا تھا۔ مجھے ہلکی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ نئے کام کی نئے ماحول اور نئے تعلقات کی خوشی..... مجھ پر خوشی ایسے ہی چڑھی ہوئی تھی۔ جیسے آلو بخارے پر ہلکی سی دھند نما موم چڑھی ہوتی ہے۔ بھائی مختار کا موٹر سائیکل میں نے آنگن میں رکھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ عابدہ کو دیہاتی پروگرام کے متعلق سب کچھ بتاؤں جو کچھ وہ سمجھ سکے وہ بھی اور جو کچھ وہ سمجھ نہ سکے وہ بھی۔

آنگن میں بھابھی صولت، عابدہ اور ایک اجنبی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اجنبی کے چہرے پر تکبر، سر پر ہلکا سا گنچ اور جوتے کی پالش میں ٹڈل کلاس زندگی کا عکس تھا۔ پتہ نہیں یہ اجنبی مجھے کیوں برا لگا۔ مجھے بھابھی نے آواز دی لیکن میں ہمیشہ کی طرح ان سنی کر کے اوپر آ گیا۔

میرے کمرے میں چائے کاڑے اور مونگ پھلیوں کا لفافہ پڑا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر عابدہ کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن گھنٹہ بھر بعد میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور پھر اسے ٹھنڈی ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ نئے پرانے زخم آہستہ آہستہ کھل رہے تھے، کئی سوال؟..... جو کچھ دن سے مجھے ستاتے نہ تھے آج دوبارہ پوری آب و تاب سے

ابھر آئے تھے، بڑی دیر تک میں باہر کوٹھے پر ٹہلتا رہا۔ یکدم مجھے اپنی گدی سے کئی سمتوں میں آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے کئی بار پلٹ کر دیکھا، جیسے میرے سر کے ساتھ کوئی اور سر جوڑے ٹہل رہا تھا۔ پھر کمرے کا روشندان آنکھ کی پتلی کی طرح کھلنے اور بند ہونے لگا..... آسمان کی کمر میں چاند کا خنجر بندھا تھا۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے ابھی ایک نا دیدہ ہاتھ کمر بند سے یہ خنجر کھول کر میرے سینے میں پیوست کر دے گا۔ میرے معدے میں یکدم بہت سا تیزاب جمع ہو گیا۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟

انسانی رشتے؟..... نفر تیں محبتیں؟

یہ سب کچھ کیا ہے۔

زندگی کا سفر؟

ہمیں کیا چاہیئے؟..... ایک دوسرے سے؟..... اپنے آپ سے؟

عمر کا فریب، عقل کا فریب، محبت کا فریب..... معاشرہ اور فرد..... فرد اور

قانون..... قانون اور قانون فطرت..... ان سب کی حدیں کون سی ہیں؟

ایک آدمی کیا صرف جسمانی طور پر کسی اور کو ہلاک کر سکتا ہے کہ ہلاک کرنے کے

لیے جسم کی قید نہیں.....؟

سوال بڑے بھنور میں چھوٹے تلاطم بن کر گھوم رہے تھے۔ کئی حقیقتیں، کئی عزائم

کئی جھوٹ کئی سوچیں آپس میں مشین کی سلائی جیسی جڑتی جا رہی تھیں۔ مجھے اب

سیسی کی تلاش نہیں تھی، اس کا مرنا ہو لے ہو لے حقیقت بن چکا تھا۔ لیکن اس کی

موت نے ان گنت جاگتے سوالوں کو جنم دے دیا۔ جس طرح مشین کے پرزے

کھو چلے ہو کر آوازیں دیتے ہیں اور ان میں پہلے سی تیزی نہیں رہتی، ان سوالوں

نے بے نام جستجو بے معنی تلاش نے مجھے کھو چلا کر دیا تھا۔ میں اب زندگی کے پیٹرن

پر چلتا ہوا اندر سے آوازیں دینے لگا تھا۔ عابدہ ہوتی تو یہ آوازیں مدہم ہو جاتیں۔

لیکن کبھی مکمل طور پر ختم نہ ہوتیں۔ ان ہی نے مجھ پر عجیب قسم کی وارنٹی اور دیوانہ پن طاری کر دیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ میرا وہ نام نہیں ہے جس سے لوگ مجھے پکارتے ہیں۔ اصلی نام یاد کرنے کی کوشش کرتا تو وہ یاد نہ آتا۔ کبھی مجھے لگتا کہ میں جن لوگوں سے ملتا ہوں ان کو میں نے کبھی پہلے بھی دیکھا ہے میں ان کی پرانی ملاقاتوں کو ذہن میں ابھارنے کی سعی کرتا تو بیکار نکلتی۔ کچھ چہرے کالج کے دوست، پروفیسر بھائی مختار صولت بھابھی ان کے بچے مجھے بالکل اجنبی لگتے۔ مجھے اپنے آپ سے پوچھنا پڑتا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اور میری طرف پر امید مشتاق نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں؟..... جب تک عابدہ میرے پاس رہتی تھی ان بے سمت سوچوں سے چھٹکارا ملتا رہتا۔ اس کے جاتے ہی ہر طرف سے ریل گاڑیاں چلنا شروع ہو جاتیں اور مجھے لگتا کہ ابھی وہ میری ذہن میں پہنچ کر آپس میں ٹکرائیں گی۔ بڑا دھماکا ہوگا اور میری کھوپڑی پاش پاش ہو جائے گی..... ان ہی سوچوں نے مجھے اپنی نوکری میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

چاند کا خنجر غروب ہو گیا۔ اب کوٹھے پر سڑک کے کھمبے کی پھیکی روشنی تھی۔ عابدہ کے آنے سے بہت پہلے اس کے سیلیپروں کی آواز آئی۔ میرے دل کو ہلکی سی ڈھاریں ہوئی۔

”یہاں کیا کر رہے ہو اکیلے؟“

میں چپ رہا۔

”اندر تمہارے لیے چائے رکھ گئی تھی۔“

”شکریہ..... پڑی ہوئی ہے سات گھنٹے سے۔“

”کیسے بول رہے ہو؟“

”جیسے بولا کرتے ہیں۔“

”بڑا دکھا طریقہ ہے تمہارا مہمانوں کے ساتھ..... نہ بیٹھنے کو کہا نہ آنے کی وجہ

دریافت کی۔“

”بیٹھ جاؤ اندر جا کر۔“

”اکیلی.....؟“

”عورتیں اکیلی بیٹھی اچھی لگتی ہیں۔ کوئی انہیں ستاتا نہیں۔“

”پوچھو گے نہیں کہ میں کیوں آئی ہوں۔“

میں نے سگریٹ سلگایا اور شہ نشین پر بیٹھ کر بولا..... ”ضرور کوئی معقول وجہ ہوگی

کیونکہ تم ہمیشہ میرے پاس معقول وجہ سے آئی ہو۔“

”بڑے کمینے ہو وحید کی طرح۔“

”ہم مردوں کی ایک ہی ذات ہوتی ہے اللہ کے فضل سے۔“

”اندر آؤ ایک بات کرنی ہے تم سے۔“

کچھ دیر میں اکیلا بیٹھا رہا۔ نافرمانی پر طبیعت مائل تھی۔ لیکن زیادہ دیر رہ نہ سکی۔

بالآخر میں اٹھ کر اندر چلا گیا۔ عابدہ آج سفید کپڑوں میں بڑی ستھری اور ماڈرن لگ

رہی تھی۔ پلاسٹک کے تمام زیور غائب تھے۔ لپ سٹک کا نشان تک نہ تھا۔ دھلے

بالوں کی چھوٹی..... پاؤڈر لگی گردن سے لپٹ کر کندھے سے سینے پر لٹک رہی

تھی۔

”یہ تمہاری کیا عادت ہے موٹر سائیکل نیچے دھرا اور بغیر سلام دعا اوپر..... دھن

جگرا ہے بھابھی صولت کا..... میں تو ایک دن میں نکال دوں گھر سے..... یہ گھر ہے

کوئی ہوٹل تو نہیں ناں۔“

”بھائی مختار میری طبیعت کو سمجھتے ہیں۔“

”تم وحید کو تو مل لیتے..... اچھی بے نیازی ہے تمہاری۔“

جیسے کسی نے گرم پانی میں مجھے غوطہ دیا۔ اندر باہر تمام زخم کھل گئے۔

”میرا تو خیال تھا کہ سو برس کتے کی دم سیدھی کرو نہیں ہوتی۔ پر اس کو تو جلدی ہو

ش آگئی۔“

اس کے چہرے پر ہنسی تھی..... خوشی کا گلال بکھرا تھا۔

”ایسی معافیاں مانگی ہیں بھابھی صولت سے۔ کیا ہاتھ جوڑ جوڑ کر وعدے کیے

ہیں۔ اپنے علاج کا بھی وعدہ کر لیا ہے۔“

میرادل یکبارگی کانپنے لگا..... اس کی ہنسی میں فتح تھی مسرت تھی۔

”سنو عابدہ..... تمہارا خیال ہے وہ بدل چکا ہے۔ اب وہ تمہیں بہتر طور پر رکھے گا

جان من کوئی شخص کسی کی خاطر نہیں بدلتا نہیں بدل سکتا..... ایک بار تم چیچا وطنی پہنچ

گئیں تو پھر وہی بک بک جھک جھک ہو گئی۔“

وہ کچھ دیر چپ چاپ مونگ پھلیاں چھیلتی رہی۔

”اب میں ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتی ناں بھابھی صولت کے پاس..... پجاری

بہت عزت کرتی ہیں۔ لیکن کوئی کسی کو کب تک رکھ سکتا ہے..... اب عزت سے لے

جائے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“

”تم تو کہتی تھیں کہ اگر ایک لاکھ روپیہ بھی کوئی دے تو میں کبھی وحید کے ساتھ نہ

جاؤں۔“

تک کروہ بولی..... ”یہ میں نے کب کہا تھا۔ میں تو بس اس کی شکایت کرتی

تھی۔“

”ان ہی شکایتوں پر بھروسہ کر کے میں نے کہیں اندر ہی اندر تم پر اعتماد کر لیا۔ تم

..... تم میری شکتی ہو عابدہ..... تمہارے بغیر میں.....“

یکدم میں چپ ہو گیا..... اس بے سود تلاش سے فائدہ۔

”سمال ہے..... میں تو ہر وقت وحید کو ہی یاد کرتی رہی ہوں قیومی..... جیسے تم سبھی

کو یاد میں کھوڑے رہے ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سبھی تمہاری بیوی نہیں تھی اس لیے

تم صرف اس کی اچھی باتیں یاد کرتے تھے، میں وحید کی بیوی ہوں اس لیے اسے یاد

کرنے کا میرا طریقہ مختلف تھا۔ یا تو ہم دونوں ہی کرتے تھے ناں؟“
اس کے نزدیک ساری بات کل اتنی تھی۔ اتنی مختصر سادہ اور سچی۔

اس وقت مجھے پتہ چلا کہ یہ سیاہ گوش جیسے مردا سمجھ کر میں کئی مہینوں سے اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ اور اسے مردہ سمجھ کر اس سے اپنی زندگی کا پروٹو پلازم بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ یہ سیاہ گوش مرا ہوا نہیں تھا۔ صرف کچھوئے کی طرح مردے پن کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ مجھے جھپٹتے دیکھ کر اس نے جھر جھری لی اور ترنت جنگل کو روانہ ہو گیا۔

”اچھا تو قیومی اب میں چلوں..... اللہ تمہاری مدد کرے۔ خدا قسم مجھے کبھی کبھی تو تم پر واقعی ترس آ جاتا تھا۔“

وہ اٹھ..... کھڑی ہوئی اس کے اٹھنے کے انداز میں قطعیت تھی۔

”تم اس حیوان کے ساتھ نہیں رہ سکتیں..... وہ تمہیں نہیں سمجھتا..... اس کا علاج نہیں ہو سکے گا عابدہ۔“

”یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا۔“

واقعی یہ میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ وحید اسے نہیں سمجھتا اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔

”عابدہ میں ان گنت سوالوں میں گھرا رہتا ہوں..... اتنے سارے سوال..... کہ میرا اپنا وجود ان میں کھو گیا ہے..... تم جب تک ہوتی ہو..... مجھے یقین رہتا ہے کہ میں ہوں ورنہ..... ورنہ.....“

”تمہارا صرف اتنا قصور ہے قیومی کہ تم رشتہ داروں میں نہیں رہتے پودے کو جڑ چاہیے کھڑا رہنے کو.....“

”صرف تم میری جڑ بن سکتی ہو..... صرف تم“

”مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تم پاگل ہو دراصل اس کالج کی کم بخت نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے..... تمہارے دماغ کو گرمی ہو گئی ہے..... کسی دماغی امراض کے

ڈاکٹر سے ملو قیومی خدا کے لیے۔“

”تم اگر یہاں رہو گی تو..... میں ٹھیک ہو جاؤں گا رشتہ داروں سے ملنے لگوں گا..... اگر تم ایسے نہ رہنا چاہو گی تو میں تم سے نکاح کر لوں گا۔“

”ہے نامت ماری گئی تمہاری..... میں کیوں نکاح پر نکاح کروں گی؟ اس نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

پتہ نہیں کیوں میری آنکھیں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس لیے نہیں کہ مجھے عابدہ سے محبت تھی۔ میں اس سے کچھڑنا نہ چاہتا تھا بلکہ صرف اتنی بات تھی۔ وہ میری زندگی کے منفی پیٹرن میں ایک مثبت سہل تھی..... یقینی چیز تھی..... باقی سب کچھ غیر یقینی۔

”نیچے چل کرو حید سے نہیں ملو گے؟“

میں نے منہ پر لے کر لیا..... میں کسی گنجے کو متھاٹھینے نہیں جاسکتا اس وقت۔“

”لیکن آخر ہوا کیا ہے..... میں اس کی بیوی ہوں اب وہ لینے آیا ہے تو کیا میں اس کے ساتھ بھی نہ جاؤں خیر سے۔“

”ضرور جاؤ.....“ میں اونچے درخت کی آخری شاخ پر بوڑھے گدھ کی طرح چپ چاپ ہو بیٹھا۔

”عجیب پٹھا و ماغ ہے تمہارا..... کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرو جلدی سے جلدی۔“

”اور تمہارا دل بھی عجیب ہے..... اتنا کچھ تمہارے جسم کے ساتھ ہوا۔ اس پر رتی اثر نہیں ہوا؟“

”واقعات پر اپنا بس تھوڑی چلتا ہے گناہ تو آدمی سے ہوتے رہتے ہیں۔ بندہ بشر جو ہوا۔ تو بہ کر لے بس..... آئندہ کے لیے..... اللہ معاف کرنے والا ہے۔

”بس ساری اتنی سی بات ہے؟“

وہ کھسانی ہو کر بولی..... ”اچھا نیچے چل کرو حید سے ملو۔“

”جانے دو عابدہ تم سب ایک سی ہو۔“
 آج وہ اندر باہر بہت خوش تھی اسے اس بات پر بھی غصہ نہ آیا۔
 ”کسی ہیں ہم سب؟“

”جیسی بھی ہو ایک سی ہو۔“

میں نے چادر چہرے پر کھینچی۔ میرا خیال تھا وہ چادر اتارے گی غصہ جھاڑے گی
 ہمیشہ کی طرح بلائے گی منائے گی لیکن وہ کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر تو بہ استغفار پڑھنے
 کی آواز آئی۔ بعد ازاں کمرہ اس قدر چپ ہو گیا کہ چادر کے اندر مجھے خوف آنے
 لگا۔

کچھ دیر بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ کرگسوں کو منانے کوئی نہیں آئے گا تو میں
 نے چادر سے باہر سر نکالا۔ چائے کا سامان ٹرے میں دھرا تھا۔ دونوں پیالیوں میں
 ٹھنڈی چائے پر کریم کی جھلی چڑھی ہوئی تھی۔ پائنتی مونگ پھلیوں کے چھلکوں کا
 چھوٹا سا ڈھیر تھا اور ان کے قریب عابدہ کے سفید سیلپر پڑے تھے..... ربڑ کے سفید
 قینچی سیلپر۔

میں نے اٹھ کر ان سیلپروں کو غور سے دیکھا پر نام کیا اور پھر پلنگ کی چادر سے
 صاف کر کے الماری کی اوپر والی شلف میں رکھ دیا۔ اس کے پاس ہی میری ماں کی
 چھوٹی سی تصویر فریم میں جڑی ہوئی پڑی تھی۔ شاید اسی جذبے کے ساتھ راجہ بھرت
 نے بن باسی مہاراجہ رام چندر کی کھڑاویں راج سنگھاسن پر رکھی ہوں گی..... عابدہ
 کے چلے جانے کے بعد بہت عرصہ میرے دل پر اس کا راج رہا۔

دوسری صبح جب میں نیچے گیا اور میں نے مختار بھائی سے موٹر سائیکل مانگی تو مجھے
 پتہ چلا کہ عابدہ اپنے وحید کے ساتھ چیچہ وطنی جا چکی ہے۔

اس کے بعد میرے معدے میں پھر جلن رہنے لگی اور میں Anxiety کا شکار ہو
 گیا۔ دراصل گیس جلن اور بخیر کامیرے اندرونی اعضا سے اس قدر گہرا تعلق نہ تھا۔

جس قدر میری ذہنی شکستگی اور گولموں کا عالم جسمانی ریخت کا باعث بنتا مجھے شہر میں کئی ڈاکٹر بدلنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ وہ مجھے Antiacid دوائیاں دیتے۔ دودھ پینے کی ہدایت کرتے۔ مرچ مسالے والی چیزوں سے پرہیز کرنے کو کہتے اور اصرار کرتے کہ میں اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ کر فکروں سے آزاد ہو جاؤں۔ تمام ڈاکٹروں کے نسخے تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ وہی رہتے تھے۔ ڈاکٹروں سے اکتا جاتا تو حکیموں کی بیٹھکوں پر جانے لگتا۔ تبخیر معدہ جلن اور سوزش کے لیے وہ مجھے پلاسٹک کی ڈبیوں میں معجونیں اور جوارش دیتے۔ عرق کی بوتلیں میرے سر ہانے دھری ربتیں۔ حتیٰ کہ ان میں ہلکا ہلکا کاغذی سفوف سا تیرنے لگتا۔ ڈاکٹروں حکیموں کے علاوہ ہومیو پیتھک اور ہائیو کیمک دوائیوں کا بھی کمرے میں انبار لگ گیا..... جس وقت عابدہ گھر کو آنا فانا چھوڑ کر گئی اور میرا منہ کر دے لعاب سے بھرا رہنے لگا۔ میں نے کئی درکھٹکھٹائے۔

صحت کی تلاش میں ایک روز میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر فیضی کے پاس چلا گیا جس سے میری پرانی جان پہچان تھی۔

آئیے آئیے..... انہوں نے دروازہ کھول کر کہا۔

”آئیے السر کا کیا حال ہے؟“

”آپ باقاعدگی سے کالی فاس تھریٹ کھاتے رہتے تو افاقہ ہو جاتا۔“

”کھاتا رہا ہوں جی۔“

بیٹے! ہومیو پیتھک میں بس یہی خرابی ہے یہ تو مائی سین سے بھی زیادہ باقاعدگی

سے کھانا پڑتی ہے۔“

ڈاکٹر نے اپنی کاپی نکالی اس میں وہ صفحات نکالے جن میں میرے سسٹم لکھے

ہوئے تھے۔

نیند کا کیا حال ہے“

”بہت خراب۔ آہستہ آہستہ میں نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

”جمائیاں۔“

”آ نے لگیں تو بہت آتی ہیں۔“

”خواب؟“

”پریشان۔“ میں نے جواب دیا۔

”آنکھ پھڑکتی ہے اور کئی کئی گھنٹے پھڑکتی رہتی ہے؟ اس نے پوچھا

”جی..... درست ہے۔“

”کوئی آنکھ؟.....“ سوال ہوا۔

’باتیں؟‘

’کھلی؟‘

’ران پر..... باتیں‘

’اندر کی طرف کہ باہر کی طرف۔‘

’اندر..... کی جانب‘

وہ آہستہ آہستہ تمام سمٹم نوٹ کرتا رہا اور پھر اٹھ کر دو اینیوں کی الماری کے سامنے

جا کھڑا ہوا۔ اس وقت کوٹر کلینک میں داخل ہوئی۔

وہ بیاہی ہوئی بیگموں کی طرح باقاعدہ موٹی ان کلچرڈ اور باتونی ہو چکی تھی۔ ہم

دونوں ڈاکٹر کو بھول بھال کر بڑی دیر تک سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ اور ہم جماعتوں کی

باتیں کرتے رہے۔ ہر بار میں اس سے سیمی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن

پتہ نہیں کیوں زبان اسی لفظ سے گریز کر رہی تھی۔ سیمی کا ذکر کرنے کی آرزو نے مجھے

پروفیسر سہیل کی باتیں کرنے پر مجبور کر دیا۔

’ہائے پتہ ہے قیوم مجھے پروفیسر سہیل نے بڑا disappoint کیا۔ وہ میرے

ہر بنڈ کے ساتھ یونیورسٹی میں ہیں ناں آج کل۔ یاد ہے ناں ہم سب ان کو کتنا

idolize کیا کرتے ہیں۔“

”میں تو اب بھی انہیں پوجتا ہوں۔“

”چھوڑو..... بڑے تکلیف دہ آدمی ہیں۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ اور

اتنا چھوٹا Behave کرتے ہیں۔“

”واقعی؟..... میں نے مجرح ہو کر کہا

”میرے ہز بند کہتے ہیں ذرا نوج نہیں ہے سارا بولتا ہے۔ ذرا حافظہ اچھا ہے

کتا میں جلدی رٹ جاتی ہیں۔ ان کے اقتباس استعمال کرتے رہتے ہیں۔“

میرے سامنے پروفیسر سہیل آکھڑا ہوا۔ مجھے پروفیسر کا بڑا اچھا تجربہ تھا۔ خلیکین ہر

آدمی غالباً کانوں کا کچا ہوتا ہے کوثر کی بات نے میرے اعتبار میں چھید کر دیئے پیرا

فزکس پر مضمون لکھنے والا بھی ہی نکلا۔

”اب بھی younger generation اس کے چنگل میں پھنس جاتی ہے لیکن

فائدہ؟“

”جو آدمی کے ٹوجھنی اونچی باتیں کرے اور اپنے انیسویں گریڈ کے لیے مرتا کھپتا

رہے Strukes کروائے کلاسوں سے واک آؤٹ کرے..... وہ بالکل عظیم نہیں

ہو سکتا

کیوں؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں ابھی تک پروفیسر سہیل کی شخصیت سے متاثر تھا۔ میں

نے کوثر سے یہ بات چھپائی کہ میں وقتاً فوقتاً ان سے ملنے یونیورسٹی جاتا رہتا ہوں۔

”تمہیں ایک secret بتاؤں..... کوثر میری کرسی پر جھک کر بولی۔

’ہاں بتاؤ۔‘

”ہماری کلاس کی سیمی تھی ناں۔“

میرا جی لٹھے بھر کے لیے بجلی کے کھمبے کی طرح کھڑا ہو گا۔

”ہاں تھی۔“

”پتہ ہے یہ پروفیسر ہیل اس کے عشق میں مبتلا تھا۔ بڑا jealous تھا وہ آفتاب سے۔“

”نو.....!“

”یس.....!“

”نومائی فٹ۔“

”تم میرے پاس آنا نیوکیمپس میں..... میں سارا قصہ سناؤں گی تمہیں۔“

اس کے بعد کوثر ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے ساتھ مشغول ہو گئی۔ اس کے بیٹے کے دانت نکل رہے تھے اور وہ اس تکلیف دہ مرحلے کے لیے دوا لینے آئی تھی میں نے دو گولیاں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کھائیں باقی پڑیاں رومال میں باندھ کر جیب میں رکھیں اور کوثر سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے باہر چلا گیا۔

اس وقت میرا کوئی ارادہ نہ تھا کہ میں کوثر سے ملوں گا۔ لیکن کہانی کا ایک نیا کونہ یوں باہر نکل آیا جیسے دریا کا پانی اتر جائے اور غرقاب جہاز کا مستول نظر آنے لگے۔

اس تجسس لے ایک شام مجھے پھر نیوکیمپس جانے پر مجبور کر دیا۔

نہر کے کنارے کنارے پوپلر کے درخت ہوا میں مسلسل بل رہے تھے۔ سڑکیں خاموش تھیں۔ صرف ہوسٹل کے لڑکے لڑکیاں پٹریوں پر نظر آرہے تھے۔ میں لڑکوں کے ہوسٹل کی جانب مڑ گیا۔ کوثر اور اس کامیاں گھر پر موجود نہ تھے۔ ان کا سات ماں کا بچہ ایک انارٹی ملازم کی گود میں رو رہا تھا۔ جس وقت میں واپسی پر نہر کنارے پہنچا تو اچانک مجھے ڈاکٹر ہیل نظر آ گئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ملین ڈالر مسکراہٹ کے ساتھ دونوں ہاتھ ہلاتے آئے اور میرے موٹر سائیکل کی دونوں ہتھیاں پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

”کہاں بھی کہاں؟..... بڑے دنوں کے بعد نظر آئے نوکری مل گئی؟“

”مل گئی سر بھی کی۔“

”کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہے یہاں۔“

”نہیں جی۔“

پتہ نہیں کیوں میں اسے کوثر کے متعلق بتانا نہیں چاہتا تھا۔

پھر؟..... یہ ہوسٹل سائیڈ سے کیوں آرہے ہو۔“

”آپ کو تلاش کر رہا تھا۔“

”تو اترو آؤ چلو کیفے ٹیریا میں چلتے ہیں، میں بھی کئی دن سے تمہیں ملنا چاہتا تھا۔

”نہیں سر یہیں ٹھیک ہے نہر کنارے۔“ میں نے اپنا موٹر سائیکل فٹ پاتھ کے

پاس کھڑا کر دیا۔

سہیل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم دونوں نہر کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

”آج میرے دل پر بہت بوجھ تھا..... میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا مل جائے جس

کے ساتھ میں اپنی تھیوری share کر سکوں you know قوم..... آپ طالب علم

بہت مکینکل ہو گئے وہ متجسس نہیں رہے۔ وہ علم دوست نہیں رہے وہ..... اچھا ہوا

مجھے تم مل گئے..... میرے دل پر بہت بوجھ تھا آج۔“

میرا دل دھک دھک کرنے لگا..... خیال تھا کہ وہ سیمی کے متعلق کچھ بتائے گا۔“

تم کو یاد ہے کہ ایک بار میں نے تمہیں ایک assignment لکھنے کو دی تھی.....

دیوانگی کی وجہ اور میں نے بار بار کہا تھا کہ یہ وجہ چاہے کتنی بھی far fetched کیوں

نہ ہوں۔ لیکن نظریہ تمہارا اپنا ہونا چاہیے۔

’جی مجھے یاد ہے۔‘

”میں کئی سال لڑکوں کو یہی Assignment دیتا رہا ہوں لیکن آج تک کسی

سٹوڈنٹ نے کوئی نئی بات نہیں کی..... اب میں نے یہ سوال پوچھنا چھوڑ دیا ہے سب

کتا بوں سے چرا کر لکھ لاتے ہیں۔

مجھے ابھی تک یاد تھا کہ جس روز ہم دیوانگی کی آخری شکل خودکشی کی باتیں کر رہے تھے سیمی نے سفید کرتا اور نیلی جینز پہن رکھی تھی۔

”ابھی ابھی کچھ دن پہلے ساری بات شیشہ ہوگی قیوم..... میں سمجھ گیا ہوں دیوانگی کی اصلی وجہ کیا ہے ہر وقت میں سوچتا رہتا ہوں کہ وہ ذہنی پراگندگی جس کی وجہ سے کوئی شخص خودکشی پر آمادہ ہوتا۔ یہ وجہ بھی اس فعل کی طرح مکمل طور پر مہوت کرنے والی ہونی چاہیے۔ دراصل دیوانگی ایک خارجی علامت ہے لیکن اس کی وجہ خارجی نہیں..... اس کی اصلی وجہ میں بتاؤں قیوم..... بتادوں بولو..... راز افشاں کردوں دیوانگی کا۔“

کھلی آنکھوں والا وہ پروفیسر اس لحظہ مجھے خود دیوانہ سا نظر آیا..... کیا اس کی دیوانگی کی وجہ بھی سیمی تھی۔

”بتائیے سر..... ضرور.....“

”میں بات کو سادہ کہہ دوں گا اور زیادہ تفصیلات میں نہیں پڑوں گا تم نے کبھی بائیولوجی پڑھی ہے۔“

”میسٹرک میں پڑھی تھی..... سر۔“

”پڑھا کر بائیولوجی..... کوئی آدمی بوٹونی بائیولوجی اور فزکس کے بغیر اپنے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اس کی قدرت کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسے سمجھ نہیں آسکتی کہ کیسے اس کی تقدیر اس کی حیاتیاتی وراثت ہے۔ تمہاری آنکھوں کا رنگ۔ قد کی لمبائی رنگت ہی genes کے تابع نہیں تمہارا گوشت ہڈی اور اعصاب پر ہی Genes حاوی نہیں بلکہ ہر خلیے کے نیوکلیس میں کروموسومز کے ربن میں انسان کی تقدیر چھپی ہوتی ہے۔“

اس نے اپنے لب میرے کان کے ساتھ لگا دیے۔

”اور بیٹا جی مغرب کے لوگ مانیں نہ مانیں لیکن ان ہی جینز کے اندر ہماری

دیوانگی کا راز پنہاں ہے۔“

”کیسے سر! کیا آپ ماحول پر genetics کو ترجیح دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ دونوں چیزیں بالاولیٰ اسطہ یا بالاولیٰ اسطہ ایک دوسرے کے بغیر چل نہیں سکتیں۔

ہمیں نے دیوانگی کا راز پالیا ہے قیوم اور وہ ہے تغیر نوع یا mutation سادہ طور پر سمجھ لو کہ جب کبھی evolution ہوتی ہے کوئی specie بدلتی ہے اس کی وجہ سے geve mutation ہوتی ہے ارتقاء انسانی کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے میں تبدیلی ہو۔ ہرنی پود پچھلی سے مختلف ہو..... یہ تبدیلیاں ابھی مکمل طور پر دریافت نہیں ہو سکیں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ ساری تبدیلی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

quees پوری طرح تغیر پذیر ہوں تو ارتقاء ہوتا ہے ٹوٹ پھوٹ جائے تو دیوانہ پن پیدا ہوتا ہے۔“

”سر آپ کا سارا علم مغرب سے مستعار لیا ہوا ہے۔ غالباً اسی لیے اس میں نیا پن نہیں ہے۔“ میں کوثر کی باتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

سہیل نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا..... Bastard کہتے..... تم سچ ہو لیکن جب میری ساری بات سنو گے تو شاید اپنی رائے بدل لو گے جیسے میں اپنے متعلق اپنی رائے بدل چکا ہوں tranquilizers, radiation اور ایسا ہی کئی زہریلی دوائیوں سے quess میں خطرناک mutation ہو جاتی ہے آج کا مغربی سائنس دان اس حقیقت سے بہت خوفزدہ ہے وہ جانتا ہے کہ ان باتوں سے تغیر تو ہوتا ہے لیکن مکمل نہیں ہوتا۔ تغیر پذیر gene لولالنگٹرا ہو جتا ہے اور آنے والی نسلوں پر بڑے خطرناک نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

مثلاً دوسروں والا بچہ..... چھ انگلیوں والی اولاد..... ماتھے کے درمیان تیسری آنکھ والی مخلوق..... ایسے gene کے نتائج کچھ ہی ہو سکتے ہیں۔ بازو نہ ہوں سرے

سے..... لیکن میں نے ایک اور وجہ بھی دریافت کی ہے..... ایک نئی اور انوکھی وجہ جس سے تغیر پذیر ہوتے ہیں اور دیوانگی ہوتی ہے..... غور سے سنو میں اپنی تھیوری patent کروانے والا ہوں غور سے سنو..... یہ مغرب والے جب یہی نتیجہ اخذ کریں گے تو تم جیسے چر کئے اسے فوراً اپنالیں گے۔ لیکن اپنے آدمی کا اعتبار نہیں کریں گے۔ یہی سیاہ آدمی کی پس ماندگی کی وجہ ہے۔“

”آپ تھیوری تو بتائیں سر۔“

”مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی genes کو متاثر کرتا ہے رزق حرام سے ایک خاص قسم کی mentation ہوتی جو خطرناک ادویات شراب اور radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے رزق حرام سے جو genes تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ وہ لو لے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں نسل انسانی سے۔ یہ جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان genes کے اندر ایسی ذہین پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کر لو رزق حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔ اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے۔ وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں..... کیوں اب بتاؤ یہ بات مغرب کے علم سے مستعار لی ہے کہ مشرق سے؟

میں حیران پریشان ان کا منہ ٹکنے لگا۔

یاد رکھا بھی مغرب والے یہاں تک نہیں پہنچے..... جب ہم سور کا گوشت نہیں کھاتے تو وہ حیران ہوتے ہیں۔ جب ہم بکرے پر تکبیریں پڑھ کر اسے حلال کرتے ہیں تو وہ تعجب سے دیکھتے ہیں۔ جب ہم عورت سے زنا نہیں کرتے۔ نکاح پڑھ کر اسے اپنے لیے حلال بناتے ہیں تو وہ سمجھ نہیں سکتے..... بھائی میرے کیسے سمجھیں حرام حلال کا تصور انسانی نہیں ہے اس لیے..... اس میں بھید ہے گہرا بھید

gene mutation کا..... حرام حلال کی حد سب سے پہلے بہشت میں لگائی تھی
اللہ نے ۔

”آپ کی بات انوکھی تو ضرور ہے پروفیسر صاحب۔ لیکن مجھے کچھ ان سائنٹسٹک
لگتی ہے۔

لگے گی لگے گی لگتی رہے گی۔ کیونکہ بات کرن والا ایک معمولی مشرقی آدمی ہے۔
تمہارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نیوکیمپس پر چلنے والا..... کہیں جو یہ نظریہ مغربی فلاسفر
کے منہ سے سن پاتے تو فوراً قائل ہو جاتے..... مائی ڈیئر سٹوڈنٹ..... حرام کیا ہے؟
وہ جس سے منع کیا گیا..... اچھے اور برے کا سوال نہیں ہے، صرف جو چیز منع فرمائی
ہے اللہ نے وہ حرام ہے اسی لیے حرام و حلال کا جھگڑا سب سے پہلے جنت میں پیدا
ہوا۔ جب حضرت آدمؑ نے شجر ممنوعہ سے توڑ کر کھایا۔ اچھے برے کا سوال نہیں
تھا..... بس وہ جو منع تھا اپنے پر حلال کیا..... اس گندم کے دانے کا رزق حرام جس
وقت ان کے جسم میں داخل ہوا..... ایک خطرناک تغیر آیا ان کے جسم میں ان کے
genens میں..... اس تغیر سے اللہ نے انہیں ڈرایا تھا۔ اس وقت تک حضرت آدمؑ
اور اماں حوا کے تمام خلیے صالح تھے۔ ان کا نیوکلس محفوظ طریقے سے ٹوٹتا ہے لیکن اب
اس نیوکلس میں چھپے ہوئے genes میں تبدیلی آئی genens mutat ہوئے
لو لے لنگڑے اندھے اور ناامید اور آنے والی نسلوں میں منتقل ہو گئے..... اسی لیے
دیوانہ پن کے پہلے آثار ہابیل اور قابیل کے جھگڑے میں واضح ہوئے۔ پہلا قتل ہوا
حضرت! دیوانگی خودکشی کی مشکل میں منج ہوئی کہ قتل کی شکل میں اس سے کون انکار کر
کتا ہے کہ دیوانگی کی شدید شکل انسان کش ہے..... جھگڑا ہابیل قابیل میں نہ ہوا
تھا..... یہ ان کی وجہ تھی جو حضرت آدمؑ کے وجود میں شجر ممنوعہ کے کھانے کی وجہ سے
ٹوٹے پھوٹے تھے..... پھر چل سوچل ہوا..... ایک سے دوسری پود تک ہم یہی ورثہ
دیتے آئے ہیں۔ خود رزق حرام کھاتے ہیں اور آنے والی نسلوں کو پاگل پن کی

وراثت genes میں پیک کر کے عطا کرتے ہیں۔ بیٹا نہ سہی پوتا سہی، پوتا نہ سہی چند نسلوں آگے کوئی شریف انفس بچی سہی..... اس تقدیر سے کوئی بچ نہیں سکتا جو genes میں لکھی جاتی ہے۔

”غالباً آپ بابا آدم کی مذہبی کہانی کو نئے طور پر interpret کر رہے ہیں،“
 ”مائی فٹ..... ڈاکٹر ہیل چلایا..... مذہبی کہانی کی نئی توجیہ ایک معمولی کام ہے میں ایک بہت بڑا انکشاف کر رہا ہوں..... سیدھی سی بات ہے بھائی میاں جو کچھ ہم کھاتے پیتے ہیں اندر جا کر ہمارے لہو کی ساخت پر اثر انداز ہوتا ہے۔
 ہوتا ہے کہ نہیں..... اندر بلڈ کیمسٹری چلتی ہے کہ نہیں؟“
 ”جی چلتی ہے۔“

”تو سمجھ لو بخوبی طور پر کہ جو رزق حلال ہم اندر ڈالتے ہیں۔ اس کا بلڈ کیمسٹری پر مثبت اثر ہوتا ہے اور جو رزق حرام اندر داخل ہوتا ہے اس کا منفی اثر ہوتا ہے ہمارے لہو پر۔“

یعنی ایک بوری آنا جو حرام کی کمائی سے آیا اور ایک بوری آنا جو حلال کی کمائی سے آیا..... ان کی بلڈ کیمسٹری مختلف ہوگی؟ جانے دیجئے سر۔

”ضرور..... یقیناً..... انشاء اللہ..... جو شخص حرام کی بوری سے کھائے گا۔ اس کے لہو کی کیانی حالت مختلف ہوگی اور اس لہو میں genes کی توڑ پھوڑ منفی ہوگی۔“
 ”جائیں سر..... جانے دیں۔“

”مان جائیں بابا جی مان جائیں مغربی تعلیم کے پرستارو جی مان جائیں۔ اگر کبھی مغرب کے پاس حرام حلال کی تصور ہوتا تو وہ کبھی کے پاگل پن کی اصلی وجہ دریافت کر لیتے۔“

”جناب پروفیسر بقراط صاحب..... آنا ایک مادی چیز ہے اس کا جو کچھ بھی کیمیکل اثر ہوگا۔ دونوں حالتوں میں ایک سا ہوگا کیونکہ ان دونوں میں ایک خاص

مقدار تک کاربوہائیڈریٹ اور پروٹیز وغیرہ ہوں گے۔

پانی مادہ ہے..... ہے کہ نہیں؟ لیکن دم کیے ہوئے پانی کی تاثیر بدل جاتی ہے جس پانی میں سے بجلی گزرتی ہے۔ اس کے اثرن پھٹ جاتے ہیں کہ نہیں گدھے آدمی جس وقت آثارِ رزق حرام سے خریداجاتا ہے اس میں ایک منفی چارج جمع ہو جاتا ہے۔“

”چھوڑیفس سر بات آپ folvore کی کر رہے ہیں اور بنانا اسے سائنٹفک چاہتے ہیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ دادا کا گناہ پوتے تک کیسے پہنچتا ہے..... مفلس کیسے سفر کرتی ہے انسانوں ڈمیں۔

”بیماریاں طے ہے کہ کچھ موروثی ہوتی ہیں۔

”اور دیوانہ پن؟“

”دیوانہ پن موروثی ہو سکتا ہے اور ماحولیاتی بھی لیکن موروثی کی وہ وجہ نہیں ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں۔

مانو گے مانو گے بچو! ابھی نہیں..... جس وقت کوئی سفید صاحب تمہارے گلے میں انگوٹھا دے گا تب!..... تب آپ کا باپ بھی مانے گا کہ رزق حرام ہی پاگل پن کی اکلوتی وجہ ہے۔

”میرا باپ بیوروکریٹ نہیں ہے سر..... شاید وہ آپ کی بات مان جائے۔“

سہیل نے میرے کندھے پر زور ڈال کر پوچھا..... کہاں ہے تمہارا باپ وہ میری بات ضرور سمجھے گا..... وہ جانتا ہو گا کہ اللہ علیم ہے..... اگر اس نے گوشت پر تکبیر پڑھنے کا حکم دیا ہے تو..... وجہ ہوگی ضرور کوئی۔ میں اسے بتاؤں گا کہ کیا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اگر تکبیر نہ پڑھی جائے تو..... ظالم سوچ تو سہی کی تکبیر پڑھنے سے مرغی کا گوشت بدل جاتا ہے؟..... نہیں۔ ہرگز نہیں صرف حرام گوشت سے

genes پر منفی اثر پڑتا ہے۔ یہ ساری حکمت تھی..... اور تم جیسے کو دن کو میں سمجھا رہا ہوں اور تم سمجھتے نہیں۔

اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور بولا / مذہبی اعتقادات ہیں ہی سائنس بنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سور کا گوشت حرام ہے۔ اس پر سو تکبیریں پڑھ لو، یہ حرام ہی رہے گا، جو کھائے گا وہ اپنی genen mutation کا خود ذمہ دار ہوگا۔
 ”کیا اسی لیے عورت کو بھی حلال کر کے استعمال کرنے کا حکم ہے“ میں نے طنز سے سوال کیا،“

”زنا سے پیدا ہونے والے بچے کو تو gene mutation کا سو فی صد خطرہ ہوتا ہے زنا سے منع کیوں کیا اسی لیے ورنہ جسمانی تعلق کوئی بدل تھوڑی جاتا ہے شادی کرانے سے..... یا نہ کرانے سے..... جسمانی تعلق دونوں صورتوں میں وہی رہتا ہے۔

”پلیز آپ عورت کو بکرے کے گوشت سے نہ ملائیں، آج کل ویمن لبریشن چل رہی ہے کسی عورت نے سن لیا تو وہ آپ کو حلال کر دے گی..... بلکہ حرام کر دے گی۔“ وہ نہر کنارے خود رد گھاس پر بیٹھ گیا اور چپ ہو گیا، پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر بہتے پانی میں پھینکا، تھوڑے سے چھینٹے اڑے اور پانی روانی پر قائم ہو گیا اس قوت میرے جی میں آئی کہ میں اس سے سیمی کے متعلق پوچھوں۔ وہ کس حد تک سیمی میں گوندھا گیا تھا؟

”یارسو چوتو بکرے کا گوشت مادی رزق کی شکل ہے..... عورت کا گوشت کو کبھی کبھی روحانی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن ہے وہ بھی رزق ہی کی شکل..... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رزق چاہے مادی ہو یا روحانی genes کو متاثر ضرور کرتا ہے تم مانو نہ مانو یہ حرام و حلال کا بڑا ظالم چکر ہے..... کبھی کبھی رزق حرام سے فردا فردا پاگل پن پیدا نہیں ہوتا..... بلکہ قوم کی قوم دیوانی ہو جاتی ہے سوڈا اور گومورا کی طرح مائی

ڈیرن عورت کے معاملے میں تو بہت احتیاط برتنی چاہیے، اس کے پاس تو مشین موجود ہے..... ایسا بچہ جن دیتی ہے فٹ زنا کے بعد..... اور آنے والی نسلوں میں بچہ چھوڑ دیتی ہے دیوانگی کے۔

”اچھا سر میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا“

بھاگو..... بھاگو..... تم صاحبزادے کبھی حاضر نہیں ہو گے۔ ہم جیسے پروفیسروں کے پاس کبھی کوئی حاضر نہیں ہوتا..... تم لوگ ایسی لڑکیوں کے پاس وقت گزارنا چاہو گے جو تمہیں..... اچھا چھوڑو this is your age

”آپ بھی مجھ سے کچھ زیادہ بڑے نہیں ہیں سر اور پھر جب کبھی میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں آپ حوصلہ شکنی کر دیتے ہیں ڈ۔

اس نے اپنی کھوپڑی پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا..... یہاں..... بہت بڑھا ہو گیا ہوں قیوم..... دعا کرنا میری تھوڑی کامیاب ہو جائے۔

”ہوگی جی انشاء اللہ ضرور ہوگی“

”اس نے لمبی سانس بھر کر کہا..... میں بڑا ہی چھوٹا آدمی ہوں مجھے پاکستان سے ایسی تعصب انگیز محبت ہے کہ میں کوئی بڑا کام کر نہیں سکتا، میں جب بھی سوچتا ہوں پاکستان کی terms میں سوچتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ یہ پدا سا ملک جغرافیہ کے نقشوں میں کسی طرح بڑا ہو جائے۔ جب کبھی ہماری ہاکی ٹیم یا کرکٹ ٹیم کوئی میچ جیت جاتی ہے تو ایک foolish لڑکی کی طرح میرا تالیاں بجانے کو جی چاہتا ہے..... یا میرا جی چاہتا ہے کہ میری تھوڑی کامیاب ہو۔ مغرب کے لوگ قائل ہوں کہ ایک پاکستانی مسلمان نے اتنا بڑا کام کیا۔

”انشاء اللہ سہیل صاحب ایسے ہی ہوگا۔“

Its very silly of me لیکن میں نے پاکستان سے زیادہ کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی..... سہی شاہ سے بھی نہیں

میر آرزو کا بوم رنگ کیسی آسانی سے نشانے پر ہو کر میری طرف لوٹ آیا

”آپ کو یسی شاہ سے؟..... کمال ہے سرجی۔“

”لیکن یہ محبت..... اچھا میں پھر کبھی explain کروں گا۔ ابھی مجھے اور بہت

کچھ سوچنا ہے۔ وہ بالکل چپ ہو گیا۔

آدھے گھنٹے بعد جب میں اٹھتے لگا تو سہیل بولا..... یاد رکھو..... ایک اور قسم کا

بھی رزق ہوتا ہے حرام و حلال سے پرے..... ایک بار اللہ میاں نے اپنی چہیتی قوم

بنی اسرائیل کو بھی وہ رزق دیا تھا۔ یہ رزق نہ حرام ہوتا نہ حلال اور..... اس سے ایک

آگاہی پیدا ہوتی ہے عرفان جنم لیتا ہے جو عام آدمی کے لیے دیوانے پن ہی کی ایک

شکل ہے لیکن اس دیوانے پن کو سمجھنے کی ضرورت نہیں نہ ہی اس کی سمجھ آ سکتی۔ کیونکر

یہ صرف اسی رزق سے پیدا ہوتا ہے جو اوپر سے اترتا ہے جس سے genes لمحہ بھر

میں صدیوں کا ارتقاٹ کر جاتے ہیں۔ ان میں ایسا تغیر آتا ہے جو قرون کی

صالحہ mutation سے پیدا ہو سکتا ہے تم دیکھتے نہیں اسرائیلیوں میں کتنے سوپر ڈھن

لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اسی من و سلوی کا اثر ہے اب تک اب تو آپ حد سے بڑھ

رہے ہیں۔

گدھے آدمی..... اگر انسان پالتو مرغیوں کو ایک خاص قسم کی فیڈ دے کر انڈے

دینے والی مرغیاں بنا سکتا ہے..... اگر شہد کی مکھی اپنے بچوں کو کھلا کر رانی مکھی بنا سکتی

ہے تو اللہ میاں اتنے پر بھی قادر نہیں..... کہ خاص رزق دے کہ عام انسانوں میں

سے پیغمبر بنا سکے ولی ڈھال سکے، عرفان عنایت کر سکے۔ چل اٹھ جا اب اور اپنے

السر کے لیے کچھ کر تو اسی قابل ہے کہ تجھے ہر وقت anxiety ہے اور تو گیس کا شکار

ہو۔“

میں چپ چاپ اٹھ گیا ڈاکٹر سہیل اس قوت ایک اور شخص تھا میری اس سہیل

سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اس اجنبی کونہر میں پتھر پھینکتے ہوئے چھوڑ کر میں گھر

آگیا۔ میں نے اپنی الماری کھولی اور پر والی شیلف میں جوں کے توں عابدہ کے سفید سلپرز پڑے تھے۔ ان سلپروں کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے ریڈیو سٹیشن کی ایک آرٹسٹ یاد آگئی جس کے پاؤں بہت گورے تھے اور جو ہمیشہ ربڑ کے سفید سلپرز استعمال کرتی تھی

دن چڑھے

رزق حرام

سندھ طاس میں اس جگہ جہاں اب رانی کوٹ کا بے آباؤ قلعہ ہے۔ یہاں خشک تال تھے جن کے ارد گرد چھدری ڈاڑھی کی طرح درختوں کا سلسلہ تھا جن میں جب سمندری ہوئیں چلتیں تو قدم آدم گھاس انوران درختوں میں چھپے ہوئے پوکھروں کی خود روئیدگی آہستہ آہستہ ہلنے لگتی ہے اور خوشبو دار ہو جاتی..... ہواؤں میں نمی اور تالابوں کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں گنے کا باسی رس کی خوشبو دار تھی سارے۔ میں نیند تعویذ فن تھا مورفیا کی بھول بھلیاں تھیں۔ ایل ایس ڈی کے خواب تھے۔

اس بار چیل جاتی نے کانفرنس سے بہت پہلے جنگل کے تمام پرندوں کو اپنا ہم زبان بنالیا۔ وہ بھاری اکثریت سے جیت جانے کی امید لے کر آئے تھے۔ کالی کچی مہر لاٹ قازم لے، جنگلی تیتھر سب چیلوں کی ٹکڑیوں میں مھسے بیٹھے تھے اور جانتے تھے کہ اس بار راجہ گدھ اور اس کے ہم مشربوں کو ضرور جنگل بدر کا کم مل جائے گا۔

راجہ گدھ کو اپنی وکالت کے لیے وکیل ڈھونڈنے میں بڑی مشقت کرنا پڑی تھی۔ ریڑھ والے جانور اس باتوں کو دیوانہ پن سمجھتے۔ ریگنے والوں کے پاس پہنچا تو وہ اس کی بات نہ سمجھ سکے۔ تھک ہار کر اس نے گیدڑ کو اپنی پیروی پر رضامند کیا تھا۔ لیکن اتنے انتظار کے باوجود ابھی تک گیدڑ چوپال میں نہیں پہنچا تھا۔ اب تو راجہ

گدھ کے کھ میں بھی چہ میگوئیاں ہونیل گیس تھیں۔

جس وقت یسرغ کی سواری آئی۔ ساریے میں آندھی چلی..... لال آندھی جس میں چھوٹے چھوٹے کنکر سرخ مٹی اور سوکھے پتے تھے۔ پھر بڑے جٹادھاری درخت پر جیسے بجلی گری۔ تمام جنگل سفید ہو گیا اور پرندوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس کے بعد سارے میں امن اور شانتی پھیل گئی۔

یسرغ نے تین بار اپنے تن کی فاسفورس جیسی بتی بجھائی اور سوال کیا..... کیا ملزم حاضر ہے۔“

”حاضر نہیں۔ آقا..... اور حکم کے منتظر ہیں۔“ راجہ گدھ نے کہا۔

’تجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہو تو کہہ؟‘

راجہ گدھ نے لجاجت سے نظریں جھکا کر کہا..... گیدڑ میرا وکیل ہے آقا..... وہی کچھ میری ترجمانی کر سکتا ہے۔“

سارے جنگل میں خاموشی چھا گئی۔ اور جنگل پار سے سانپوں کے پھنکارنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

”پھر نکال اپنے وکیل کو..... کہاں ہے وہ؟..... چیلوں کی ملکہ بولی۔“

راجہ گدھ نے دور تک نظر دوڑائی اور لجاجت سے بولا..... آقا ہمیں کچھ مہلت دے تا کہ ہمارا وکیل پہنچ جائے اور ہماری بے بسی پر روشنی ڈال سکے۔ اگر قصور ہمارا نکلا تو یقین رکھ ہمیں حم کی ضرور نہ ہوگی۔ ہم خود جنگل چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اللہ کی مخلوق کے لیے یہ کرہ ارض تنگ نہیں ہے۔ ہمیں کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی۔“

چیلوں کو معلوم تھا کہ وہ عوام کو رام کر چکے ہیں اور رگدھوں کی پشت پناہی کے لیے کوئی بھی تیار نہیں۔ حتیٰ کہ مینا بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ ایک چیل نے تنک کر کہا..... ”اے راجہ گدھ ہم اس وقت تک تیرا انتظار نہیں کر سکتے۔ جب تک

دوسری بار بنی نوع انسان تہذیب یافتہ ہو کر دوبارہ ایسے بم بنائے جو ایک ہی سانس میں میلوں تک بستیاں کھا جائیں نکالنا ہے تو اب حاضر کراپنے وکیل کو۔“

اس وقت حبشہ کے دیس کی ایک بوڑھی گدھ بولی.....“ سمرغ! ہمرے وکیل پر جانوروں کا بہت دباؤ ہے جانور اس معاملے سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کو خوف ہے کہ اگر جنگل بدر کی رسم پرندوں میں رواج پاگئی..... تو رفتہ رفتہ جانور بھی کوئی نہ کوئی الزام لگا کر جلا وطن کا طریقہ رائج کر دیں۔ وہ گیدڑ کو روک رہے ہیں..... پرندوں نے معاملے میں دلچسپی نہ لے لیکن ہمارا وکیل ارادے کا پکا ہے..... آتا ہی ہوگا۔“

اس وقت سرخاب نے پر جھاڑے تو توقیر سے بولا..... عالی جناب کچھ پرندوں کا خیال ہے کہ جنگل بدر کی سزا مناسب نہیں..... جو جنگل کے لیے پیدا ہوئے ہیں انہیں یہیں رہنا چاہیے جو پانی کے باسی ہیں ان کے لیے پانی افضل مقام ہے۔ اگر ہم اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں دست درازی کریں گے تو وہ کسی نہ کسی عذاب کی شکل میں ہمیں سزا ضرور دے گا اور ہماری کئی ذاتیں ایسے معدوم ہو جائیں گی جیسے پرانے زمانے کے پہاڑ پیکر جانور.....“

چیلوں کی ملکہ طمطراق سے سارے میں گھومی اور چلا کر کہنے لگے..... ان پرندوں کی نشاندہی کی جائے جو اس طرح سوچتے ہیں۔ ہم ان سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

سرکاری وکیل نے جزبہ ہو کر کہا..... افسوس ان کمزور پرندوں کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ رازداری میں بتائی گئی بات کو افشا کرنا میرا منصب نہیں۔“

اس بات پر چیلوں کی ٹکڑی میں پر پھڑکانے کی صدائیں بلند ہوئیں اور پھانت بھانت کی چہکار سے خشک تال گونج اٹھا تھوڑی دیر بعد سرخاب نے مجمع کو کنٹرول کر کے کہا.....“ اور کچھ پرندوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جو نہی گدھ جنگل سے باہر نکلے یہ

شہروں میں رہیں گے پھر انسان کو بھی ویسے ہی استعمال کرے گا جیسے صدیوں سے وہ گدھے گھوڑے بیل اور دودھ دینے والے جانوروں کو زیر استعمال لاتا رہا ہے..... آہستہ آہستہ انسان تک ہمارے وہ تمام راز پہنچ جائیں گے جو آج تک محفوظ ہیں وہ ضرور پرندوں کی بولی سیکھ لے گا۔“

تیترنیا کا کسبر میکاؤ اٹھا اور مودب لہجے میں بولا..... ”جنگل والے خواخوہ انسان سے خائف ہیں ہم انہوسی انسانوں میں رہتے ہیں وہ بڑی شرافت سے ہمارے ساتھ گزر بسر کرتے ہیں آقا کرگس جاتی اگر شہروں کو جاتی ہے تو جانے دے ہمیں فکر نہیں کرنا شایعہ کیونکہ اول و آخر انسان ہی اللہ کا خلیفہ ہے اور ہم سے زیادہ جانتا ہے۔“

سیمرغ نے تین بار فاسفورس کی بتی بند کی اور گویا ہوا..... ”تو ٹھیک کہتا ہے میں جانتا ہوں صرف انسان ساکن ہے کائنات کی باقی تمام اشیاء متحرک ہیں کیونکہ انسان مطلوب ہے اور باقی ہر شے طالب..... افسوس انسان نے اپنے آپ کو مطلوب کی جگہ سے ہٹا کر طالب بنالیا ہے اسی لیے گردش میں ہے ورنہ وہ اس قدر دیوانے پن کا شکار نہ ہوتا اور اب تک اللہ کی رضا کو پالیتا۔“

اس وقت چیل جاتی کے ایک حواری سارس نے کہا..... ”آقا! انسان طالب ہو یا مطلوب..... متحرک ہو کہ ساکن..... فرزانہ ہو کہ دیوانہ..... نجات کو پہنچنے والا ہو کہ تباہی سے ہمکنار ہونے والا..... ہم کو انسان سے غرض!..... انسان کے گرد گھوم کر ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔“

سیمرغ نے قہقہہ لگایا ناریل کے درخت اس قہقہے سے لرزنے لگے۔
 ”سنو اس احمق کی بات سنو..... بیوقوف اس کائنات کے جو بھی فیصلے ہوتے ہیں وہ جو بھی فیصلے ہوں گے کسی نہ کسی طرح آخر میں انسان ان سے متاثر ہوتا ہے یا انہیں متاثر کرتا ہے۔“

اس وقت گیدڑ تال میں ایسے اتر جیسے شیر سرکس کے پنجرے میں حاضر ہوتا ہے۔ سارے میں نسانا چھا گیا گیدڑ نے اپنی گھپے دار دم کے ساتھ تین بار کورنش ادا کیا اور پھر بڑے کے درخت کی طرف چہرہ کر کے گویا ہوا..... ”اے پرندوں کے بادشاہ! میں صورت حال سے اچھی طرح واقف نہیں کہ کچھ مجھ تک پہنچا دے ملزم کی زبانی تھا اس تک طرفہ بیان پر اکتفا نہیں کر سکتا اگر واضح اور مختصر الفاظ میں مجھ تک راجہ گدھ اور ان کی برادری کا قصور بیان کر دیا جائے تو میں دفع الزام کی کوشش کروں۔“

چیل ملکہ نے جلال میں آکر کچھ کہنے کو زبان کھولی لیکن سرخاب نے اسے روکا اور بیان کیا۔

”سن گیدڑ..... اس روئے زمین پر چند پرند حیون انسان سب خیر و برکت سے رہتے تھے۔ صرف انسان فتنے سے خالی نہیں اس نے اپنی عقل سے اپنے آپ کو متمدن کیا اور پھر اسی عقل کا سہارا لے کر ایسے ہتھیار ایجاد کیے جس سے بستیاں اجاڑ، مرگزار تباہ اور اللہ کی زمین پر فساد پھیلا..... چیلوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انسان دیوانہ ہے اور اس کی دیوانگی کا یہ اکتفا ہے کہ وہ اپنی ہی نسل کو نیست و نابود کر کے.....“

”سانپ کی طرح کہ خود ہی کھا جائے“ چیل ملکہ بولی۔

”چیلوں کو ڈر ہے کہ گدھ پر بھی دیوانگی کے دورے پڑنے لگے ہیں وہ نہ ہو کہ یہ بھی جنگل کے باسیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے..... اسی لیے چیل ملکہ دعویٰ دار ہے کہ راجہ گدھ اور اس کی برادری کو جنگل بدر کا حکم سنایا جائے۔“

گیدڑ نے پنچے سے اپنی ناک کھجائی اور تھمل سے بولا..... ”کیا تو وضاحت کر سکتا ہے کہ دیوانگی کیا چیز ہے؟“

سرخاب نے مدد طلب نظروں سے ملکہ چیل کی طرف دیکھا

ملکہ چیل بولی..... ”ہاں دیوانگی کی کچھ علامتیں ہیں جو ذی روح اپنے آپ کو یا

اپنے ہم جنسوں کو خود ختم کرنے کی کوشش کرے وہ دیوانہ ہوتا ہے۔“
 گیدڑ نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہا..... ”تو کیا گدھ خودکشی کا یا پھر قتل کا مرتکب
 ہوا؟“

جیل جاتی میں تھوڑا سا خوف پھیل گیا۔

”ابھی نہیں ابھی آغاز ہے..... ابھی گدھ دیوانگی کے انجام کو نہیں پہنچا ابھی چاند
 راتوں میں پچھلے پہر یہ تالوں میں آوارہ پھرتا ہے ایسی آوازیں حلق سے نکالتا ہے
 جیسے پتے ہوئے لوہے پر پانی کے چھینٹے..... یہ دیوانگی کا آغاز ہے فاضل جج دیکھ گا
 کہ بہت جلد رجبہ گدھ اس انتہا کو پہنچنے والا ہے یہاں پہنچ کر آج کے انسان نے اپنے
 ہم جنسوں کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے..... پھر کوئی طاقت اسے جنگل کے جانوروں
 کو ختم کرنے سے نہیں روک سکے گی۔“
 ”کیا یہ گدھ ہمیشہ سے دیوانہ تھا؟“

”نہیں..... پہلے یہ ایسے نہیں رہتا تھا جیسے اب رہتا ہے اس کی اڑانیں بھی تھکا
 دینے والی تھیں اور یہ بھی رزق حلال کھاتا تھا لیکن اس نے کہیں چوری چوری رزق
 حرام کا تصور انسان سے سیکھا..... انسان حیلہ جوئی اور مکر سے کماتا ہے بھائی کا حق
 غصب کرتا ہے اپنوں کی دشمنی میں غیروں سے مل کر کماتا ہے صلہ رحمی کا کیا نہیں
 کرتا ہر آنے والے مال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا بانٹ کر نہیں کھاتا بلکہ چھین کر
 کھاتا ہے جو کھا نہیں سکتا اسے کتے کی طرح چھپا کر رکھ چھوڑتا ہے حرام روزی کے
 انسان کو اتنے گر آتے ہیں جتنے گھونسے بنانے کے طریقے ہمیں یاد ہیں..... انسان
 پہلے رزق حرام سے واقف نہ تھا نہ ہی رجبہ گدھ کو اس کا علم تھا۔“

بھوری لم ڈوری جو طبعاً غبی تھی چلائی..... ”بتا بتا کیسے کیسے واقف ہوا۔“
 سرخاب اٹھا اور خطیب کی طرح گویا ہوا..... ”صاحبو! رزق حلال کا مسئلہ اولاً
 جنت میں طے ہو چکا ہے پہلے بابا آدم اور اس حوا حفظہ ااماں سے جنت میں رہتے

تھے اور بموجب حکم الہی بہشتی لباس پہنتے تھے اس وقت ان پر بہشت کا ہر میوہ جنت کا ہر پرندہ ہر جانور حلال تھا لیکن وہ حرام کھانے کے مرتکب ہوئے حرام کیا ہے؟ وہ جس سے منع کر دیا جائے حضرت آدم نے وہ گندم کا دانہ کھایا جس کی ممانت کی گئی تھی پہلی بار ان کے جسم میں منفی لہریں داخل ہوئیں اب تک ان کی سرشت صرف نیکی کی طرف راغب تھی اب اس میں تضاد شامل ہوا۔“

”اس بات سے تیرا کیا مطلب ہے سرخاب وضاحت کر.....“ چنڈول بولے۔
 ”بات صرف اتنی ہے..... کہ جو کوئی رزق حرام کھاتا ہے وہ یا تو خود دیوانہ ہو جاتا ہے یا اس کی آنے والی نسلیں بعد کو دیوانی ہو کر رہتی ہیں۔ اب چیل جاتی بہت خوش ہوئی اور چلائی..... جنگل بدر جنگل بدر..... جس طرح حضرت آدم جنگل بدر ہوئے۔ ویسے ہی..... وہی سزا..... جنگل بدر جنگل بدر۔“

”بول..... کیا تو دیوانہ ہے.....؟“ رلجہ گدھ سے سیمرغ نے سوال کیا۔
 ”ہاں آقا..... کبھی کبھی چاند راتوں میں جب میں اونچے چھتھنارے درختوں پر بیٹھا ہوتا ہوں۔ خود بخود میرا جسم گر پڑتا ہے اور میری حالت طرح اپنے بس میں نہیں ہوتی..... میں ایسی راہوں میں ج نکلتا ہوں۔ جن کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔“
 ”کیا رزق حرام کھانے کا مرتکب ہوا.....“ سیمرغ نے سوال کیا۔

”ہاں آقا!..... میں حرام رزق کھانے کا مرتکب ہوا..... میں اپنا شکار خود نہیں کرتا لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ میں دیوانگی اس رزق حرام کھانے کی وجہ سے پیدا ہوئی کہ..... دیوانگی نے مجھے رزق حرام کھانے پر مجبور کیا۔“

گیدڑ نے اپنی دم کو پٹک کر کہا..... ”آقا یہ بات خلاف قانون ہے میں یہاں گدھ کی وکالت کو موجود ہوں، جذب تک مجھ سے طے نہ کی جائے۔ رلجہ گدھ سے باز پرس نہیں ہو سکتی۔“

سرخاب نے حالات کو ہاتھ میں لے کر کہا..... ”کیا کوئی وضاحت کرنا چاہے گا

کہ رجبہ گدھ نے انسان سے رزق حرام کھانا کیونکر سیکھا؟“

مینا نے اٹھ کر بات شروع کی..... ”جب حضرت آدمؑ نے توبہ کی اور ان کے رب نے توبہ قبول کی تو پھر دنیا میں حضرت آدمؑ کے لیے تمام پاک اور طیب چیزوں کو مہیا کیا گیا۔ لیکن وہ رزق حرام جو وہ بہشت میں کھا چکے تھے۔ اس کے اثرات ان کی نسلوں میں آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہی رزق حرام کھانے کی سزا مقرر ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ تو حضرت آدمؑ کے لہو میں چھپی ہوئی دیوانگی باہر نکلی..... یہ ضروری ہے آقا رزق حرام کا اثر پشت ہاپشت جاتا ہے۔ جس وقت کوئے نے قابیل کو لاش ٹھکانے لگانے کے گر سمجھائے۔ تو انسان نے اپنی فہم و فراست سے جانا کہ پرندے بیوقوف ہیں اور رازا گلنے میں ثانی نہیں رکھتے۔ اس وقت انسان نے طے کیا کہ وہ نباتات جمادات چرند پرند حیوانات سب کو اپنے تابع کر کے رہے گا۔ آقا..... گدھ نے انسان سے رزق حرام کھانے کا سبق سیکھا..... یہ لمبی داستان ہے آقا بہت لمبی..... لیکن اتنی بات طے ہے کہ جو کچھ بھی دیوانگی اس وقت گدھ میں مقوم ہے۔ یہ سبق اس نے صرف انسان سے سیکھا ہے۔“

گیدڑ نے سرے پنڈال میں تین چکر لگائے اور پھر سر جھکا کر بولا..... اتنی بات طے ہے آقا کہ گدھ نے دیوانگی کا الزام قبول کر لیا ہے؟..... کیا میں ٹھیک سمجھا ہوں۔“

”ٹھیک ٹھیک.....“ تراقی سے آوازیں آئیں۔

”اس دیوانگی کی وجہ رزق حرام ہے جو گدھ کھانا ہے..... وہ عرصے سے مردار پر پل رہا ہے اور اپنا شکار خود نہیں کرتا..... اسی رزق حرام نے اس کے لہو میں فساد کی وہ شکل پیدا کر دی ہے جسے پاگل پن کہتے ہیں..... کیا میں ٹھیک سمجھا ہوں۔“

”ٹھیک ٹھیک..... بلند درختوں سے آواز آئی۔

”اور چیل جاتی کا خیال ہے ہ جو کوئی بھی حرام رزق کھاتا ہے اگر خود دیوانہ نہیں

ہوتا تو اس کی آنے والی نسلیں اس سے ضرور متاثر ہوتی ہیں۔ اس کے لہو میں ساخت کچھ اس طور پر بدلتی ہے کہ بالآخر دیوانہ پن اسی رزق حرام کی وجہ سے اس کی پشتوں میں ظاہر ہونے لگتا ہے..... کیا میں ٹھیک سمجھا؟“

”سوچ لو عا دلو! عاقلو! الزام درست ہے لیکن بات قابل غور ہے..... کیا یہ مسئلہ سرشت کا نہیں؟..... کیا کوئی پرندہ..... کیا کوئی جانور اپنی مرضی سے رزق حرام کھا سکتا ہے؟..... غور طلب بات صرف اتنی ہے کہ کیا گدھ جاتی کی سرشت میں حرام کھانے کی ترغیب پہلے سے موجود تھی کہ اب پیدا ہوئی..... عقل کے استعمال سے اس نے حرام کھایا۔

سوچ لو صاحبو! سرشت کی مطابقت گناہ نہیں..... آپ سب کو سوچنا پڑے گا کہ کیا گدھ جاتی اپنی مرضی سے رزق حرام پر راغب ہوئی کہ..... کہ یہ اس کی سرشت کا مسئلہ تھا..... کہیں ہم اس کے رب اور اس کے درمیان دخل در معقولات کرنے والوں میں سے نہ ٹھہریں..... سرشت کا معاملہ بیڈھب ہے۔“

تمام پرندے اللہ کی دی ہوئی سرشت کے سہارے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اپنی جبلت سے پرے ان کی زندگی اندھیر تھی..... وہ ہولے ہولے ٹکڑیوں میں اڑنے لگے..... سارے میں یہ بات پھیل گئی کہ پرندے اپنی عقل سے اللہ کی دی ہوئی سرشت سے بغاوت کر رہے ہیں!..... سانپ دیر تک جنگل میں ریگ ریگ کر یہ خبر سب کو سناتے رہے۔

عابدہ کے چلے جانے کے بعد میرے پاس اپنی نوکری کے علاوہ اور کوئی ایسا سہارا نہ تھا جسے میں لاٹھی بنا سکتا..... کھوکھلی روح اور خالی جسم سے ناطہ بنانے میں میرا سارا وجود غار کی طرح ہوگا..... بھابھی صولن ان کے دونوں بیٹے اور بھائی مختار مجھ سے اتنے دور تھے۔ جیسے سکرین پر چلنے والی فلم اپنے تماشا یوں سے دور ہوتی ہے۔ یہ

وہ وقت تھا جب میں تمام تر قوت کے ساتھ اپنے آپ کو کس یا یک خاص مشن کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔

میرے السر کی تکلیف پہلے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ رات کے پچھلے پہر معدے میں جلن ہونے لگتی تو میں اٹھ کر شہ نشین پر چلا جاتا اور ٹہلنے لگتا۔ لیکن اب اب میں ڈاکٹر فیضی کے مشورے کے مطابق اپنی زندگی کو مثبت طریق سے گزارنے کا آرزو مند تھا..... دودھ دہی سے پر اور جذباتی شعلہ سامانی سے تہی زندگی۔

یہ بھی پروفیسر سہیل کا مشورہ تھا۔

اچانک ایک دن پھر وہ مجھے ریڈیو سٹیشن پر مل گیا۔ ایسے ہی ایک دن مجھے سہی بھی اس کے ساتھ ملی تھی..... وہ سٹوڈیو میں سے کسی پروگرام میں شرکت کے بعد باہر نکل رہا تھا۔ ہم دونوں چپ چاپ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس نے مجھ سے کسی قسم کے سوال جواب کی بغیر اپنی چمک دار مسکراہٹ پیش کر دی اور میں اسے اپنے دفتر میں لے گیا۔

”یہاں کیا کرتے ہو؟..... مانی ڈیرسٹوڈنٹ۔“

”ملازم ہوں سر۔“

میں نے چائے کے لیے چہراتی سے کہا اور وہ میرے سامنے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

”السر کا کیا حال ہے..... ٹھیک ہو گیا ہے ابھی تک anxiety کے شکار ہو؟“

”ویسا ہی ہے۔“

تھوڑی دیر تک وہ چپ رہا۔

”میرا خیال ہے تم نے ٹھیک طور پر یوگا کیا نہیں ورنہ افاقہ ہوتا۔“

”میں..... کوئی سمت نہیں مقرر کر سکا اپنی۔“

”میں آج کل ٹی ایم کرتا ہوں۔ اس سے بہت آرام ملتا ہے

meditation سے سکون ملتا ہے۔“

”مین اندر سے اس قدر پراگندہ ہوں کہ concentrate نہیں کر سکتا سر۔
دراصل مجھنیو معلوم نہیں کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں کس لیے پریشان ہوں..... میں ہر
وقت سوچتا رہتا ہوں کہ کسی وقت غبار اترے تو میں اصلی پریشانی کو برہنہ دیکھوں۔“
وہ مسکراتا رہا..... پھر بڑی دیر بعد بولا.....“دیکھو اگر کوئی آدمی زیادہ دیر بے سمت
ہو کر پریشان رہے تو وہ دائمی پریشان ہو جاتا ہے۔ اگر غم دکھ اور ہیجان کی ایک نقلی
سی وجہ بھی ہو۔ تو وہ اس پر قابو پالیتا ہے۔ تم کو پتہ ہونا چاہتے کہ آخر اس پراگندگی
اس anxiety اس تذبذب کی اصلی بنیادی وجہ کیا ہے؟..... اگر معلوم نہیں تو ایجاد کر
لو آرام میں رہو گے۔“

”سوچتا ہوں سوچتا رہتا ہوں..... بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک اکیلی
وجہ نہیں ہو سکتی.....“
”میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں فری..... بغیر چارج کیے..... سہیل نے
مسکرا کر کہا۔

ضرور دیں..... سر سو مشورے دیں“
تم کو اپنے آپ کو کوئی سمت دینی ہوگی..... کوئی مشن اپنانا پڑے گا۔ کوئی goal
کوئی منزل..... ورنہ تم خالی بحرے کی طرح سمندری لہروں میں بھگو گے..... کبھی
بحر قلزم میں کبھی بحیرہ عرب میں۔“

”میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں کوئی مشن اپنا نہیں سکتا..... نو تھینک یو۔“

وہ بڑی دیر تک میرا چہرہ دیکھتا رہا۔

”اپنے ارد گرد دیکھو..... جو لوگ زندگی میں کوئی مشن بنا لیتے ہیں۔ چاہے
چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو۔ وہ السر کا شکار نہیں ہوتے..... پیغمبروں کی زندگی
غور سے دیکھو۔ وہ بڑی سے بڑی ذاتی قربانی دے کر بھی السر کا شکار نہیں ہوئے

..... کوئی ٹریجڈی انہیں ہلا نہیں سکتی بے نام جستجو بے مصرف تلاش
 زندگی میں ایک مشن ہو چاہے بالکل چھوٹا مثلاً بہتر کینو کا باغ لگانا پاکستان
 کے لیے نئی قسم کی گندم ہونا پلاسٹک کی ڈوری سے قالین بننا کسی بچے کو
 سی ایس پی کرنا۔“
 ”ہاں ہے“

کیا ہے سر؟“

”میں اب انیسویں گریڈ کے لیے کوشش کر رہا ہوں پھر میں پروفیسر ہونے
 کی کوشش کروں گا میں پاکستانی طلبا کو تعلیم دینے کا مشن لے کر تمہارے کالج
 میں آیا تھا لیکن رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ وہ مشن میرے بس کا نہیں۔ اسی لیے میں
 نے اپنی تبدیلی نیو کیמپس میں کرا لی۔ تعلیم جب سے عام ہوئی ہے لوگ تعلیم کی
 تلاش میں نہیں رہے اس لیے میں نے اپنا مشن بدل لیا ہے میں اب فقط اپنی
 زندگی بنانا چاہتا ہوں۔“

میری نظر میں کوثر آکھڑی ہوئی جس نے مجھے اس کے متعلق پہلے یہ خبر دی تھی

.....
 ”کیا تمہیں غریبوں سے ہمدردی ہے کبھی تم کسی بوڑھے چھابڑی والے کو دیکھ کر
 اداس ہوئے ہو پرانے چیتھرے جمع کرتی عورت کو دیکھ کر تمہارا دل پگھلا ہے
 ہے؟ سہیل نے سوال کیا۔

میں نے غریبی کے متعلق کبھی سنجیدگی سے سوچا نہیں۔ حالانکہ میں خود فلندری
 زندگی بسر کرتا ہوں۔“ میں نے لجاجت سے جواب دیا۔

’دھرتی تو مشکل ہے میں تمہیں کمیونزم پر کچھ کتابیں دینے والا تھا۔ لیکن وہ بھی ویگا
 کی طرح تمہارے کام نہ آسکیں گی۔“
 ”پھر؟“

تمہیں فنون لطیفہ سے دل چسپی ہے؟..... مشوری، شاعری، ناول نگاری وغیرہ..... اگر تم چاہو تو تمہارا aggression تمہاری anxiety کسی cration میں ڈھل سکتی ہے۔“

”میں شاید..... پیدائشی آرٹسٹ نہیں ہوں..... سر۔“

”جلی طور پر آرٹسٹ ہونا ضروری نہیں آرٹ کو مشن کے طور پر..... ردی کی ٹوکری کے طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔“

”شاید میں اس کا اہل نہ ہو سکوں۔“ میں نے معذوری ظاہر کی۔

”میرا خیال تھا کہ تم..... تم کو غربی کی طرف توجہ دینی چاہیے اس کا reape بہت بڑا ہے ساری تھرڈ ورلڈ اس سے متاثر ہے۔ پڑھنے کے لیے ہمدردی کرنے کے لیے اپنے آپ کو جذب رکھنے کے لیے اس سے بڑا اور کوئی مشن نہیں ہو سکتا۔ کمبوڈیا سے چلتے آؤ..... پاکستان تلے ادھر پورا افریقہ پڑا ہے۔ روڈیشیا گھانا، نائیجیریا..... چاہو تو ساؤتھ امریکہ کے مسائل میں بھی وقت گزار سکتے ہو۔“

”اس کا فائدہ؟“

بھائی میرے..... بیمار ذہن کے مالک کسی کے فائدے کے لیے مشن نہیں ہوتا؟..... اس کا فائدہ ہمیشہ مشن والے کو ہوتا ہے..... بڑے سے بڑا مشن ہو کائناتی قسم کا تو آدمی اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔ گٹھیا کو اسٹی کا آدم ساز ہو تو اپنے آپ کو آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔“

میں بڑی دیر چپ رہا۔

”اچھا یہ دروازہ مقفل نکلا..... اب یہ بتاؤ عشق کر سکتے ہو راہ مولا..... لا حاصل قسم کا..... بغیر حصول کی آرزو کے..... وہ تمہارا سارا وجود، سارا تخیل ساری انا کو جذب کر لے گا۔“

”مجھ میں عشق کی اب تاب نہیں ہے شاید..... سیمی کے بعد.....“

”مذہب سے کوئی دلچسپی ہو؟..... مذہبی لگن سے بھی اس دنیا میں ٹائم پاس کیا جا سکتا ہے۔“

”میری تربیت گاؤں کی ہے۔ دیہات میں مذہب بڑا سادہ ہوتا ہے۔ باقی زندگی کی طرح..... اس لیے میری معلومات کم ہیں۔“

”ہاں میں دیکھ چکا ہوں۔ اگر تم میں وہ جوہر ہوتا تو یوگا کرنے سے ضرور چمکتا..... بچوں سے دلچسپی ہے؟ چھوٹے بچوں کو دیکھ ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کو دل چاہتا ہے؟“

”بھائی کے دو جڑواں بچے ہیں۔ کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”پھر تو مشکل ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شادی کروا کے تم اپنی زندگی کے منہ زور گھوڑے پر کابھی ڈال سکتے ہو۔“

”میں نے کبھی سوچا نہیں سنجیدگی کے ساتھ شادی کے متعلق..... سر میرا کیس بالکل بگڑا ہوا ہے۔“

اس نے پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا..... ”قیوم! میں نے کئی سال تمہاری طرح گزارے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ E.S.P پر کتابیں بڑھنے سے telepathy اور divorce کے متعلق پڑھنے رہنے سے مجھے افاتہ ہوگا میں astral travel کے پیچھے لگا رہا۔ دھرم ایمان نروان کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن اب میری سمجھ میں ایک بات آگئی ہے۔“

”کیا بات؟“

”پانچ کنیڈل پاور کا بلب..... لاکھ امپینر بڑھا دو ہمیشہ پانچ کنیڈل پاور کی روشنی دیتا ہے۔ ہم لوگ چھوٹے چچ میں دیگ بھر پانی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چچ میں صرف چچ بھر پانی آ سکتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا مشن بدل لیا ہے۔ میں اب صرف اپنی job کی مشکلات کے متعلق سوچتا ہوں۔ کون کون سی

سفارش چلے گی۔ کس کس level پر کیا کیا کوشش کرنی پڑے گی..... میں کسی ideal کے لیے معاشرے سے اپنے آپ سے لوگوں سے نہیں لڑتا۔“

”آپ جھوٹ بولتے ہیں..... سر..... آپ تو اتنی بڑی بڑی تھیوریاں بناتے ہیں بہت سوچتے ہیں۔“

”خدا قسم یہ سچ ہے۔ میں نے وہ سب سوچیں نکال دی ہیں سر سے۔ اب میں دلجمعی سے پرسوں امریکہ جاؤں گا۔“

”امریکہ۔“

”وہاں چھ مہینے لکچر دوں گا۔ امریکہ روحانی طور پر اس وقت بخر ہے۔ پانی چاہتا ہے میں اپنی بالٹی لے جاؤں گا۔ ایسے چھینٹے اڑاؤں گا کہ بارش کا گمان ہوگا..... حرام و حلال کی تھیوری بیان کروں گا سب سے..... میرے لیے یہ بہت ہے۔“

”کیا کرنے جا رہے ہیں۔ امریکہ۔؟“

”سٹڈی ٹور کروں گا..... تفریح کے اوقات میں وہاں کے لوگوں کو یہ یقین دلاؤں گا کہ مشرق کے پاس روحانیت کے خزانے ہیں۔ ہم لوگ رتی بھر بھر مادہ پرست نہیں ہمیں اشیاء کی محبت نہیں۔ ہم ایک اور سمت کے لوگ ہیں۔ ان کے اندر احساس خلا اور احساس کمتری پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ واپسی پر گریڈ کا کوئی پر اہم نہیں ہوگا..... نوپر اہم.....“

میں نے سر جھکا لیا۔

”دیکھو مجھے چھ مہینے لگیں یا دو سال..... تم اس دوران صرف اپنی نوکری پر دھیان رکھنے کی کوشش کرنا..... میری واپسی کا انتظار کرنا اور اس دوران ادھر ادھر مت جھانکنا۔ ہر بات کو اپنی job کے ساتھ link کرنا..... اگر کسی طرح یہ مشن فیل ہو جائے تو پھر شادی کر لینا..... آرام سے زیادہ سوچے سمجھے بغیر لیکن شادی آخری solution ہے۔ کوشش یہ رکھنا کہ نوکری واحد خدا ہو..... تمہاری زندگی کا مرکز کبھی

کبھی اس مشن کی لت پڑ جائے تو آدمی دو رنکل جاتا ہے اور بڑا بندھا رہتا ہے مرکز سے باہر نہیں نہیں نکل جاتا۔ میں نے سراٹھا کر سہیل کی طرف دیکھا۔ پہل بار اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔ مسیحا تھری پیس سوٹ پہنے ہاتھ میں سگار لیے اپنے علاج کی بے بسی کے سامنے خود کھڑا رہا تھا۔

سہیل کے امریکہ چلے جانے کے بعد کافی حد تک اپنی نوکری کے بارے میں اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ پہلے میرا معمول تھا کہ اگر مجھے بھائی مختار کی موٹر سائیکل ادھار نہ ملتی تو میں ساندہ کلاں سے چل کر کرشن نگر کے اختتامی سٹاپ تک پیدل آتا۔ راستے میں ہرے بھرے کھیت تعفن بھرے پانیوں میں لہلہا رہے ہوتے۔ کرشن نگر کے سٹاپ سے میں بس میں سوار ہوتا اور پلازہ کے چوک پر بس سے اتر جاتا۔ یہاں سے مجھے پھر پیدل ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہوتا اس لمبے سفر اور پڑاؤ کے چوک پر بس سے اتر جاتا۔ یہاں سے مجھے پیدل ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہوتا۔ اس لمبے سفر اور پڑاؤ کے لیے مجھے کافی وقت اور سوچیں درکار ہوتی تھیں۔ بچپن جوانی اور لڑکپن کے چھوٹے چھوٹے واقعات ذہن پر ابھرتے رہتے۔ میری ہمیشہ آرزو ہوتی کہ کہیں کوئی واقف کار نہ مل جائے۔ جس کے ساتھ کی وجہ سے خیالات کا تانتا ٹوٹ جائے۔ ان ہی سفروں کے دوران میں چند راتیں گزارے ہوئے دن ماں کی موت، ابا کی کمشدگی سیسی اور عابدہ کی جدائی کا تجزیہ کرتا۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا پڑتا لگاتا..... لیکن اس سارے تجزیے اور پوسٹ مارٹم سے نہ میں کبھی کسی اہم نتیجے پر پہنچ سکا اور نہ ہی کوئی فیصلہ کن سبق سیکھنے کی نوبت آئی۔ جس طرح خلائی ہوا باز ایک خاص لباس میں ہی سفر کر سکتا ہے۔ میں بھی شادوں کی ایک خاص رضائی اوڑھ کر یہ سفر کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے سہیل کے مشورے کے بعد جو پہلا مثبت کام میں نے کیا۔ وہ موٹر سائیکل کی خرید تھی۔

نئی موٹر سائیکل میں نے بھائی مختار سے پیسے ادھار لے کر خریدی تھی اور انہوں نے مجھ میں دینا داری کے آثار سر نکالتے دیکھے تو بخوشی ادھار دے دیا۔ موٹر سائیکل کی سواری میں یہ خوبی ہے کہ یہ برق رفتار گھوڑے کی طرح بڑی انا بخشتی ہے۔ اس قدر خطرے کے باوجود آدمی اپنے آپ کو کافی پائیدار سمجھنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل کے مشورے کے بعد نئی سائیکل 'ریڈیو کی تازہ نوکری اور ریڈیو پر آنے جانے والی رنگ برنگ لڑکیوں کے باعث ایک بار پھر میں اپنے آپ کو کافی حد تک نارمل سمجھنے لگا۔ اب کنٹینن سے چائے منگوا کر سکرپٹوں کو ہاتھ میں لے کر لڑکیوں سے باتیں کرتا۔ تو میرا رویہ برادرانہ کھردرانہ اور لاتعلقی نہ ہوتا۔ بلکہ اس میں انا کی خوشبو بسی ہوتی۔

گو میں اس جنس سے چونکیل جانور کی طرح خبردار ہو گیا تھا۔ کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر بتاتی رہتی تھی کہ یہ وہ لڑکیاں ہیں جن کے ہاتھوں میں کسی دوسرے سٹیشن کا ٹکٹ ہے، یہ میرے پلیٹ فارم پر رکیں گی۔ کوکا کولا پیمین گی اپنی پسند کا میگزین خریدیں گی اور پھر ہاتھ ہلاتی کسی اور شہر کے لیے کسی اور ٹرین میں سوار ہو جائیں گی۔ اس لیے ریڈیو سٹیشن پر جہاں آنسو گیس زیادہ پھیلی ہوتی ہے۔ میری آنکھیں بہت خشک تھیں اور میں بہت محتاط بھی رہتا تھا اور ملا جلا بھی.....

ریڈیو سٹیشن کا محکمہ عام محکموں سے قدرے مختلف ہے۔ سرکاری دفاتروں میں مرد عورتیں اس طرح مل کر کام نہیں کرتے۔ اور اگر کرتے بھی ہیں تو عام دفاتر کی طرح بیرونی طور پر ان میں بڑا رکھ رکھاؤ اور خشک دفتری پن موجود ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے کام کی نوعیت ریڈیو سے ملتی جلتی ہے لیکن یہاں بیٹی بورڈ اور انگریزی خواں طبقے کی حکمرانی کے باعث ماحول میں ایک خاص قسم کا تصنع اور خشکی ہوتی ہے۔ فلمی دنیا میں بھی عورت اور مرد بہت قریب رہتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی وہ فضا نہیں ملتی جو ریڈیو سٹیشنوں پر ہوتی ہے۔ کیونکہ فلمی کارکنوں میں وہ ہلکا سا حجاب، شعریت

فاصلوں کی کک نہیں ہوتی جو آرٹ سے وابستگی کے باعث دونوں جنسوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

ریڈیو سٹیشن پر اگر عملہ دلی طور پر ادب پرست، موسیقی نواز، دلدادہ۔ ڈرامہ نہ بھی ہو۔ تو ریڈیو کی روایات ہی ایسی ہیں کہ اچھے شعروں پر سر دھنا، مناسب لے پر داد دینا، مکالمے کی چست ادائیگی پر قربان ہونا سب کا شیوہ ہے۔ یہاں پہنچ کر طوائف آرٹسٹ بن جاتی ہے۔ مرثی ضلع جگت کا بادشاہ نظر آتا ہے۔ یہاں فلمی دنیا والے ٹھٹھوں اور پھکوی بازی نہیں ہوتی۔ ایک ہلکا سا غلاف تعریف و تحسین کا، ایک سطحی سی اخلاقی پابندی ایک غیر محسوس آرٹ نوازی سب پر چھائی رہتی ہے، کاتب سے لے کر انجینئر تک..... چراسی سے لے کر آرڈی صاحب تک..... طلبہ نواز سے لیکر ساؤنڈ ریکارڈسٹ تک چھوٹی اناؤنسر سے لیکر تجربہ کار نیوز براڈکاسٹر تک سب اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ ادب نواز موسیقی پرست اور ڈرامہ شناس ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے ریڈیو سٹیشن کی فضا ہمیشہ ملن رت سے مشابہہ رہتی ہے۔ یہاں بھی ضرورتیں چلتی ہیں۔ جھگڑے ہوتے ہیں explanstions طلب کی جاتی ہے۔ ادھار مانگے جاتے ہیں۔

فائلیں خراب ہوتی ہیں۔ چغلی میٹنگ جاری رہتی ہے۔ وہ سب کچھ چلتا ہے۔ جو دفاتروں میں چائے کے ساتھ ساتھ چلا کرتا ہے..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو سٹیشن پر ایک موسم ہوتا ہے جو ملن رت سے مشابہہ ہے۔ ادب نوازی، موسیقی اور ڈرامے کی ہلکی پھوار..... جنس مخالف سے میل ملاقات کی رت۔ میں ریڈیو سٹیشن پر ایسے ہی موسم میں اتھل کو ملا۔

اتھل شکلا و عقلا ریڈیو سٹیشن کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ موسیقی کے پروگراموں سے گو میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن اس شکل جسے اور رہیت کی عورتیں یہاں وہاں

ملتی رہتی تھیں۔ لیکن اس کی ذات کا مجھ پر منفی یا مثبت کبھی کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مختلف پروڈیوسروں کے کمرے میں بیٹھی پائی جاتی۔ رسمی باتوں کے علاوہ اس سے بات کرنے کی کوئی نوبت کبھی نہ آئی۔ ریڈیو پر ظاہر وہ بڑی مقبول تھی۔ ہر ایک ٹھٹھ مذاق کرنا، خوش دلی سے دوسروں کے مذاق سہنا، وقت بے وقت سازندوں کی مالی مدد کرنا، باوردی چپراسیوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے گھر والوں کی خیریت پوچھنا۔ امیر آرٹسٹوں سے بلا تکلف لفٹ مانگ لینا، نوجوان لڑکیوں سے سکرپٹ مانگ کر پڑھنا اور اچھے جملوں پر داد دینا، موسیقی کے پروڈیوسروں کی بظاہر بے عزتی کرتے ہوئے درپردہ ان کی خوشامد کرنا اور باوجودیکہ اسے اب پروگرام ملنے بند ہو گئے تھے۔ باقاعدگی سے ہفتے میں دو بار ریڈیو ٹین آنا اس کا نام ٹیبل تھا۔

اتل کی آواز ریگستانی عورتوں کی طرح گھنگھی تھی۔ جوانی میں اس کی آواز میں شاید وہ جادو ہو گا جسے بیڈروم سیکسی کہتے ہیں۔ لیکن اب تو کبھی کبھی جب وہ جوش میں بولتی تو اس کے جملے کے جملے غائب ہو جاتے اور آواز نہ نکلتی۔ کئی سالوں سے وہ چھوٹے شہروں میں لگنے والے تھیٹروں میں گارہی تھی۔ ان میلوں میں کئی بار مائیکرو فون کے بغیر بھی آواز لگانا پڑتی تھی۔ اس لیے اس کی آواز سے نزاکت، شائستہ پن اور ملائمت غائب ہو چکی تھی۔

سب سے پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو وہ قاضی کے کمرے میں بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس نے فل میک اپ کر رکھا تھا۔ برقعے کا نچلا سیاہ کوٹ جسم پر تھا اور نقاب کرسی پر لٹک رہا تھا۔ اس نے کوئی تازہ لطیفہ سنایا تھا۔ جس کی وجہ سے کمرے میں بیٹھے ہوئے قاضی کے تین حواری ہنس رہے تھے۔

میں نے قاضی سے ایک مقبول ریکارڈ کی ڈسک مانگی تو اتل بولی..... ”بتائیے سرجی یہ آپ کے قاضی صاحب مجھے کوئی پروگرام کیوں نہیں دیتے۔“

”بی بی میں کلاسیکی موسیقی کا انچارج ہوں۔“ قاضی بولا۔

”تو پھر میں کوئی نوک سنگر ہوں۔ میں نے بھی آخر استاد جیسے خاں سے تعلیم حاصل کی ہے“

”وہ تو ٹھیک ہے بی بی لیکن تمہاری آواز میں خراشیں پڑ گئی ہیں۔ لوگ ایسی آواز کو پسند نہیں کرتے اب۔“

”میرا کیا قصور ہے سرجی آپ بتائیں۔ یہ پچھلے ریڈیو سٹیشن کی بات ہے۔ میں گانے کے لیے آئی تھی۔ پورے دس بجے رات کو مجھے مالکونس کا پروگرام کرنا تھا۔ میں بیٹھی تھی آرڈی صاحب کے دفتر میں..... تب نگینہ آئی..... نگینہ کو آپ جانتے ہیں سرجی؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”میری مقبولیت سے بیر تھا اسے آتے ہی چمٹ گئی مجھ سے باجی جی باجی جی کہتے منہ سوکتا تھا اس کا مجھے پان دیا۔“

”یہ بات اب پرانی ہو چکی ہے احمل..... بہتر ہے کہ اب اسے نہ سنایا کرو سب جانتے ہیں۔“ قاضی نے چڑ کر کہا۔

”سب جانتے ہوں گے لیکن یہ تو نئے ہیں ریڈیو پر..... کیوں جی نئے ہیں ناں..... آپ سرجی۔“

”ہاں۔“

”بوجی مجھے دیا ہے پان نگینہ نے کشتی کا پان میں نے کیا کھلایا۔ آواز بیٹھ گئی۔ وہ تو اللہ سائیں نے مجھے عقل دی پان تھوک دیا میں نے..... کہیں جو سارا کھا جاتی تو گونگی ہو جاتی پوری۔“

”دیکھو تم کہیں آیا گیری کر لو..... اب تمہارے یہی دن ہیں“ قاضی نے ہنس کر کہا۔

”کر تو لوں سرجی..... پر آج کل کے خانساموں کا بھی taste اچھا ہو گیا وہ اب

بیگموں پر نظر رکھتے ہیں۔ آپ کی طرح۔ مجھے نکلوا دیں گے کھڑے کھڑے.....
سب تہقہہ مار کر نہ دیے۔

”کتنی عمر ہے تمہاری اتل؟..... قاضی نے سوال کیا۔

”اگلے سال بیالیس کی ہو جاؤں گی انشاء اللہ۔“

”کے سالوں سے بیالیس کی ہو رہی ہے.....“ قاضی نے گستاخانہ پوچھا۔

”میں لیپ ایئر میں پیدا ہوئی تھی جی کیا کروں چار سال بعد بڑھ ڈے آتا ہے
میرا۔“ بوڑھی اورئی کو نیل جیسی نئی تھی۔ عمر اس کے جسم سے جھڑتی رہتی اور اس کے
بالوں پر چڑھتی چلی جاتی۔ کبھی وہ پانچ سال کے بچے کی طرح معصوم ہوتی۔ کبھی
بوڑھی ٹانیکہ کی رٹ تجربے کا خزانہ بے حس بن جاتی۔ وہ ذہنی جسمانی روحانی کئی
قسم کے مرضوں میں مبتلا تھی اور کئی قسم کی بیماریوں سے شفا یاب ہو چیک تھی۔
زندگی میں اسے ان گنت ٹیکے لگ چکے تھے اور کئی بیماریوں سے شفا یاب ہو چکی تھ۔
زندگی میں اسے ان گنت ٹیکے لگ چکے تھے۔ اور کئی بیماریوں سے وہ اپنے تجربے کی
بنا پر اب تندرست ہو چکی تھی۔ اس کا جسم سٹیٹھک فار کی طرح بے جان تھا اور اس
کے سانس سے بی کو مپلکس، انٹی بائیوٹک کوڈلور آئل اور ملٹی وٹامنز کی خوشبو آتی تھی۔
بیماریوں کی شفا یابی کے باعث ہی لگتا تھا کہ وہ بیالیس سے کئی گنا زیادہ سال اس
کرہ ارض پر بسر کر چکی ہے۔ دراصل اتل صرف زندہ تھی۔ وہ زندگی پر کسی قسم کی
تنقید نہیں تھا اسی سے مل کر مجھے پتہ چلا کہ اچھا یا برا کچھ نہیں ہوتا۔ بس واقعات ایک
دوسرے کے نقش قدم پر ابھرتے رہتے ہیں۔ جو اپنی ذات کو تکلیف دیں۔ وہ برے
لگتے ہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی وہ برے نہیں ہوتے اور کچھ واقعات راحت پہنچاتے
ہیں۔ اس لیے اچھے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی قابل تعریف نہیں ہوتے۔ اچھے یا
برے کی کائناتی حیثیت کچھ نہیں۔ ہر انسان اپنی ذات کو مرکز مان کر اچھے اور برے کا
گراف بناتا ہے۔ اسی لیے تمام واقعات بالآخر کائناتی صفر میں داخل ہو جاتے

ہیں۔ اور اسی لیے ان سے باقی لوگ زیادہ دتر تک متاثر نہیں رہ سکتے۔

اس روز مجھے ڈرامہ بھنبھور ریکارڈ کرنا تھا۔ میں نے کاسٹ کو دس بجے کا ٹائم دیا تھا۔ جب میں ریڈیو سٹیشن پہنچا پورے گیارہ بجے تھے اور اہتل barrier کے اس طرف کھڑی دربان سے فصیح زبان میں جھگڑ رہی تھی۔ چہرے کا سیاہ نقاب الٹا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ماچس اور سگریٹ کی ڈبیا تھی۔ چہرے پر فل میک اپ اور منہ میں پان موجود تھا۔

”اوے لکھ نہ رہے تیرا تو اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب سے میں ریڈیو سٹیشن پر چلی آرہی ہوں شمشاد نیگم کا نام سنا ہے امراضیا نیگم کا نام جانتا ہے تو بہ بابا ان کے بعد کس کا نام چڑھا تھا۔ اہتل عزیز کا..... نہیں جانتا مجھے اب بھی۔“
دربان بڑے مزے سے ٹین کی کرسی پر بیٹھا تھا اور شانتی سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا.....“ ہو گا جی آپ کا بڑا نام..... لیکن آرڈی صاحب کا حکم ہے..... آپ اجازت نامہ دکھائیں سیکورٹی معاملہ ہے کوئی ہما شام اندر نہیں جاسکتا۔“

”الو میں پرانے ریڈیو سٹیشن سے یہاں آتی ہوں۔ آرڈی بدلتے رہتے ہیں حکومتیں آتی جاتی ہیں آرٹسٹ وہی رہتے ہیں ریڈیو کے حرام خور اہتل وہی رہتی ہے۔“

”ہائیں جی رہتی ہوگی..... لیکن آپ اندر نہیں جاسکتیں۔“

اپنے آپ کو مجبور پا کر اہتل نے دو تین بھاری جان دار گالیاں دیں اس وقت میں جلدی سے موٹر سائیکل پر گزر جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے مجھے پکڑ لیا۔

”اے قیوم صاحب! رکنا سر جی..... اس سور کے ختم سے کہہ دیں میری ریکاڈنگ ہے اب گیارہ بجے رہے ہیں۔ ابھی ریہرسل بھی کرنی ہے۔“

میں نے دربان سے سفارش کرنے کے لیے کہا..... یار ولایت علی پرانے

آرٹسٹوں کا خیال رکھا کرو۔“

”اب یہ کیا پتہ چلتا ہے سرجی کون نیا ہے اور کو پرانا؟ کچھ شکل پرانی ہوتی ہے لیکن وہ آرٹسٹ نئے ہوتے ہیں۔ کچھ کی شکل نئی لگتی ہے سرجی وہ آرٹسٹ پرانے ہوتے ہیں۔“

”اچھا اب تو ان کو جانے دے ناں۔“

”جائیں جائیں سرجی..... پر بات تمیز سے کیا کریں۔“

”بکی نہ جا اب شرمندہ ہو کر..... خصم نوں کھانا حرامی۔“

ان کا خیال رکھا کرو..... یہ آرٹسٹ لوگ جلالی طبیعت کے ہوتے ہیں۔“

”ہاں جی..... ان کی طبیعت کی وجہ سے یہ جہنم میں جائیں گے انشاء اللہ“ ولایت علی نے جل کر کہا۔

”لے کچھ کھایا پیا کر جان کو لگے.....“ اب برقعے کی جیب سے پانچ روپے

نکال کر اتھل نے دربان کو دے دیے۔ دونوں ہنسنے لگے اور اتھل آگے چلی گئی۔

یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اتھل کو آئندہ کی کوئی فکر نہ تھی اس کے پاس وہ آخری پانچ روپے تھے جو اس نے دربان کو بلا وجہ دے دیے۔ دراصل وہ ہر کام کرنے کے بعد ہر حادثہ سہہ گزرنے کے بعد ہر قسم کے پچھتاوے سے آزاد تھا اس کی زندگی لمحہ تک چلتی تھا اسی لیے ماہ و سال مل کر اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکے۔ وہ وقت کے بھاری ہتھوڑے سے ہر لحظہ بے پروا تھی۔

بھنبھور ڈرامہ ریکارڈ نہ ہو سکا۔ عین ریہرسل کے دوران ہیروئن کو کاسٹ میں سے کسی نے کوئی چھتی بتا کہہ دی۔ ناہید بڑی نازک مزاج تھی انور اٹھی آرڈی صاحب سے رپورٹ کی اور گھر چلی گئی۔ براڈ کاسٹ میں ابھی چھ دن باقی تھے لیکن بڑے دنوں کے بعد میرے السر میں درد شروع ہو گیا۔ ساؤنڈ لیفلٹ کی ڈسک اور سکرپٹوں کی کاپیاں لے کر اپنے دفتر میں لوٹا چار بجے ہوئے تھے۔ اتھل میرے

دفتر میں بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے برقعے کا اوپر والا حصہ کرسی کی پشت پر لٹک رہا تھا اور پلاسٹک کے بنوں والے کوٹ نمابرقعے میں وہ پھنسی ہوئی تھی۔

”جی فرمائیے.....“ میں نے سرد مہری سے پوچھا۔

”اب دیکھیے یہ وقت ہو گیا ہے بھوکے پیاسے اب ریکارڈنگ ختم ہوئی..... ہے۔“

میں چپ رہا۔

”ان میوزک والوں کی عقل دیکھیں..... میں کورس والیوں کے ساتھ گا رہی تھی اور حمیدہ گارہی تھی لیڈ پر..... آپ خود انصاف کریں اس کی اتنی آواز ہے کہ لیڈ گا سکے؟“

میں نے سکرپٹ دروازے میں رکھے اور چڑ کر کہا..... اچھا گاتی ہے حمیدہ اور پھر ہر آرٹسٹ کا ایک ٹائم ہوتا ہے اس کے بعد لوگ اسے قبول نہیں کرتے۔“

اتل ناک سکوڑ کر بولی..... اچھا جی یہ تو ہم لوگ جانتے ہیں کہ وہ کیسا گاتی ہے..... ایسی کم سری..... ایسی کم سری پنچم پر جا کر تو اس کا گلا پھٹ جاتا ہے ٹیں ہو جاتی ہے آواز۔“

”پبلک کو پسند ہے یہ ٹیں۔“

”سارا قصور ان ریڈیو والوں کا ہے..... جس کو پروگرام ملیں۔ وہ آپنی مقبول ہوگا..... ساری بات تو موقع ملنے کی ہے۔“

”آخر اس میں کیا خوبی ہے کہ اس کو پروگرام ملتے ہیں؟ کبھی سوچا آپ نے۔ میں نے سوال کیا۔

ہاں ایک خوبی ہے اس میں۔“

”کیا.....“ میں اکتاہٹ کے آخری سرے پر تھا۔

”جوان ہے نخرے آتے ہیں ادائیں دکھاتی ہے پروڈیوسروں کو الو بناتی ہے۔“

”پہلی اور آخری یہی عورت کی خوبی ہے۔“

یکدم اتل ڈھیلی پڑ گئی۔

”سرجی آپ آرڈی صاحب سے میری سفارش کر دیں ناں..... میرے گھنٹوں میں درد رہنے لگا ہے اب تھیٹروں میں کام نہیں کر سکتی، خدا قسم کئی کئی گھنٹے کھڑے رہنا پڑتا ہے۔“

مجھے اس پر ہلکا سا ترس آ گیا۔

”کیا سفارش کروں۔“

”کم از کم چار بنگ تو دے دیا کریں مہینے میں..... دیکھیں ناں نازیہ تو چھ چھ بار بک کر لیتے ہیں وہ۔ مجھ سے کون سے بہتر گاتی ہے۔“

”یہ بھی تمہارا خیال ہے اس کا وقت بھی نہیں کرتے نکلتا ہے۔“

”ہماری عمر ہی ترلے منتوں کی ہے سرجی..... پر یہ ریڈیو والے معاف کرنا بہت چندرے ہیں۔ عمر پٹی عورت کو ذرا گھاس نہیں ڈالتے..... سارے پروگرام لڑکیوں کو دیتے ہیں بوڑھی عورتوں کے رول بھی لڑکیوں سے کراتے ہیں۔“

”وقت وقت کی بات ہے اتل..... تم کو بھی گھاس ڈالا ہو گا جوانی میں..... ریڈیو

والوں نے۔“

وہ چپ ہو گئی۔

ریڈیو سٹیشن پر تین قسم کی خواتین آرٹسٹوں سے ملاقات رہتی تھی ایک وہ گلوکار اور ڈرامہ وائس عورتیں اور لڑکیاں تھیں۔ جن پر رائے عامہ سے مقبولیت کی مہر لگ چکی تھی۔ جو اے کلاس میں شمار ہوتی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بھاگنا، چالوسی کرنا، پان سکریمٹ آفر کرنا اپنے کمرے میں بلا کر ریڈیو کے باقی عملے پر تبصرہ کرنا، کچھ دوسرے آرٹسٹوں کی چغلی سے دل بہلانا۔ ہمارا شیوہ تھا۔ دوسری ان آرٹسٹ لڑکیوں کی تھی جو گانے یا ڈرامے کے پروگراموں کے لیے بسنت کے دن نیلا

آسمان بن کر آیا کرتی تھیں۔ ہر پروڈیوسر جانتا تھا کہ ان لڑکیوں میں talent کی واضح کمی ہے اور یہ شاید کبھی بھی اچھی پرفورمنس نہ دے سکیں۔ لیکن ان سے چھیڑ چلی جانی چاہیے۔ یہ لڑکیاں گانے کا پروگرام ڈرامے کا پارٹ یا casual اناؤنسمنٹ کے لیے آتی تھیں۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ کنٹریکٹ پر سائن کرواتے وقت، برآمدوں میں، سٹوڈیو کے اندر، لفٹ کا انتظام کرواتے وقت کاروں کے دروازوں تک پہنچاتے ہوئے خوش دلی سے باتیں ہوتی تھیں اور ہم لوگ ہلکا پھلکا محسوس کرتے تھے۔

تیسری قسم سب سے قابل ترس تھی۔

اتل نے لمبی سانس لی اور دکھ سے بولی.....“ یہ آپ کا قاضی بہت بے حیا آدمی ہے۔ دیکھا نہیں آپ نے کتنی لڑکیاں گھسی رہتی ہیں اس کے کمرے میں۔ ” قاضی اچھا آدمی ہے..... ہنس مکھ اور ملنسار۔“

” سوواری عشق کرے ان چھپکلیوں سے لیکن پروگرام تو ہمیں دے ناں آرٹسٹوں کو۔“

”اگر وہ لڑکیوں کو پروگرام نہ دے تو کبھی وہ آکر بیٹھیں اس کے پاس۔ پھر وہ عشق کن سے کرے۔“

”آپ بھی ایسے ہی ہیں سرجی؟“

”ہاں کچھ کچھ“

ہم دونوں ہنس دیے۔

ریڈیو سٹیشن پر بھائی چارے، بے تکلفی اور عجیب قسم کے سچ کی فضا رہتی ہے۔ بوڑھے آرٹسٹوں کو کوئی آپ کہہ کر نہیں بلاتا۔ بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ اپنے سے چھوٹوں کی طرح بولنا، ہنسی مذاق ضلع جگت شیا م گھات سب چلتا ہے۔ اسی لیے اس فضا میں کئی بار سالوں کا سفر لمحوں میں کٹ جاتا ہے۔ اتل اور میں بھی اس ملاقات

میں بڑے قریب آگئے۔

”کیا عمر ہے تیری امتل؟..... میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے پوچھا۔

”بتیس سال سرجی“

”یہ کم بخت سارے لوگ مجھے ابھی سے باجی کہنے لگے ہیں۔ کم بختوں کو شرم نہیں

آتی ابھی میں سب کے سامنے بچوں کے پروگرام میں ترانے گایا کرتی تھی۔ کل کی بات ہے۔“

”لیکن پچھلے ریڈیو سٹیشن کی باتیں تو تمہیں خوب یاد ہیں“

”لیں بچے کو سب کچھ یاد ہوتا ہے۔“

”لیکن قاضی کے کمرے میں تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری عمر بیالیس برس ہے۔“

”کیا کریں قاضی صاحب اسی بات سے خوش ہوتے ہیں سرجی۔ خدا قسم

ہماری پروفیشن میں جسم ویسے ہی ڈھل جاتے ہیں۔ میری ماں پچاس کی ہے لیکن ستر کی لگتی ہے۔“

میں نے اسے زیادہ زچ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”ایک بات بتاؤں آپ کو؟“

”بتاؤ“

”آج میری کوئی ریکارڈنگ نہیں تھی..... ہمیں تو کوئی کورس میں بھی چانس نہیں

دیتا سچی۔“

جھوٹ بول کر اس پر قائم رہنا امتل کے بس کی بات نہیں تھی۔

مجھے امتل پر یکدم بڑا ترس آیا..... کوئی کوئی عورت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ وہ

چاہے ستر برس کی کیوں نہ ہو جائے اسکے اندر کچھ ایسا دوشیزہ پن موجود رہتا ہے کہ

مرد کا دل اسے دیکھ کر موم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا..... امتل ہمیشہ تو ایسی نظر نہیں آتی

تھی۔ لیکن کبھی کبھی اچانک وہ بڑی معصوم بڑی کنواری اور کھوئی ہوئی نظر آنے لگتی۔

ایسے لمحوں میں اسے دنیا سے بچانے کو جی چاہنے لگتا۔

بھنبھور ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے دوسرا دن ڈیڈ لائن تھی۔

میں چاہتا تو ناہید کی جگہ کسی اور لڑکی سے کام نکال سکتا تھا۔ لیکن مجھے نازک مزاجوں سے بڑا عشق ہے۔ ریڈیو سٹیشن کی نوکری بھی مجھے اسی لیے پسند آگئی۔ کیونکہ یہاں بھی چبے۔ ٹوٹے بنگے، اڑب، ملائم سب نازک مزاج تھے۔ خاص کر وہ آرٹسٹ جن کی ضرورت پروڈیوسروں کو کم تھی اور جن کی نازک مزاجی اس ضرورت کو کمتر کر دیتی تھی۔

ناہید سے معافی مانگ کر اس کی انا کو بحال کرنے کے لیے میں ہیرامنڈی گیا۔ میں اپنی نئی موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ اس کی نمبر پلیٹ ہینڈل سیٹ سب چمک رہے تھے۔ موٹر سائیکل نیا ہوا اور اپنا ہوتو یوں لگتا ہے جیسے عربی گھوڑا رانوں تلے آگیا ہے اور آدمی زمین کے بجائے بادلوں میں اڑ رہا ہے داتا دربار سے آگے دورو یہ سڑک پر رش نسبتاً کم محسوس ہوتا ہے۔ سڑک کی دوسری جانب نالے سے ادھر لال پیلی ڈوروں کے تانے پر کچھ مزدور صورت مانجھا پھیر رہے تھے۔ ہیرامنڈی کو دراصل دورا سے جاتے ہیں ایک لیڈی ولنگڈن کے پہلو سے ہو کر بادشاہی مسجد کے عقب تک پہنچتا ہے۔ دوسرا پہلے گھاٹی نما سڑک سے گزر کر ہیرامنڈی پہنچتا ہے۔ میں بادشاہی مسجد والے راستے پر بڑے خطرناک طریقے سے موٹر سائیکل چلاتا بازار میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے نہ کبھی میں ناہید کے گھر گیا تھا نہ ہی ان گلیوں سے واقف تھا۔

تھوڑی سے تلاش کے بعد میں ناہید کی گلی میں جا نکلا۔ ناہید کے گھر کے بالکل سامنے رانی بینڈ والوں کا چوبارہ تھا۔ اور اس وقت وہ پگڑیاں سروں پر لپیٹتے کلارنٹ، بھونپو، باجے، تاشے اور ڈھول اٹھائے تنگ سیڑھی سے اتر رہے تھے۔ گلی صاف

ستھری اور سنسان تھی..... بینڈ والوں کے کوٹھے پر ان کا بورڈ نصب تھا جس کے نیچے رقم تھا کہ باوردی آنے کے ریٹ مختلف ہیں۔

جس وقت اکا دکا سر بجاتے رانی بینڈ والے نکلے پر غائب ہو گئے۔ میں نے چوتھی مرتبہ ہارن بجایا۔ لیکن ناہید کے سہ منزل مکان سے کوئی برآمد نہ ہوا۔ اس سے پہلے گھنٹی بجانے پر بھی کوئی باہر نہ نکلتا تھا۔ اس کے بعد میں نے دروازے کا کنڈا تختے سے بجان شروع کر دیا۔ جس وقت ایک سات آٹھ سالہ لڑکی باہر نکلی۔ میرا ارادہ ناہید کو کاسٹ کرنے سے بالکل اکتا چکا تھا۔

بڑے محرابی پھانک کے پیٹ میں بنے ہوئے طاقتور نما دروازے سے وہ باہر نکلی اندر ایک بھینس بیٹھی جگالی کرنے میں مشغول تھیں اور مشین چلنے کی آواز آرہی تھی۔
”ناہید بی بی ہیں؟“

لڑکی نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آرام سے کھڑی اُلی کھاتی رہی۔
کیا ناہید بی بی کا یہی گھر ہے؟“
وہ آرام سے کاغذ چاٹنے میں مشغول تھی۔

”منی میں ریڈیو سٹیشن سے آیا ہوں..... کیا یہ ناہید کا گھر ہے؟ ریڈیو آرٹسٹ ناہید کا۔“

اب منی کی زبان فر فر چلنے لگی۔

”اچا جی آپ ریڈیو سٹیشن سے آئے ہیں۔ باجی تو صبح کی ریڈیو سٹیشن گئی ہوئی ہے ناشتہ بھی نہیں کیا اس نے..... بابا علیا آج صبح نکسالی سے نہاری لایا تھا۔ باجی نے وہ بھی نہیں کھائی خدا کی قسم..... صبح بی بی نے اتنے جھڑکے دیے باجی کو..... تین بار میک آپ کرنا پڑا باجی کو۔“

تین بار کیوں؟“

وہ میری کم عقلی پر ہنس دی..... باجی رو رہی تھی صاحب جی۔ پوڈر تھوڑی ٹھہرتا

تھا اس کے منہ پر۔“

”جھڑ کے کیوں دیے بی بی نے۔“

”ریڈیو سٹیشن نہیں جاتی تھی باجی..... بی بی کا غصہ ہی برا ہے..... پرسوں باجی گلزار کے منہ پر کھچ کے چیڑ مار دی تھی۔ باجی گلزار گری منجے پر پاوا لگا گال پر دو ٹانگے لگے۔ پھر سارا دن بی بی بیٹھی روتی رہی۔ اپنے منہ پر چیڑیں مارے اور روئے ہائے ہائے اپنا مال آپنی داخلی کر لیا میں نے..... صاحب جی ریڈیو سٹیشن کیا ہے؟.....“ چھوٹی سی لڑکی بڑی پکی باتیں کر رہی تھی۔

”کبھی اپنی باجی کے ساتھ آ کر دیکھ لینا۔“

”باجی کہیں نہیں لے جاتی جی..... کہتی ہے میری پوزیشن خراب ہوتی ہے۔“

میں اس شہزادے سے پتہ نہیں کب تک باتیں کرتا رہتا لیکن اسی وقت کسی نے میرے کندے پر ہاتھ رکھ کر کہا..... ”کیوں سرجی اس وقت کہاں چوری چوری؟“

میں نے پلٹ کر دیکھا اتل کھڑی تھی سرخ ہونٹوں تلے اس کے نسواری دانت بھی مسکرا رہے تھے۔

”آئیں ناں غریب خانے پر“

”آج نہیں اتل آج مجھے ڈرامہ بھنھو ریکارڈ کرنا ہے۔“

”ناں ناں..... لا را چھوڑیں..... ہمارا رواج نہیں کہ ایک بار پھنسے شکار کو چھوڑ دیں..... چلیں آپ۔“

”یپ باجی سے ملنے آئے ہیں ریڈیو سٹیشن سے..... لڑکی نے قہر بھری نظروں سے اتل کو دیکھ کر کہا۔“

”کیوں ایک تیری باجی کے ملنے والے ہیں ریڈیو سٹیشن پر..... اور کسی کا کوئی ملنے والا نہیں وہاں چلترو۔“

یکدم لڑکی نے مہربانہ زوتھام لیا

”بی بی مجھے مارے گی صاحب جی۔“

”اوائے ہوئے وڈی ہیجلی..... چل جا کر بتا اندراپنی کپتی بی بی کو اتل لے گئی ہے ریڈیو والے صاحب کو..... جا کھڑی کیوں ہے؟..... ان کے گھرانے نے تو دہلیز میں تعویذ دبا رکھا ہے جو کوئی اندر داخل ہو گیا باہر جوگا رہتا ہی نہیں..... چلیں سر جی فوراً یہاں سے۔“

اب ایک بازو میرا شہر زار کے ہاتھوں میں تھا اور دوسرا اتل تھا مے ہوئے تھی
”مجھے ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہے منی میری ریکارڈنگ ہے۔“
باجی کے ساتھ؟

”ہاں باجی کے ساتھ۔“ منی نے بازو چھوڑ دیا۔
”خدا کے لیے سر جی ایک بار میرے گھر چلے چلیں..... میری عزت بن جائے گی.....؟“

اتل گر گرائی

میں شہر زادے سے نظریں اٹھا کر اتل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔
ہم تھوڑی دور گئے تھے کہ منی بھاگی ہوئی ہمارے پاس آئی اور گھبرا کر بولی.....
بی بی مجھے مارے گی آپا جی آپ انہیں ساتھ نہ لے جائیں۔“
”چل مشنڈی خبردار جو پیچھا کیا ہمارا پتہ نہیں میرا۔“

لڑکی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں شہزاد کے ساتھ لوٹنا چاہتا تھا لیکن اتل
میں کچے ایسی بات تھی کہ میں خوفزدہ ہو گیا۔

گلی تنگ اور خاموش تھی دور وہ پرانی وضع کے چھجے اور شیشیوں والے مکان
تھے جن پر پرانے پینٹ کے جالی دور دروازے اور بوسیدہ کھڑکیاں اس وقت سختی
سے بند تھیں۔ رات کو یہاں سے موسیقی کی آواز اور گھنگھروں کی جھنگارت نکلتی ہوگی اس
وقت ان مکانوں کے پٹ کھلتے تو کھانتے ہوئے بڑھے پان کھاتی ادھ کھائے

امرو جیسی عورتیں اور مٹھیوں میں پیسے بھیچے بچے باہر نکلتے۔ گلی ویران تھی۔ جوان پیشہ ور عورتیں اس وقت رات جاگے چوکیداروں کی نیند سو رہی تھیں اور والی منزلوں سے گدلا پانی رس کر گلی کی نالیوں میں پڑ رہا تھا پرانے گھروں کی دیواروں میں پیپل کی کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔..... یہ گلی بالکل شانت تھی اس کا رات کے کاروبار کے ساتھ دن کے وقت کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے اندر باہر اس وقت ٹوٹے ہوئے میلے جیسی اداسی تھی۔

”دیکھو اتل میری ریکا رڈنگ ہے پورے گیارہ بجے ساری کا سٹ جمع ہوگی۔ پھر انجیر وقت دے سکے یا نہ دے سکے اب مجھے جانے دو۔“
اتل کے گھر کے سامنے میں نے سماجت سے کہا۔

”سرجی آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ آپ آج میرے گھر چل کر ایک بوتل پی لیں۔ خدا قسم سارے محلے میں میری بڑی عزت ہو جائے گی۔ اب تو کئی سالوں سے میرے گھر نہ کوئی فلم والا آیا ہے نہ ریڈیو سٹیشن سے کسی نے خبر لی ہے۔“

باہر ڈیوڑھی میں اپنی موٹر سائیکل پارک کر کے ہم دونوں اندر صحن میں داخل ہوئے ان صحن کے ارد گرد کمرے ہی کمرے تھے۔ آنگن میں ڈھیلی چار پائیاں پڑی تھیں ان چار پائیوں پر رنگ برنگ مختلف عمروں کے لوگ بیٹھے ہم دراز اور لیٹے ہوئے تھے جا بجا باسی برتنوں کے ٹرے کوڑے کی ٹوکریاں، پرانے کپڑوں کے انبار پڑے تھے بچے رو رہے تھے عورتوں کے بولنے کی آواز آرہی تھی ریڈیو چل رہے تھے حساب ہو رہے تھے یہ گھر کسی کا گھر نہیں تھا اور سب کا گھر تھا بہت سا بے مصرف سامان زائد چہرے اور فرنیچر کی وجہ سے یہاں سب کچھ فالتو اور بیکار نظر آتا تھا۔

اتل میرا بازو تھامے بڑے فاتحانہ انداز میں صحن میں داخل ہوئی میں اس کی ٹوٹی تھا اور وہ مجھے جیت کر لائی تھی ہم دونوں بغلی سیڑھیوں سے اوپر والی منزل میں داخل

ہوئے یہاں بھی نچلے کمروں کی طرح چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے لیکن اوپر والی منزل میں داخل ہوئے یہاں بھی نچلے کمروں کی طرح چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے لیکن اوپر والی منزل قدرے غیر آباد تھی صحن کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں بند تھیں۔ کمرہ بے ترتیب تھا ایک پرانا پلنگ تھا جس پر بوسیدہ کھیس اور نسواری رنگ کی شنیل کی رضائی پڑی تھی الماری کے پٹ بالکل کھلے تھے اور ان میں ٹھنسا ٹھنسا بغیر تہ کئے ہوئے کپڑے اٹے رہے امتل نے کمرے میں گھستے ہی الماری کے پٹ بند کر کے اس کے سامنے کرسی رکھ دی بوسیدہ صوفے پر چڑھ کر پھر سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں کھولیں اور مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”یہ اتنی ساری مخلوق یہاں رہتی ہے امتل..... تمہارے ساتھ؟“

”ہاں سر جی ہمارا رواج ہے ہم لوگ اپنے بزرگوں کی بہت عزت کرتے ہیں.....“ وہ اپنا دوپٹہ اتار کر صوفہ جھاڑنے لگی۔

”یہ سب تمہارے بزرگ ہیں..... بچے لڑکیاں سب؟“

”کچھ بزرگ ہیں کچھ رشتہ دار ہیں۔ اچھا یہ بتائیں کوکا پیس گے فینا۔“

”امتل..... سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں ریکا رڈنگ ہے میری۔“

”چائے سبز تہوہ؟“

”چلو چائے سہی۔“

اب اس نے دوپٹہ برقعہ سب پلنگ پر پھینک دیا اور اندر صحن کی جانب کھلنے والے چھجے کی طرف چلی گئی۔

”بی بی..... بی بی جی چائے بھجوائیں اوپر..... پارٹی آئی ہے.....“ پشت سے وہ بالکل بیالیس برس کی معلوم نہ ہوتی تھی اس کے کوہے کمر کندھے پچیس برس کی جوان عورت کے نظر آ رہے تھے جب وہ صحن کی طرف کھلنے والے دروازے کی چٹنی لگا کر اندر آئی تو اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی تھی۔

”پارٹی کا کیا مطلب ہے امتل؟“

اس نے آنکھ مار کر کہا..... ”سرجی پارٹی گاہک ہوتا ہے اب وقت بدل گیا ہے گاہک کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

میں کچھ گھبرا کر بولا..... ”لیکن میں تو پارٹی نہیں ہوا امتل“

”سرجی کیا بتائیں میری عزت بن جائے گی محلے میں آپ کا کیا جائے گا..... ویسے بھی اب تو میرے مہمان کی بی بی خاطر ہی نہیں کرتی اب تو فیروزہ کے دن ہیں۔“

”فیروزہ کون؟“

”میری چھوٹی بہن ہے سرجی..... اچھے پیسے لاتی ہے مجھوں سے۔ اس کی خاطر میں ہوتی ہیں اس کے مہمانوں کو ککڑ بھون بھون کر کھلاتی ہے..... میں تو چائے بھی منگوا لوں تو بی بی کو غصہ چڑھ جاتا ہے۔“

پتہ نہیں مجھے کیوں اتل پر شدید ترس آ گیا۔ جب آدمی اندر سے شدید بحران کا شکار ہو چکا ہو اور تنہائی کے دشت میں بہت گھوم پھرے تو عمو ماوہ اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے محبت کرنے لگتا ہے کیونکہ اسے مامتا کی سکورٹی درکار ہوتی ہے شاید یہی وہ لمحہ تھا جس میں ایک لا حاصل رابطے کا شکار ہوا۔

مجھے اس کے بوڑھے جسم میں دو شیزہ گی کی ادائیں دیکھ کر ایسی تکلیف ہو رہی تھی کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسے اس کی جوانی کہیں سے لا کر لوٹا دیتا دراصل یہی وہ وقت تھا جب مجھے بھاگنا چاہیے تھا کیونکہ وہ بھی میری طرح ادھ مواء گرج تھی اس گدھ کی ساری زندگی بیابانوں میں اجڑے تھلوں میں سوکھے پیڑوں پر کٹی تھی لیکن ہم مشرب کو سامنے پا کر مجھ سے بھاگنا گیا اس میں کچھ ایسی گرمی لاجت اور جھسورت تھی کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے السر کا درد بھی بھول گیا۔

”میری بی بی بھی بہت بد قسمت ہے بیچاری۔ اگر اس کے گھر پانچ بیٹوں کی جگہ

پانچ بیٹیاں ہوتیں تو آج راج کرتی بی بی..... پر ایسی ٹھنڈی قسمت ہے بی بی کی
..... دے لڑکا پے لڑکا..... دے لڑکے پر لڑکا..... جو کہیں فیروزہ پیدا ہوتی تو ہم سب
تو ناقوں مر جاتے۔ خدا قسم بی بی تو اسے بھی میرا قصور سمجھتی ہے اس کا بس چلے تو اس
کی سزا بھی مجھے ہی دے۔“

پہلی بار میں ایک ایسی سوسائٹی میں داخل ہوا تھا جہاں بیٹے کی پیدائش غم انگیز
امرتھی..... ”پانچوں بہوئیں بھی تو آئی ہوں گی اسی گھر میں؟“
”ہماری طرف بہو پیشہ نہیں کرتی سرجی۔ پیشہ صرف بیٹی کرتی ہے۔“
”اس کی کیا وجہ ہے اتل“

”بظاہر تو کوئی وجہ نہیں سرجی صرف رواج ہے لیکن شاید صرف بیٹی ہی ماں کو سارا
کچھ دے سکتی ہے بہو ہمیشہ کرے تو کبھی ساس کو کچھ دے؟ پھر پیشہ کرانے کا فائدہ؟“
“

اس وقت میں سوشیالوجی کا ایک پرانا طالب علم اصلی معنوں میں طالب علم بنتا
ہے۔

”اتل..... یہاں کس قسم کی لڑکی اچھی طوائف بنتی ہے..... کچھ تو نشانیاں ہوں
گی ناں؟“

”ہاں سرجی نشانیاں پکی ہوتی ہیں۔ جس لڑکی کی آنکھ بولے ہونٹ دعوت
دیں چلتے میں کو لھے ملیں سچی بات ہے سرجی جس کا جسم نہ بولتا ہو وہ ادھر بھی گرہستن
رہتی ہے، آپ کے شہر میں بھی بیچاری بچے پالتی مرتی ہے عورت کا تو انگ انگ بولتا
ہو تو کام بنتا ہے.....“ میری نگاہوں میں گرم سم بھا بھی صولت کا چہرہ گھوم گیا۔

”ادھر تمہاری طرف بھی کچھ Status وغیرہ کا چکر ہے اتل۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”یعنی کچھ طبقے وغیرہ..... کچھ ذات برادری کا چکر اونچ نیچ۔“

وہ ہنسنے لگی۔

”نوسر جی اونچ نیچ کا چکر کہاں نہیں..... چوروں میں اس کا چکر سٹنگروں میں اس کا چکر کچھ چور صرف نقدی سونا چرانے والے ہوتے ہیں۔ کچھ بھینس بکری کھول کر لے جاتے ہیں۔ کچھ صرف گلوں کے ڈھکنے اٹھاتے ہیں۔“
”اور تمہارے ہاں؟“

”ہمارے ہاں بھی سر جی تین طبقے ہیں۔ اونچا طبقہ..... امیر ڈیرے دار طوائفیں، درمیانہ طبقہ عزت دار غیرت دار لوگ رسم و رواج کے پابند..... تیسرے غیر مبندے حال..... سب سے راندی ہوئی بھیڑے حال اور ٹھکیائی ہوتی ہے۔ جسے ہونٹ لال کرنے جو گے پیسے بھی نہیں ملتے۔ اس کا پیٹ سینہ سب سپاٹ ہوتا ہے۔ بالوں میں پلاسٹک کے کانپ جسم پر نائیلون کے ایسے پرانے کپڑے جن سے پسینے کی بو آتی ہے۔ اس ٹھکیائی کے کئی حرامی بچے ہوتے ہیں۔ ایک بیمار شوہر ہوتا ہے کئی ہر جائی مفت خورے آشنا ہوتے ہیں۔ یہ سوتی بھی بار بار ہے اور کاروبار بھی اس کا ادھر پر چلتا ہے۔ شوہر اس کا مارنے والا چڑیا ہوتا ہے۔ وہ سر جی کئی چکیوں میں پستی ہے۔ کبھی شوہر کی چکی میں کبھی بچوں کی چکی میں کبھی غربتی کبھی ادھار کی چکی میں، ہمیں تک پہنچتے پہنچتے تو اس کا صرف چھوٹا باقی رہ جاتا ہے ہڈیوں پر..... آپ کو ایسی طوائف نظر آجائے تو آپ ناک پر رومال رکھ لیں۔ یہ جو آپ کے ادیب شاعر لوگ ہیں۔ وہ کبھی ایسی طوائف کی کہانی نہ لکھیں اس پر کون غزل کہے؟ گندی نالی کے پاس کون بیٹھے بتائیے؟“

میں غور سے اتل کود کھ رہا تھا۔ اس وقت وہ بہت تجربہ کار اور بوڑھی نظر آرہی تھی۔

”دوسرا ٹڈل کلاس طبقہ ہے سر جی جس طرح آپ کی ٹڈل کلاس عورت شریف ہوتی ہے۔ رسم رواج کے ہاتھوں ہماری ٹڈل کلاس عورت پر بھی بڑی پابندی ہوتی

ہے۔

اس پر اخلاقی معاشرتی ذہنی کئی پٹیاں کسی ہوتی ہیں۔ یہ کرو وہ نہ کرو کی تلوار لٹکی ہوتی ہے ان کے سر پر..... انہیں بھی شریف زادیوں کی طرح عشق کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“

”وہ کیوں“

”طوائف کا تو ازلی دماغ خراب ہے۔ ادھر اس کو عشق ہوا ادھر وہ بھاگ جائے گی۔ سارا کاروبار ٹھپ اسی لیے تو کبخر، نایکا گھر والے سب اسے ڈرا دھمکا کر رکھتے ہیں۔ وہ عزت، غیرت، نفع نقصان، لین دین پردہ بے پردگی، کئی قسم کے نظریات میں جکڑی ہوتی ہے۔ نماز روزہ، مندر نیاز، عاشورے کو منڈے گیارہویں شریف گندہ تعویذ دم و درود سب اس کی زندگی پر چھائے ہوتے ہیں۔ دراصل وہ بھی آپ کی مڈل کلاس عورت کی طرح بڑی جذباتی وہمی اور ڈرپوک ہوتی ہے سرجی..... جو رقم وہ کماتی ہے سیدھی ماں کے پاس پہنچتی ہے۔ کیونکہ مڈل کلاس کی عورت کو اپنی ماں سے بڑا پیار ہوتا ہے۔ اس پیسے سے اس کے بھائی بوسکی کی قمیضیں پہنتے ہیں عطر لگاتے ہیں۔ بلیک میں ملنے والے سگریٹ پھونکتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہر مڈل کلاس عورت کی طرح ڈنڈی مار کر رقم بچانے لگتی ہے۔ کسی کسی گاہک سے علیحدگی میں کچھ رقم موس لیتی ہے۔ پھر اس رقم سے پان مٹھائی کھانے کا آرام ہو جاتا ہے کاسٹیم جو لیری خریدی جاسکتی ہے۔“

”اور اخلاقی طور پر یہ مڈل کلاس کی طوائف کیسی ہوتی ہے اہل۔“

شریف ہوتی ہے سرجی..... عموماً اسے شراب، جوئے اور اپنے پیشے سے نفرت بھی ہوتی ہے۔ آپ کی مڈل کلاس عورت کی طرح..... لیکن اس کا حسن بھی دوروزہ ہوتا ہے۔ عمر ڈھلے پر چاہے وہ اچھی گانے والی ہو چاہے تہلکہ مچانے والی سب اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں..... سب کے سب۔“

میں نے اہل کی جانب دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک چھوڑی ہوئی ٹڈل کلاس طوائف تھی۔

”صرف اسی کو شادی کا شوق ہے۔ جتنی عورتیں ہیرا منڈی سے نکاح کے شوق میں بھاگتی ہیں وہ سب اس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ گریہ سستی کے شوق میں یہ ساری ساری عمر کجری ہونے کا طعنہ سنتی ہیں اور کبھی لوٹ کر پیشہ کرنے نہیں جاتیں..... ان کی عقل ہمیشہ ان کو خراب کرتی ہے ان کا دل ہمیشہ ان کی مٹی پلید کرتا ہے۔“

”وہ سر جی ہر جگہ عیش کرتی ہے۔ آپ کی طرف ہو تو ایک مرد کی دولت اس کا نام شہرت اس کے کام آتا ہے۔ ادھر کی ہو تو کئی امیر آدمیوں کے گھروں میں سیندھ لگ جاتی ہے۔ آپ کا شاعر جب غزل کہتا ہے اس طبقے کی طوائف پر کہتا ہے فلم بنتی ہے تو اس کو سامنے رکھ کر..... کہانی لکھی جاتی ہے تو وہی نظر میں ہوتی ہے مشنڈی..... نہ نماز نہ روزہ لے دے کر ایک مذہب ہے اس کا کالے کپڑے پہن کر بڑھیا فرانسیزی خوشبو لگا کر مجلسوں میں جانا..... سر جی جس عورت کے منسٹر تلوائے چاتیں جاگیر دار ہاتھ جوڑیں اونچا افسر جس کے گھر میں ٹائی اتار کر بیٹھے بھلا اس کے کیا کہنے؟ اللہ ادھر منڈی میں تو پیدا کرتا سر جی پر کسی اونچی ڈیرے دار طوائف کے گھر۔“

اس اہل سے میں واقف نہ تھا۔ وہ بڑے تسلسل اور تجربے سے بولنے کی اہل تھی اور اس کی باتوں میں ایک خاص قسم کی منطق تھی۔ پیہ نہیں یہ اس کی گفتگو تھی۔ کہ سوشیا لوجی میں دلچسپی اب میں کافی حد تک ہو چکا تھا اور مختلف قسم کے سوال پوچھ رہا تھا۔ چائے کاڑے میز پر رکھ کر نو جوان لڑکے نے پوچھا..... ”بی بی پوچھتی ہیں صاف چادریں اور غلاف بھی بھیج دوں۔“

اہل نے چور نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر کھیسانی ہنسی ہنس کر بولی۔
 ”لے اور نہیں تو کیا۔“

”اور پان کا بھی پوچھا ہے بی بی نے۔“

”وہ بھی بھیج دے۔“

نوجوان لڑکا ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈال کر لجاجت سے بولا..... سرجی زرا موٹر سائیکل کی چابی دیں..... میں لوہاری سے پتنگ لے آؤں۔

”تیری ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ یہ ریڈیو سٹیشن سے آئے ہیں کوئی ایویں کیویں نہیں ہیں جا..... پھٹا کھا۔“

میں نے جیب سے نئے موٹر سائیکل کی چابی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔
”نہ سرجی جو ادھر آتا ہے یہی کرتا ہے یہ اسی لیے چوڑا ہو جاتے ہیں ہمارے لڑکے۔“

”اچھا ابھی جلدی آنا مجھے ریڈیو سٹیشن جانا ہے..... ریکارڈنگ ہے میری..... گیارہ بجے!“

”یہ کم بخت کبھی جو رات کے بارہ بجے سے پہلے آگیا..... اتل نے جھپٹ کر چابی چھین لینا چاہی لیکن وہ اتنی دیر میں چمپت ہو گیا۔
”اب آپ ریڈیو سٹیشن کیسے جائیں گے؟

”تم فکر نہ کرو آجائے گا ابھی..... اس عمر میں سب کو موٹر سائیکل کا شوق ہوتا ہے۔“ وہ عمر میں مجھ سے قریباً دو گنی تھی۔ اس کے باوجود اس کی لجاجت، شرمندگی اور کم ہمتی نے عمر میں اسے مجھ سے چھوٹا بنا دیا تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر وہ تھانیدارنی بنی پھرتی تھی یہاں اس کے چہرے پر کنواری لڑکی جیسی حیا چھلکنے لگی۔ پتہ نہیں کیوں یکدم میں اس کے ساتھ بہت آرام دہ محسوس کرنے لگا۔

بڑی دیر تک وہ آؤ بھگت میں لگی رہی۔ مہمان نوازی اس کے ساتھ ایک نیچرل نسوانی فعل تھا۔ جیسے ماں دودھ پلاتی ہے۔ میں اب اس علاقے کی طبقاتی کشمکش میں دل سے دلچسپی لینے لگا۔

”تم بھی تو بڑے ٹھسے کی ہوگی اپنے وقت میں اتل۔“

تھی جی..... پر ادھر مڈل کلاس کی عورت سے کچھ نہیں ہوتا۔ ٹاکیوں کی گڈی ہوتی ہے وہ تو..... میں نے ساری عمر اتنی مارشریف عورتوں سے نہیں کھائی سر جی جتنی امیر رنڈیوں سے کھائی ہے جو بھی اچھا گا بک کبھی ملا۔ بالآخر انہوں نے چھین لیا۔ جو کام کا گا بک لگایا ڈاکر لے گئیں۔

پتہ نہیں کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ چپ ہو گئی۔

اتنل بہت زیادہ جی چکی تھی۔ ان گنت لوگوں سے ملتی تھی۔ اس کے تمام خوب صورت کنارے، نیارے، رنگ روغن، منقش پھول بوئے ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اس قدر استعمال شدہ ہونے پر بھی اس میں ایک حزن اور خوبصورتی ایسی بھی پیدا ہو گئی تھی جو پرانے کھنڈروں میں ہوتی ہے۔ ایک طرح سے وہ بچھا ہوا سگریٹ تھی۔ بے دھیانی، بے منزل کی انتہا..... لیکن کبھی کبھی اس سگریٹ میں آگ کے شعلے خود بخود نکلنے لگتے..... ریڈیو سٹیشن پر وہ اور ہوتی..... گھر پر ایک اور اتنل ملتی..... بازار میں اس کا رنگ بالکل انوکھا ہوتا.....

نوجوان کے جانے کے بعد چادریں اور غلاف آگئے، اتنل نے بستر اصفائی سے بچھایا اور مجھ سے نظریں چرائے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ ریکارڈنگ کا ٹائم نکل گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے لیکن نوجوان موٹر سائیکل لے کر نہ لوٹا۔ میں چلا تو جاتا۔ لیکن دوبارہ میں موٹر سائیکل لینے ادھر نہ آتا چاہتا تھا۔ جب ہم رات کا کھانا کھا چکے تو اتنل نے لجاجت سے کہا۔ ”سر جی اب آپ چلے جائیں خدا قسم وہ تو چاہے کل تک نہ آئے الو کا پٹھا۔!“

مجھے دوبارہ ادھر آنے سے خوف آ رہا تھا۔ خیال تھا کہ اگر ایک دفعہ اور میں ادھر آیا تو پھر میں کبھی یہاں سے جانہ سکوں گا۔ بازار جاگ اٹھا تھا اور موسیقی کی آوازاں ادھر بھی آنے لگی تھی۔

”آپ سو جائیں سر جی..... میں ادھر صوفے پر لیٹ رہوں گی صاف بستر ہے۔“

میں چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔

وہ لجاجت سے پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ اتنی عمر کی عورت کو میں نے اس قدر بے بس کبھی نہیں دیکھا۔

”آپ ٹیکسی پر چلے جائیں سر جی..... میں کل ریڈیو سٹیشن آپ کا موٹر سائیکل بھجوا دوں گی۔“

میں چپ رہا۔

”یہ رضائی صاف ہے..... اس میں کوئی نہیں سویا سر جی.....“ اس نے منہ پرے کر لیا۔ شاید وہ رورہی تھی۔

میں نے جوتیاں جرابیں اتاریں ٹائی کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا اور چپ چاپ پلنگ پر دراز ہو گیا۔

”اُدھر اُدھل۔“

”جی سر جی۔“

”میرا نام معلوم ہے ناں تمہیں؟“

”جی“

”تو مجھے قیوم کہو ناں؟“

”اچھا سر جی۔“

”یہاں بیٹھو۔“

وہ پلنگ کی پانتمی بیٹھ گئی۔ اس کے کندھے آنکھیں اور ہاتھ بہت خوبصورت

تھے۔ یکدم وہ میری ٹانگیں دبائے لگی۔

”یہ کیا کر رہی ہو اہل؟“

”کچھ نہیں جی..... جی چاہتا ہے..... بڑی دیر ہو گئی میں نے کبھی کسی کی

ٹانگیں نہیں دبائیں۔“

”ادھر آؤ میرے پاس۔“

وہ ڈرتے ڈرتے سر ہانے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”کبھی تم نے کسی سے محبت کی ہے..... لا حاصل محبت..... دیوانہ بنا دینے

والی..... جیسے خالی کنویں میں گونج پھرتی ہے۔“

وہ چپ رہی..... میں کہنی کے بل ہو گیا۔ پھر میں نے اس کی جھولی میں ہاتھ ڈال

کر پوچھا..... ”لا حاصل محبت اور دیوانگی میں کچھ فرق تو نہیں ہوتا اہل..... تم تو تجربہ

کار ہو بتاؤ..... تم نے کبھی عقل شعور سے نکل کر محبت کی ہے۔“

میرے ہاتھ پر ایک بڑا سا آنسو گرا..... پھر اہل نے لمبی سانس بھری۔ لیکن

خاموش رہی۔

”بتاؤ اہل۔“

اس نے منہ پھیر کر کہا..... ہمیں کیا پتہ ان باتوں کا سرجی..... ہم لوگ کوئی زخم

تھوڑے ہوتے ہیں۔ زخم تو اور جگہوں سے لگتے ہیں۔ ہم تو صرف پھاہا رکھتے ہیں

زخموں پر..... ہمارا تو فسٹ ایڈ کا محکمہ ہے۔“

”پھر کسی کا زخم ٹھیک ہوا تمہارے ہاتھوں۔“

اب اس کی آنکھوں سے جھرنے کی طرح آنسو گرنے لگے..... ”ناں سرجی

..... یہ زخم ہمیشہ اسی سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں عنایت کرتا ہے..... کبھی کبھی تو یہ

اس کے بس کی بات نہیں رہتی۔“

میں نے اٹھ کر اس کے دونوں کندھے پکڑ لیے..... بتاؤ اہل جب آدمی کسی کو

زخم عطا نہیں کر سکتا۔ خود کسی کا زخم بھر نہیں سکتا تو پھر وہ جیتا کیوں ہے؟ جینے کیوں چلا

جاتا ہے؟۔“

پتہ نہیں کیوں اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے بولی..... آپ کیوں

روتے ہیں روئیں آپ کے دشمن۔“

”آدھی رات گئے جب میرا موٹر سائیکل نیچے آیا تو میری آنکھ کھلی۔ باہر کے لیمپ پوسٹ کی روشنی تیکے پر اس جگہ پڑ رہی تھی۔ جہاں اہتل سوئی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر اس کے چہرے پر لکھی تھی۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور ہونٹ لکیر دار تھے۔ وہ منہ کھولے ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ پہلی بار عافیت سے دو چار ہوا۔ اپنے ہم جنس کی رفاقت ملی۔ گلدھ برادری کا کوئی فرد اس قدر قریب پا کر میں نے اسے آہستہ سے اٹھایا۔

”اہتل!“

وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

جی سر جی۔“

”مجھ سے شادی کرو گی۔ ہم دونوں..... ہم دونوں ہمیشہ اکٹھے رہیں گے ہمیشہ ہمیشہ۔“

وہ عجیب طور پر ہنسی اور پھر مجھے تیکے پر دھکیل کر بولی..... ”اچھا صبح سہی اس وقت تو مولوی نہیں ملے گا۔“

پہلی بار مجھے دیر تک ہنسی آتی رہی۔ اپنے آپ پر..... اہتل پر اور ساری دنیا پر۔

یوں تو ہر دفتر میں یونہی آنے والوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن ریڈیو ٹیلی ویژن اور فلمی دنیا میں ایسے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے کچھ ایکٹر کچھ ادیب کچھ موسیقار پروگراموں کی تلاش میں آتے ہیں کچھ انفری یہاں محض ادیبوں گلوکاروں اور ایکٹروں سے ملتے آتی ہے کچھ ایسے خوش فہم خالی الوقت لوگ یہاں آتے ہیں جو سمجھتے ہیں ان شعبوں میں نام بنانا اور دولت کمانا بہت آسان ہے یہ لوگ ان مکھوں کی طرح ہوتے ہیں جن کا شہد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکوہ مکھیوں کی دیکھا

دیکھی پھولوں کا طواف کرنے میں مگن رہتے ہیں

میں کئی دن تک ہسپتال کا اسی بھیڑ میں انتظار کرتا رہا لیکن وہ ریڈیو سٹیشن نہ آئی

اس روز میں دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک میرے سینے کے نیچے
معدے میں جلن شروع ہو گئی میں کرسی پر بیٹھ گیا کچھ دنوں کے آرام کے بعد اب
میرے السر میں پھر تکلیف ہونے لگی تھی تکدم اتنا شدید درد اٹھتا اور جلن ایسی ہوتی
کہ سانس رکنے لگتا کبھی کبھی تو اس شدت تکلیف سے میرا سارا بدن پتے کی طرح
کانپنے لگتا اور میں سوچتا کہ کسی ہسپتال میں داخل ہو کر باقاعدگی سے اپنا علاج
کراؤں۔

اس وقت دروازے پر دستک ہوئی اور بھائی مختار اندر آئے راجپوتی مونچھوں
والے..... سیکرٹریٹ میں کام کرنے والے میرے بھائی نے کھانس کر میری جانب
دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

”یہاں ہو.....“ آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی نے سوال کیا۔

”جی نہیں.....“ میں یکدم چونکا ہوا گیا۔

وہ تھوڑی دیر تک اپنے گھٹنے دیکھتے رہے

”مارل صحت مند آدمی کو..... ایک وقت پر ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے..... ورنہ

وہ صحت مند نہیں رہ سکتا!“

”جی!“

”اچھا ہے کہ تم اب باقاعدگی سے دفتر جانے لگے ہو..... اور مجھے اس بات کی

خوشی ہے کہ تم پہلے سے بہتر ہو رہے ہو..... نئی موٹر سائیکل کی بھی مبارک باد ہو۔“

”جی!“

”کالج کے زمانے میں ہر نو جوان کو عشق ہو جاتا ہے..... یہ واقعہ قریباً سب کو پیش

آتا ہے..... لیکن اس کو روک بنانا درست نہیں۔“

میں حیران رہ گیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے سوائے کوئی میرے حالات سے اس قدر اچھی طرح آشنا ہو سکتا ہے اس وقت میرے ٹانگیں برادے کی بنی ہوئی تھیں اور میرا بوجھ ان کے لیے بہت زیادہ تھا میں اور بھائی مختار مکمل طور پر ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے ایک نا آشنا کے منہ سے اتنی قریبی باتیں سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔

”ہر آدمی اوسط زندگی بھر میں پانچ یا چھ فل سائز عشق کرتا ہے اور ہر عشق سے جانبر ہونے کے لیے اسے اوسط چار سے چھ ماہ تک لگتے ہیں..... تم نے بہت دیر لگا دی۔!“

میں چپ رہا۔

”تمہاری بھابھی کا بھی یہی خیال ہے کہ شادی کی یہی عمر ہے اس کے بعد شادی بالکل بیکار ہے کیونکہ عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں..... پھر آدمی کسی اور کے لیے زندگی میں جگہ نہیں بنا سکتا۔“

”میں سوچ کر جواب دوں گا۔“

”تمہاری نظر میں کوئی ہوتو ہمیں بتادو۔“

میری نظر میں میری ہم مشرب ہم جنس ہم مسلک اتل گھوم گئی۔

”عائدہ نے اپنی چھوٹی بہن کے لیے کہلوایا ہے بلکہ اس نے تو بہت اصرار کیا ہے اگر تم چاہو تو۔“

”جی میں سوچ کر جواب دوں گا۔“

وہ چپ چاپ واپس چلے گئے جیسے چھٹی کی درخواست منظور کرا لی ہو۔

یکدم میرے معدے میں دل جیسی ڈھڑکن پیدا ہو گئی میں لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا میں کھگا کر تھوک دور پھینکا۔ آگے بند کی طرف سے متعفن بو کا ایک بھبھکا میرے طرف لپکا۔

میری نظروں میں عائدہ..... سیسی..... اتل پنکھے کے پروں کی طرح گھومنے

لگیں۔ تیز گھومتیں تو ان کا ہوالا ایک ہو جاتا رفتار کم ہوتی تو علیحدہ علیحدہ نظر آنے لگتیں۔

عابدہ نے اپنی چھوٹی بہن کا رشتہ کیوں بھیجا تھا؟
کیا وہ بہن کے توسط سے مجھے زیر منقار رکھنا چاہتی تھی۔

کیا اپنی بہن سے مجھے بیاہ کرو مجھے انگوٹھا دکھانے کے منصوبے باندھ رہی تھی؟
جس وقت میں ریڈیو سٹیشن کے باہر پارک کی ہوئی کاروں کے ساتھ اپنی موٹر سائیکل رکھ کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اہلبرآمدے میں آتی ہوئی دکھائی دی اس وقت کچھ السر کی درد اور کچھ ذہنی نا آسودگی کی وجہ میں باتیں کرنے کے موڑ میں نہیں تھا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ اور میں کتاب کے صفحوں کی طرح بہت قریب رہ چکے تھے لیکن اہل ہر دن از سر نو شروع کرنے کی عادی تھی۔ اس کے چہرے پر پرانی ملاقاتوں کا شبابہ تک نہ تھا اس نے ایک بار پھر مجھ سے قطعی اجنبی پن سے بات کی..... ”السلام علیکم سر جی!“
”وعلیکم السلام“

”سر جی اپنے دوست قاضی سے میری سفارش کر دیں..... سنا ہے رات ان کے گھر کا ہوا ہے آج موڈ بھی اچھا ہے ان کا..... چائے بھی پلائی ہے انہوں نے اپنے چہرے سیوں کو۔“

میں ذہنی طور پر اپنے السر سے لڑ رہا تھا۔

”آج نہیں اہل۔“

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

”میں آپ کے لیے کچی لائی تھی پکا کر..... آپ کے دفتر میں رکھا ہے ٹفن کیرئیر

میں نے.....“

”میں تو آج ایک لقمہ نہیں کھا سکتا اہل..... آج میرے السر میں تکلیف ہے

ایک نوالہ بھی کھا لیا تو سارا دن معدے میں جلن رہے گی..... کھٹے ڈکار آتے رہیں گے۔“

جس وقت ہم مڑ کر پروڈیوسروں کے دفاتر کی طرف جانے لگے پروڈیوسر غنی کے کمرے سے ستارہ نکلی یہ پتلے ہونٹوں والی آرٹسٹ نیل کلاسیکی موسیقی کے پروگرام کرتی تھی۔ اسے آئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا لیکن ریڈیو سٹیشن پر اس تفنگ انداز کے گن گانے میں مشغول تھے کچھ کن رسیا حضرات کا خیال تھا کہ اس کا خرچ بہت درست ہے الفاظ میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے رچاؤ اور لگاؤ سے وہ گاتی تو تھی لیکن سب سے بڑی بات آرٹسٹ کا مقدر ہوتا ہے۔ یہ جس وقت یاور ہو دنوں میں سنان مقبولیت کے باپ پر آفتاب کی طرح چمکنے لگتا ہے۔

پرانی گانے والیاں اس سے جس قدر جلن، حسد اور بیر کا اظہار کریں یہی اس کی شہرت کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔

ستارہ کو آتے دیکھ کر اتل بھاگی اور اس سے بغل گیر ہو گئی۔

”سبحان اللہ سبحان اللہ کیا بات ہے تیری چن جی..... کل شام میں نے تیرا پروگرام ٹیلی ویژن پر دیکھا، واہ نی سادھائی پا..... پاپا کیا جگہ بنائی ہے تو نے پاکی..... کیا سر سجایا ہے کوئی کہہ سکتا تھا کہ نوک میوزک کا پروگرام ہے ماشاء اللہ ماشاء اللہ استاد محمود خان کی تعلیم کو چار چاند لگا دیے..... سارا ماں کا رنگ ہو بہو وہی لے پکڑنے کا انداز جیتی رہ چن جی۔“

ستارہ تعریف کے باوجود خفیف کھڑی تھی۔

ان اتل نے ستارہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ میری طرف کیا..... دیکھیں دیکھیں سر جی..... اللہ کی کرامت دیکھیں..... ہے کسی کی ریڈیو سٹیشن پر ہے یہ موہنی مورت کسی کا رنگ اچھا ہوتا ہے کسی کے نقش اچھے ہوتے ہیں اس کو تو رب نے سب کچھ دے رکھا ہے چھپڑ پھاڑ کر دیا ہے اسے سب کچھ۔“

حالانکہ نو دریافت شہرت نے ستارہ کو بہت تیز کر دیا تھا وہ میزیشنو سے لیکر پروڈیوسروں تک سب کے ناک میں دم کرنے کی اہل تھی لیکن اس وقت وہ بھی گڑ بڑا کر کھسائی نہی ہنسنے لگی۔

”چھوڑیے باجی اہل۔“

”ناں چن جی میں کوئی تیرے گن گارہی ہو میں تو اللہ سچے کی تعریف کر رہی ہو کیا کیا مورتیں بناتا ہے..... اپنا روپ کیسے کیسے دکھاتا ہے..... سبحان اللہ“

”چلو میں قاضی کی طرف جا رہا ہوں.....“ میں نے ان دونوں سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔

”چلتے ہیں سرجی چلتے ہیں..... یہ تل دیکھیں اس کی ناک پر..... اس کی ماں کے ہونٹ پر تل تھا سنا ہے سرجی عورت کے ہونٹ پر تل ہوں مرد اس سے بہت محبت کرتے ہیں..... ہیں جی.....؟“

ستارہ مری ہوئی بھینس کے کٹے کی طرح منہ تھتھائے کھڑی تھی میں بھی رسہ بڑوا کر بھاگنے کے موڈ میں تھا لیکن اس نے ہم دونوں کو پکڑ رکھا تھا۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے

”اس کی ماں کو بھی پہننے کھانے کا بہت شوق تھا سرجی..... پاکستان سے پہلے کا ذکر ہے میری عمر بہت کم تھی اس وقت لیکن میں نے اس کی ماں کو دیکھا ہے کنٹ پیلس میں..... میرٹ سوٹ سرجی..... آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا ہوا پیروں میں سفید سوئڈ کے کورٹ شوز..... وکٹوریہ سے اتری تو سارا کنٹ پیلس ہل گیا..... مہاراجہ بڑو داہا تھی دانت کا صوفہ سیٹ خرید رہے تھے اس وقت..... دو لاکھ روپے تک مول تول ہوا تھا اس وقت..... صوفہ سیٹ تو کیا خریدتے..... دو لاکھ اس کی ماں کو دینے اور ساتھ بٹھا کر لے گئے اپنی رولز رائس میں..... چن جی تیری ماں کی کیا بات تھی بٹیا..... آفت تھی آفت.....“

ہم دونوں برآمدے میں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

”یہ تم مجھے اس کا چہرہ کیوں دکھا رہی تھیں اہتل؟“

”تو اور کیا اپنا چہرہ دکھاؤں سر جی؟..... ہیں نا کملے بادشاہو..... جوانی اتر جائے

تو دوسروں کے ہی چہرے دکھانے پڑتے ہیں۔“

”تم اس کی ماں کا ذکر کیوں لے آئیں درمیان میں..... اسے کوفت ہو رہی تھی

..... اسے کوفت ہو رہی تھی۔“

”جھوٹی ہے سب کو بتاتی پھرتی ہے کہ یہ کسی ڈاکٹر کی بیٹہ ہے بڑھی ہو کر اس کی

ماں نے ڈاکٹر کر لیا تو کیا یہ ڈاکٹر کی اولاد ہو گئی ہم سے کسی کا پیچھا چھپا ہے دو گلیاں

ہم سے آگے گچھے والیوں کی گلی میں انکا چو بارہ تھا اب چاہے یہ گاجر گ رہے کالج

جائے میم بن جائے ہم کو تو یاد ہے سب کچھ۔“

چاہے یاد ہو لیکن کسی کو یاد دلانے سے فائدہ؟ کوئی اپنا ماضی بھولنا چاہے تو تم اسے

بھولنے نہیں دو گی..... ہے نا؟

ہم دونوں میرے دفتر کے اندر پہنچ گئے۔ اہتل نے برقعہ کا اوپر والا حصہ اتار کر

کرسی کی پشت پر لٹکا دیا اور لمبی سانس بھر کر بولی۔

”بڑی مشکل ہے سر جی..... ہمارا دل بھی ہے ہم بھی انسان ہیں ہم سے شریف

لوگ نفرت کرتے ہیں تو ہم برداشت کر لیتے ہیں لیکن ہم میں سے جب یہ لوگ اٹھ

کر جاتی ہیں اور پھر ہم کو ذلیل سمجھتی ہیں تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا سفیدی کروا کر

کورے سے کبوتر بن جائیں اور پھر کوؤں سے ہی نفرت کریں سبحان اللہ..... ہم

تو پھر اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ انہیں یاد دلائیں کہ وہ بھی کبھی کوئے تھے۔“

”اس بے چاری نے تمہیں کیا کہا تھے؟۔“

اہتل نے سگریٹ ساگ کر کہا..... ”بیچاری نہیں ہے موقع شناس ہے یہ بھہ اس کی

ماں بھی..... پچھلیوں کو بھولتے دیر نہیں لگی انہیں..... اس کی ماں نے کسی ڈاکٹر سے

نکاح پڑھوایا ہے اپنی کشتی تو بچالی ہے لیکن گھر والے تو اجڑ گئے ان کے بوڑھے نانی اور اس کے مامے تو خوار ہو گئے سارے..... ساری عمر جنبھائیوں نے اس کی ماں کی کمائی پر راج کیا نشہ پانی کیا اب وہ مزدوری ڈھونڈنے نکلے ہیں..... لعنت ہے ایسی نیکی پر..... ہم سے یہ نہیں ہو سکا۔ اس لیے تو اپنی جنت تلاش کی پچھلوں کے دوزخ میں اس کے ساتھ بیٹھے ہیں۔“

”اگر تمہارے دل میں اتنا بغض ہے تو اس کی تعریف کیوں کر رہی تھیں؟“
 ”پتہ نہیں جی کیوں؟..... شاید مجھے منہ پر خوشامد کرنے کی عادت ہے یا شاید میں لوگوں سے ڈر جاتی ہوں؟“

بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اہتل کے متعلق پیش گوئی ناممکن..... تھی کیونکہ وہ بچوں کی طرح کسی Sustained emotion کے قابل نہ تھی اس کا لڑنا جھڑنا پیار محبت نفرت سب موڈ کے تابع تھے کسی تھوڑی مسلک۔ دباؤ کے تحت وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ سب کچھ بغیر سوچے سمجھے کرتی تھی جی چاہا مدد کر دی دل میں آیا گالی دے دی۔ کسی کو کھانا کھلا دیا۔ نیا پرس عطا کر دیا کڑھا ہوا دوپٹہ اس کے کندھوں پر ڈال کر اس کا بوسیدہ دوپٹہ اپنے پر لے لیا۔ کسی سے بیس روپے ادھار مانگ کر شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ مدد کرنے تحفہ دینے کسی کو الوبنا نے تعیف کرنے کے لیے اس کا کوئی فلسفہ نہ تھا وہ لہر تھی گالی آئی گالی دے دی مدد کو جی چاہا مدد کر دی غیبت پر طبعیت مائل ہوئی تو سارے بخیے ادھیڑ دئے خوش اور ہمدرد غالب آ جاتی تو پاؤں پڑ جاتی معافی مانگ لیتی۔ وہ دقت ضابطے اور طریقے کی پابند نہیں تھی اس کا سارا نظام Impulse پر چلتا تھا اسی لیے اس کی رائے پر چلنا مشکل تھا کیونکہ اس کی دوستی دشمنی نظریے سب منٹ کی سوئی کے تابع تھے۔ کچھ بھی گھنٹوں دنوں سالوں پر محیط نہ تھا۔

”سرجی میں آپ کے لیے کیلچی پکا کر لائی ہوں۔“

”بھائی میں السرکامریض ہو مدت ہوئی ایسی خوراک چھوڑ دی میں نے۔“

اسے مجھ میں السر میں چھوڑی ہوئی خوراک میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
 ”فکر نہ کیا کریں پہلے السر ہوتے ہیں پھر پاگل ہو جاتا ہے آدمی..... چلیں قاضی
 کے پاس میرے سفارش کر دیں۔“

جس وقت میں اٹھ کھڑا ہو گیا وہ کسی واقف کار کا نمبر فون پر ملا بیٹھی..... اتل کو
 فون کرنے کا بہت چسکا تھا وہ ہمیشہ میز کی نکل پر چڑھ کر بیٹھ جاتی اور اپنی واقف کاروں
 کو انرا کلی کے دوکان داروں کو ریلوے سٹیشن انکوائری پر پی آئی اے کارگو والوں کو
 فون کھڑکاتی رہتی فون پر اسے لوگوں کو مرعوب کر کے بڑا مزہ آتا تھا۔

”ہیلو..... ہیلو..... ہے لو..... کون جی..... میں اتل بول رہی ہو۔ ریڈیو سٹیشن
 سے..... جی آرڈی صاحب کے دفتر سے.....“ اس نے مجھے آنکھ ماری۔ ”کہاں
 باجی اب تو وقت ہی نہیں اب تو..... میں ضرور آتی..... لیکن ٹیلی ویژن والے
 چھوڑتے ہی نہیں..... میرا پروگرام ہے پرسوں شام سوا سات بجے ضرور دیکھیں۔
 اچھا جی گڈ بائی۔“

”جب تمہیں ٹیلی ویژن کے پروگرام مل رہے ہیں تو ریڈیو سٹیشن والوں کے
 منتوں سے حاصل؟“

میں واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کس کا فز کو ٹیلی ویژن سے پروگرام ملتا ہے۔“

”یہ تم اپنی ملنے والی کو کیا بتا رہی تھیں ابھی؟“

”اس چندری کا ٹیلی ویژن خراب ہے اسی لیے تو میں نے ذرا عزت بنالی اپنی
 کیوں آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“

”یہ سارا وقت تمہیں اپنی عزت بنانے کی فکر کیوں لگی رہتی ہے؟“

”تو ہم لوگ اور کیا بنائیں سر جی..... جن کے پاس عزت نہیں ہوتی وہ ساری عمر
 اسے ہی بنانے میں گنوا دیتے ہیں سچ پوچھیں سر جی تو ستارہ کی ماں سے بڑی عقلمندی

کی چلو دس بارہ سال مجھ جیسے کمینے اس کا پیچھا کریں گے پھر بیٹی تو سکھ کی زندگی گزارے گی..... نانی تو ویسے بھی مرکھپ جائے گی دو چار سالوں میں..... اچھا ہی کیا بازار چھوڑ دیا۔“

اتل کی آواز میں دکھ تھا جس درخت پر سارا دن دھوپ پڑتی ہے اس کے چکنے پتے چمکتے ہیں بچے اس میں جھولا ڈالیں عورتیں اس کے سائے تلے بیٹھیں شام پڑتے ہی ایسے درخت کے گرد اس کے اندھیروں میں بڑی اداسی ہو جاتی ہے ایسے ہی اتل تھی ہر وقت ہنسی مذاق۔ چکا چوندا دھرا دھر کی بے تکی باتیں جب وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتی تو اس کے ارد گرد بڑی مایوسی پھیل جاتی۔

”کیسی تھی ستارہ کی ماں..... شکلاً عقلاً؟.....“ میں نے موضوع کو ہلکا کرنے کی خاطر کہا۔

”اچھی تھی..... اتنی خوبصورت بھی نہیں جتنی مرد مار تھی..... پیسہ زیادہ نہیں کمایا ہاں آدمی بہت ضائع کیا ٹوانوں کا ایک نو جوان زہر کھا گیا اس کے پیچھے..... چھنٹ کا جوان تھا۔ اگلے دانتوں میں ایک پرسونے کا پترا چڑھا تھا جہلمی طرز کے پٹے تھے مسکرا پڑتا تو دل جلتی رنگ کی طرح بجھنے لگتا۔ اس کے جنازے پر گئی تھی میں..... سر جی یہ کیا بات ہے کبھی کبھی مرد اپنی جان دے دیتے ہیں عزت کی دال روٹی نہیں دیتے۔؟“

”مردوں کے دینے کا بھی عجیب حساب ہے..... عجیب بادشاہ لوگ ہوتے ہیں مرد بھی۔“

”عزت کی دال روٹی میں بڑی بک بک ہوتی ہے اتل..... ساری عمر کا لیکھا جان کا حساب تو ایک بار نپٹایا جاسکتا ہے..... ایک جھٹکا اور دوسرے پار.....“

”ہاں جی.....“ اس نے لمبا سانس لے کر کہا۔

اس روز اتل بار بار بجھ رہی تھی جیسے کھلے میدان میں آگ جلنے کی کوشش پر بوندا

باندی ہو رہی ہو۔

”ابھی تم کہہ رہی تھیں اسٹل کی ستارہ کی ماں کو تم نے کنٹ پیلس میں دیکھا تھا۔

یہ کس سن کی بات ہے بھلا؟“

میں نے اس کا موڈ بدلنے کی غرض سے کہا۔

”سن چھیالیس کی جی..... مجھے اچھی طرح یاد ہے آگ لگنے کی وارداتیں عام

تھیں ان دنوں۔“

”اس وقت تمہاری عمر چودہ برس کی تو ہوگی.....“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کھلی جی..... کھلی چودہ کی.....“

”اس حساب سے تم بیالیس کی ہوئیں..... دیکھ لو پارٹیشن کو کتنے سال ہو چکے

ہیں“

میرا خیال تھا کہ وہ جھگڑا کرے گی اور اس کا موڈ ہلکا ہو جائے گا۔ لیکن وہ خفیف ہو کر مسکرا نے لگی اور بولی..... ”ایسے گھپلے تو ریڈیو سٹیشن پر عام ہوتے ہیں آرمی تھیٹر

کے واقعات سناتا ہے خاموش فلموں کے شاٹ بیان کرتا ہے اور عمر اپنی تیس سال

بتاتا ہے باتیں آل انڈیا ریڈیو کے زمانے کی کرتا ہے اور عمر پوچھو تو چالیس سے آگے

نہیں جاتی سچی بات بتاؤں سر جی..... عمر تو سب کے منہ پر لکھی ہوتی ہے بالوں میں

رنگی ہوتی ہے منوانے والے زیادتی کرتے ہیں مجھ سے تو جب کوئی عمر پوچھتا ہے

مجھے لگتا ہے جیسے میں تھانے میں آئی بیٹھی ہوں..... بھلا میری عمر اگر بیالیس کی ہے تو

اس میں میرا کیا قصور.....؟ ہوگئی سو ہوگئی۔“

بوندا باندی میں آگ پھر بجھ گئی۔

”فون کرنا ہو تو کر لو پھر قاضی کے پاس چلیں۔“

فون کا نام سن کر اس نے پی آئی اے کا رگوسروس کا فون نمبر ملایا اور بولی..... ”ہیلو

..... جی پی آئی اے کا رگو.....؟ میرا ایک پاسل آنا تھا کراچی سے.....؟ باجی؟

..... بڑا ضروری ہے جی..... تبھی تو پوچھ رہی ہوں..... جی میرا فون نمبر نوٹ کر لیں
اور فوراً اطلاع دیں۔“

اس نے میرا فون نمبر دوسری طرف دے دیا۔

”یہ کیا کر رہی ہو اتل؟..... یہ سرکاری فون ہے۔“

”جب کارگو والے پوچھیں تو رانگ نمبر کہہ دیں آپ اتنی سی تو بات ہے۔“

”چلو اب۔“

”سرجی آج آپ میرے ساتھ چلیں۔“

”چلو تیار ہوں میں۔“

”قاضی کے پاس نہیں میرے کرائے کے گھر۔ انہوں نے مجھے چھ مہینے کا کرایہ

نہیں دیا۔ کوئی مرد وہاں جاتا نہیں۔ وہ عورت سے کیوں ڈرنے لگے۔“

”تمہارے پانچ بھائی ہیں وہ نہیں جاتے کرایہ لینے۔“

”ناں جی۔ وہ کیوں نجل خوار ہونے لگے۔ وہ فیروزہ کی کمائی پر عیش کر رہے ہیں

ان کو کیا پروا؟“

میں اس کے ساتھ دوبارہ جانا نہیں چاہتا تھا۔

”آپ کو کچھ کرنا کرانا نہیں ہے سرجی۔ صرف میرے ساتھ چل پڑیں رعب پڑ

جائے گا کرایہ داروں پر۔ خدا قسم میرے پاس تو رکشا کو دینے کے لیے بھی پیسے نہیں

پوتے اور بی بی تو ایک پائی بھی نہیں دیتی ہم جیسے بیکاروں کو۔“

پتہ نہیں اس میں کیا تھا؟ اس جلتی بجھتی آگ کے ساتھ میں نوگزے کی قبر کے

پچھواڑے اس کے کرایہ داروں کے پاس چلا گیا۔

اتل کو اپنا سمجھنے کی صرف یہ وجہ تھی کہ شہر میں وہ اور میں بالکل تنہا تھے میں ذہنی اور

جسمانی طور پر بیمار تھا وہ میری ماں کی عمر کی تھی پھر اس کا اور میرا مسلک گدھ جاتی کا

تھا ہم دونوں مردار آرزوؤں پر پلے تھے ہم دونوں بجھے ہوئے کارتوس تھے اور اتفاقاً ایسے اکٹھے ہوئے تھے جیسے کورپس کرسٹی جیسی دور دراز جگہ میں اپنا ہم وطن ہم مشرب ہم زبان مل جائے ہمیں الپس میں بات کرنے کے لیے زیادہ اوڑھنے بچھونے، لکانے چھپانے، رکھ رکھاؤ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے اٹھارہ بیس سال سال بڑی تھی لیکن وقت بیوقت اس کے اندر ایک کھلنڈری سے بچی بھی جاگ اٹھتی وہ جو کچھ بھی کرتی تھی کہتی تھی میں اس کا کبھی برا نہ مناتا اور نہ ہی اپنی باتوں کی اسے کچھ سمجھ تھی اسے معلوم نہ تھا کہ روٹھا کیسے جاتا ہے اور کتنی دیر روٹھے رہنے میں عزت بنتی ہے اس کی باتوں میں لغت سچائی اور کمینہ پن تھا کبھی کبھی جیسے کھلی کھڑکی سے بارش کا ریلا اندر آجائے وہ بڑی بے بس قسم کی گفتگو بھی کرنے لگتی۔ سچ وہ صرف اس لیے بولتی تھی کہ اب جھوٹ اور سچ اس کے نزدیک بالکل برابر ہو چکے تھے وہ اپنے جسم سے بے پروا عزت و شہرت سے بے نیاز روپے پیسے سے غنی تھی۔

اتل کا ایک چھوٹا سا گھر نوگزے کی قبر کے کچھواڑے بھی تھا یہ گھر بوسیدہ اور پرانا تھا اور پولی منزل میں کرائے دار رہتے تھے نچلی منزل کے دو کمروں میں غفور درزی اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھا ہم دونوں جب یہاں پہنچے تو غفور درزی تیزی سے مشین چلا رہا تھا۔ اتل کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ غفور درزی کے چہرے پر اب صرف آنکھیں باقی تھیں باقی سارا چہرہ دقت، صبر اور غریبی کی نذر ہو چکا تھا۔

”آئیں..... آئیں السلام علیکم صاحب جی“

”کیا آئیں ماسٹر جی..... پھر آپ نے کرائے لے کر نہیں دیا۔“

ماسٹر غفوریوں خفیف ہو گیا جیسے وہ قصور وار ہو..... ”بی بی جی..... ان کے مرگ ہو گئی ہے میں پوچھا تھا دو بار۔“

”اور جب میری مرگ ہو گئی تب..... تب کفن دفن کیسے ہوگا..... کون خرچے کرے گا..... کمیٹی والے ایل ایم سی کے ٹرک میں ڈال کر لے جائیں گے۔“

ماسٹر غفور کا نچڑا ہوا چہرہ اور بھی نچڑ گیا..... ”خدا نہ کرے.....“

”خدا نہ کرے..... کیا نہ کرے خدا؟..... آپ کو کیا پتہ میرا گزارہ کیسے پوتا ہے..... میں بھوکے مر جاؤں آپ کو تو کرایہ داروں سے ہمدردی ہے۔“

ماسٹر غفور نے مشین کی ڈبیا میں سے دوسو روپے نکالے اور اہتل کو بلجبت سے پیش کرتے ہوئے بولا..... ”آپ یہ لے جائیں میں خود ان سے وصول کر لوں گا۔“

اہتل نے پیسے لیے اور شکریہ کر کے دوکان سے نکل آئی..... ”ماسٹر جی ان کو کہہ دیں اگر اگلے مہینے کرایہ نہ دیا تو میں انہیں نکالنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔“

”اچھا جی کہہ دوں گا۔“

”زور سے کہنا ماسٹر جی رعب سے من من من من نہ کرنا.....“ روپے لے کر ہم واپس اہتل کے دو منزلہ مکان میں چلے گئے۔

اہتل کا سارا روز گاریہ کرائے والا مکان تھا کھانا اور رہائش مفت تھی اور اوپر کے خرچے کے لیے یہی دوسو روپے ماہوار اس کا کفیل تھا اس وقت مجھے اہتل کی بجائے درزی غفور پر ترس آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی بے چارگی اور شرم تھی جو آج تک میں نے کسی چہرے پر نہیں دیکھی۔

اس روز پھر بی بی نے پارٹی کے لیے پر تکلف چائے بھیجی۔ نئی چادریں اور غلاف آئے اہتل نے بڑے وقار کے ساتھ پچاس روپے نوجوان بھائی کو پکڑا کر کہا..... ”بی بی کو دے دینا..... کہنا ریڈیو والے صاحب نے پان سگریٹ کے لیے بھیجے ہیں۔“

نوجوان کے جانے کے بعد میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھ کر کہا..... ”یہ کیا؟“

”آپ کی عزت بن جائے گی بی بی کی نظر میں آپ کا کیا جاتا ہے۔“

رہ رہ کر مجھے غفور درزی یاد آرہا تھا اس کی مسکینی، حیا، کم آمیزی نے میرے دل پر عجیب اثر کیا تھا۔

”تم نے غفور درزی سے دوسرو پے کیوں لیے؟..... اب بے چارہ کیا کرے گا۔“

”اے خوشی ہوئی ہوگی“

”خوشی؟“

”یہ میری بڑی بہن کا عاشق تھا سرجی..... پلو مری دوکان نہیں اس کے پیچھے ایک تین منزلہ بلڈنگ ہوتی تھی..... اس کی جائیداد تھی..... وہ ساری بلڈنگ سارا کچھ بک بکا گیا..... دھیلا دھیلا ہمارے گھر کی نظر ہوا۔ یہ جو ہمارا گھر ہے اسی نے بنوا کر دیا تھا..... جب کچھ نہ رہا رو درزی بن گیا..... میرے سارے کپڑے مفت سیتا ہے ایسے ایسے نمونے بناتا ہے ابھی کل ہی فیروزہ کا غرارہ سی کر لایا تھا سارے پھڑک گئے۔“

”تمہاری باجی کو بھی محبت تھی درزی غفور سے۔“

”وہ بڑی مشغول رہتی تھی سرجی..... اسے اللہ نے جوانی میں اتھا لیا سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملا..... اگر برف کی بنی ہوتی تو پگھل جاتی ساری کی ساری..... درزی غفور اسے ایسے دیکھتا تھا!

بڑی دیر تک وہ مجھے اپنی بہن کی طوفان آمیز زندگی کی باتیں بتاتی رہی درزی غفور کی داستان اس آندھی میں اڑنے والا ایک تنکا تھی۔ جب رات کے کھانے کا ٹرے سج کر آیا تو امتل نے سارے ڈونگھے کھول کھول کر دیکھے سالن چکھے پھر نوجوان پر گرجی۔“

”گوشت کون لایا تھا آج۔“

”چاچا ابراہیم گیا تھا۔“

”اب چاچے کو کوئی قصائی سودا نہیں دیتا خود جایا کرو گوشت لینے آخر سارے

خاندان نے کھانا ہوتا ہے۔“

آج اتل کی جیب میں پیسے تھے وہ شیرنی تھی۔ ویسے بھی میں نے اسے کھانے کے معاملے میں از حد محتاط پانا برا کھانا دیکھ کر فحش گالیاں بکنے لگتی تھائی، پکانے والا مرچ مسالا سب کی شامت آجاتی۔ دال سبزی سے اسے نفرت تھی اسے گوشت مرغی مچھلی کا شوق تھا کھاپی لیتی تو پھر ڈھیر ہو جاتی سونے کا بھی اس کا عجیب ڈھنگ تھا صوفے پر نیند آتی تو وہاں ڈھیر ہو گئی۔ کرسی پر اونگھ آتی تو ملکہ وکٹوریہ کا بت کرسی پر خراٹے لینے لگا۔ پلنگ پر سوئی تو ایسے جیسے دلدل میں بھینس دم چھوڑے پڑی ہو۔

”سوئیں گے سرجی؟“

”نہیں اب میں چلوں گا۔“

”اچھا جی.....“ کھانے کے بعد وہ بیٹھی نہ رہ سکتی تھی..... آرام سے پلنگ پر روانہ ہو گئی

”آپ کے کون سے بیوی بچے روتے ہیں سو جائیں یہیں۔“

”نہیں چلتا ہوں اتل۔“

”کیا سوچ رہے ہیں آپ“

میں غفور درزی کی گلی میں پھر رہا تھا۔

”ایک لڑکی یاد آرہی ہے..... کالج میں پڑھتی تھی میرے ساتھ“

”پرانے وقتوں کو یاد نہیں کرتے سرجی..... نئے دنوں میں گھن لگ جاتا ہے۔“

میں چپ ہو گیا، وہ ہنسنے لگی اس کی ہنسی میں کوئی چیز تھی جو بکھرنے کی طرف مائل تھی۔

”سرجی ہر انسان کے انجن چلانے کے لیے خاص کا پٹرول چاہیے جب تک یہ

پیٹرول گاڑی میں ہوگا گاڑی چلتی ہے انسان کا سلف چاہے چلے نہ چلے دھکے دے

کر گاڑی چل پڑتی ہے کنڈم نہیں ہوتی۔“

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ تکیے پر سر ٹکائے اس پر اپنا سر جمائے نیم درازی تھی..... ”عورت کا ایندھن
 مانتا ہے صبر ہے انسو ہے جب تک شہدی رو سکتی ہے جیتی رہتی ہے۔“
 ”اور مرد؟“

”مرد کے اندر کام کا پیٹرول چلتا ہے کا منا ہوا کام رہے تو اس کا سلف چاہے
 بیکار ہو جائے چلتا رہے گا..... عجیب بات ہے اب کبھی میں روتی نہیں..... آنسو ہی
 نہیں آتے..... کبھی کبھی خیال آتا ہے یہ میرے آخری دن نہ ہوں۔“
 اس کی خشک آنکھوں میں خشک آنسو تھے۔

”“درزی غفور جیسا کوئی ہنر آتا تو رزق حلال ہی کھاتی اب تو سارا جسم بوجھ بنا
 رہتا ہے دل پر..... کہاں سے اتنا ایندھن لاؤں اس کا دوزخ بھرنے کو..... کبھی ماں
 کو بیوقوف بناتی ہوں کبھی فیروزہ کو لیکن کب تک۔ یہ حرام رزق کب تک؟
 ”میرے پاس اس وقت ڈیڈھ سو روپیہ ہے اتل.....“ میں نے لجاجت سے
 اس کے تکیے پر پیسے رکھ کر کہا۔

”ناں سرجی..... ابھی نہیں ابھی ہیں میرے پاس یہ دیکھئے۔“
 ”رکھ لو اتل کام آئیں گے۔“
 وہ ہنس دی..... ”ابھی تھوڑی دیر کے لیے میں نیک بننے لگی تھی شکریہ سرجی
 میرے لہو میں تو ایک بوند بھی حلال کی نہیں..... مجھے ڈر کیسا۔“
 پیسے لے کر اس نے اپنی باڈس میں ڈال لیے اور میرے طرف کمر کر لی جس
 وقت میں اس کے کمرے سے نکلا مجھے شبہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔

اتل سے میرا رابطہ کچھ کچھ عجیب نوعیت کا تھا آہستہ آہستہ اکے پرو تلے گھستا چلا
 جا رہا تھا وہ ایسی ماں تھی جو ساپنی کی طرح جھولی میں لا تعداد بچے کھا چکی ہو تجربات کا
 دکھ سکھ دل پر اسی وقت آری کٹاری بنتا ہے جب یہ کبھی کبھی وارد ہوں۔ وہ اتنے

سارے دکھ سکھ سے گزر چکی تھی کہ اب ڈاکٹروں کی طرح مریضوں کے وارڈوں میں پھرتے ہوئے اسے اختلاج قلب نہ ہوتا تھا۔ احتل کے ساتھ رہنے میں ایک خاص آرام یہ تھا وہ کچھ نہ مانگتی تھی نہ جسمانی تعلق نہ روحانی محبت نہ روپیہ پیسہ نہ شہرت نہ تعیف..... جس طرح بچا نوے فی صد شادی شدہ مرد اپنی محبوبہ سے دل کا تیلینون ملا کر بیوی سے مباشرت کرتے ہیں

ایسے ہی احتل بالکل لا تعلقہ کے ساتھ میرے ساتھ وقت گزارتی تھی اسے غالباً میرا بالکل شوق نہ تھا کیونکہ وہ مجھ سے بھی پرانا گدھ تھی ہم دونوں زیادہ وقت ساتھ ساتھ تو ضرور گزارتے تھے لیکن جس طرح جوتے کے پیر الگ الگ ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں ایک نوعیت سے یہ رشتہ پہلے رشتوں سے بھی زیادہ بانجھ تھا اسی لیے فریقین کو جذباتی ذہنی کوئی نکھار بھی حاصل نہ ہوا۔ احتل وہ لاش تھی جو مدتوں بیماریاں جھیلنے کے بعد مری تھی اس کا گوشت انسانی نہیں تھا ایک طر کا سنتھلیک فایبر تھا جس کے ہر مردہ جرثومہ میں بے جان غیر نامی دوائیوں کا سنٹور ہاؤس تھا۔

احتل سے جب میری ملاقات ہوئی میں ذہنی جسمانی جذباتی طور پر بہت الجھا ہوا تھا میرا دل بلال گنج کی ایسی دوکانوں سے مشابہہ تھا جہاں ہر طرف پرانا لوہا بکھرا ہوتا ہے۔ کاروں کی پرانی باڈیاں لوہے کی الماریاں، پہننے۔ سریے۔ نٹ بولٹ، گرا ریاں، پانے سپلوک..... ہر طرف چیزوں کا انبار لیکن تالے نہیں تھے نہ اپنے نہ پرانے بارش جھکڑ آدھی میں یہ سامان باہر صرف اس امید پر پڑا رہتا کہ کبھی شہر والوں کو کسی پرانے پرزے کی ضرورت ہوگی تو وہ اسے یہاں سے خرید کر اپنی نئی کار موٹر سائیکل یا پرینٹنگ مشین میں لگا لیں گے۔

احتل سے ملنے کے بعد میں پہلے سے کم تھوکنے لگا تھا۔ اسلت کی تکلیف گو کبھی کبھی بہت بڑھ جاتی اور جلن کا یہ عالم ہوتا کہ ہتھیلیاں بھیگ جاتی لیکن ذہنی طور پر میں سوسائٹی سے ابھی کٹا نہ تھا اور اپنی نوکری پر جانے کے قابل تھا Withdrawal کے

لحے عموماً راتوں کو آتے جب میں چلتا چلتا عابدہ اور سیمی سے گزرتا گزرتا چند راتیں جا کروہاں کی گلیوں میں گھومنے لگتا اچھی یادیں یا تو کبھی مجھ سے وابستہ نہ ہو کسی تھیں یا ان کا تاثر گہرا نہ تھا اس لیے یادوں کی ٹوٹنی جب بھی کھلتی اس میں سے کھولتا پانی نکلتا محرومیوں کی داستان حلقہ پوری کوشش رہتی کہ میں اپنا وقت یا تو کارآمد کاموں میں گزاروں یا پھر اہتل کی صحبت میں، جس کے ساتھ وقت نہ بیکار تھا نہ کارآمد صرف گزرتا چلا جاتا تھا۔

مرد اور عورت کے رابطے کئی بار خود ان کی سمجھ میں نہیں آتے اور سارا شہر ان کی نوعیت سے واقف ہو جاتا ہے..... ڈاکٹر سہیل کے بعد شہر میں میرا کوئی دوست نہیں تھا ریڈیو سٹیشن پر جن پروڈیوسروں سے صاحب سلامت تھی وہ گہری نہ تھی دفتر میں گپ شپ رہتی لیکن شام کو علیحدہ ہو کر ایک قسم کا سکوم ملتا۔ پہ نہیں اہتل کے ساتھ میرے رشتے کی کس نے ہوئی چلائی تھی کیونکہ ہم دونوں ریڈیو میں بہت کم ملتے تھے اور میرے گھر وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ اس روز میں سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ آنگن میں مجھے صولت بھا بھی ملیں یہ ان غمگین صورت عورتوں میں سے تھیں جنہوں نے شادی کی کاٹھی کو بہت سختی سے اپنی پیٹھ پر فٹ کر لیا ہوتا ہے صولت بھا بھی اب ہر رت اور حالات کے مطابق بھاگی چلی جا رہی تھیں ان کی چال بدل جاتی کبھی دکی کبھی پویہ کبھی سرپٹ..... لیکن پیٹھ سے کاٹھی اتار کر سستانے کا کوئی لمحہ نہ آتا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے ایسے بات کرتیں جیسے نامحرموں سے کی جاتی ہے نگاہیں جھکا کر..... آواز میں سختی پیدا کر کے..... بار بار کھانس کر۔

”قیوم.....“ انہوں نے ستون کر مخاطب کر کے کہا۔

”جی؟“

”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

”کیسے؟“

”یہاں نہیں اندر چلو..... یہاں بچے ہیں“

بڑی دیر کے بعد مجھے یا جوج ماجوج نظر آئے وہ ایک ہی رنگ کی بس سرٹیں اور ایک جیسی لکیر دار نیکریں پہنے انجن بنے آنگن میں چکر لگا رہے تھے پہلی بار مجھے افسوس ہوا کہ اتنی دیر میں ان سے واقفیت پیدا کرنے کی بھی میں نے کبھی کوشش نہیں کی

ہم دونوں اندر چلے گئے۔

میں موؤدب بھائی مختار کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

”جی۔“

بھابھی کھڑی رہیں، وہ بات کرتے ہی بھاگ جانا چاہتی تھیں۔

”شکر ہے کہ تم باقاعدگی سے نوکری کر رہے ہو..... رزق حلال مانا مرد کا فرض

ہے۔“

میں چپ رہا۔

”تمہارے بھائی تمہاری صحت کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔“

”میں نے بھابھی کو بھرپور نظروں سے دیکھنا چاہا لیکن وہ چھت کو دیکھ رہی تھیں“

”آخر وہ تمہارے بھائی ہیں..... وہ سارا دن تمہارے متعلق سوچتے ہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں بالکل.....“ پتہ نہیں کیوں اس وقت میرا رونے کو جی چاہا۔

”کہاں ٹھیک ہو۔ کبھی شیو کرتے وقت اپنا چہرہ دیکھ لیا کرو ڈراتا ہے ہاتھ دیکھو

کیسی نیس ابھری ہوئی ہیں اور تو اس عمر میں سفید بال آگئے ہیں تمہارے۔“ میں

نے حیرانی سے بھابھی کی طرف دیکھا۔ وہ میرے متعلق اتنا سب کچھ کیسے جانتی تھیں

وہ اب کرسی کی بید پر نظریں جمائیں ہوئے تھیں۔

”تم کو کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہیے جلد از جلد“

”ملا تھا جی..... دوائیاں پیتا ہوں باقاعدگی سے“

صولت بھابھی کا رنگ آہستہ آہستہ گلابی ہونے لگا
”تمہارے بھائی تم سے بات نہیں کر سکتے اس سلسلے میں..... لیکن یہی کافی نہیں
صرف ڈاکٹر ہی۔“

”جی.....؟ ارشاد؟.....“

”سنا ہے وہاں ریڈیو پر کوئی چکر چل رہا ہے رمہارا..... کسی بوڑھی عورت کے
ساتھ!“

میں سناتے میں آگیا

”ایسے چکروں سے بچنا چاہیے۔ آدمی ایک بار پھنس جائے تو پھر نکل نہیں سکتا
ویسے ادھو والیوں کو پھنسانے کے خوب طریقے آتے ہیں۔“

میری آنکھوں میں اتل کی شکل گھوم گئی معصومیت حق اور قلب کی صفائی کا ایک
کونڈالپک گیا۔ اس احق نے تو آج تک مجھ سے سنگریٹ پان کے پیسے نہ لیے تھے
اسے کسی کو پھانسنے اور خود پھنس جانے سے قطعی کوئی دل چسپی نہ تھی۔

”کچھ خاندان کی عزت کا ہی خیال کیا ہوتا تم نے.....“ بہت آہستہ دبی ہوئی
آواز میں صولت بھابھی نے کہا۔

اب یقیناً یہ مشن ان کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔

چند راگاؤں میں جس روز چاچا غلام نے عزیز گائُن کی بے عزتی کی اور وہ گاؤں
چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اسی روز کے بعد میں نے پھر کبھی عزت کے متعلق نہ سوچا تھا۔

بھابھی صولت جیسے ابھی بھاگنے والی تھی اس نے آخر حملہ کیا..... ”نو کری کر لی
ہے..... تو اب شادی بھی کر لو..... جگہ جگہ حرام کھانے سے حاصل؟..... شادی حلال
چیزیں میں سب سے افضل ہے۔“

میں نے اس دیندار عورت کی طرف نگاہ ڈالی۔

”عابدہ کی بہن کا رشتہ آیا ہوا ہے کہو تو طے کر دوں“

یہ کہہ کر بھا بھی رسہ تڑوا کر باہر بھاگ گئی۔

میں نے بھا بھی کو پکڑ کر کہنا چاہا..... بھا بھی کچھ لوگ معاشرے کے قابل نہیں ہوتے۔ معاشرے کے مطابق نہیں رہتے جیسے کچھ جانور جنگل میں رہ کر جنگل لاء کے تحت زندگی بسر نہیں کرتے ایسے لوگوں کو محبت کی تلاش ہوتی ہے۔ لیکن وہ محبت کے اہل نہیں ہوتے شادی کی نہ انہیں خواہش ہوتی ہے نہ ضرورت..... بھا بھی تم ہمیں کر گس جاتی کے لوگوں کو حلال کھانے پر کیوں مجبور کر رہی ہو..... ہم تم جنم جنم سے مردار پر پلے ہیں ہمیں حلال سے کیا غرض؟

جب میں آنگن میں پہنچا تو مسعود اور فرید ایک ہی رنگ کے شلوار قمیضیں پہلے گیلے بالوں میں کنگھیاں پھیر رہے تھے۔

پتہ نہیں کیوں اس روز بڑے دنوں بعد مجھے خیال آیا کہ چند را چلا جاؤں اور اپنی آبائی کمر شدہ زمین آباد کرنے کی کوشش کروں؟ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے علم تھا کہ وہاں پہنچ کر بھی کوئی بندھی نکی محنت نہیں کر سکوں گا..... میرا دل کسی ایک دریا میں رہنے کے قابل نہ تھا۔

جس وقت میں دفتر پہنچا قاضی اور اتھل دونوں میرے کمرے میں بیٹھے تھے، اور سگرٹوں کے دھوئیں سے فضا نیلی نیلی ہر رہی تھی اتھل حسب عادت بغیر غسل کیے صرف چہرے کا میک اپ درست کر کے آئی تھی اس نے کنگھی بھی صرف گردن تک پھیر رکھی تھی باقی سارے الجھاؤ وائٹ تھے برقعے کا نقاب کرسی سے لٹک رہا تھا اور کوٹ اس کے جسم پر ایسے پھنسا ہوا تھا کہ تمام بٹن کھلنے ہی والے تھے۔

”بیجے سرجی میں ان قاضی صاحب کو پکڑ لائی ہو اب آپ میری سفارش کر دیں

ان سے“

”بھائی اسے کوئی پروگرام وغیرہ دے دیا کرو ورنہ یہ مجھے قتل کر دے گی۔“

”ہائے یہ سفارش ہے“ اتھل نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اور کیسی ہوتی ہے سفارش؟“

”رعب سے کہتے ہیں کہ یہ میری رشتہ دار ہے دس سال سے ہمارے تعلقات ہیں ان کا کام نہ کیا تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا۔“

میں اس روز موڈ میں نہ تھا قاضی بونگا بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

”جو کچھ یہ کہہ رہی ہے اس کے مطابق کر دو..... یار.....“

”اب تم نئے پروڈیوسر سے ان کی سفارش کرنا میری تو تبدیلی ہو گئی ہے..... حیدر

آباد کی“

”کب؟“

”آج ہی آرڈر آئے ہیں“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اپنے آپ سے پیچھا چھڑا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا..... ”تم تبدیلی سے خوش نہیں ہو۔“

”لاہور چھوٹا ہے لاہور کے ساتھ اور بہت کچھ چھوٹا ہے.....“ قاضی کی آواز

بھرا گئی

”کوئی سفارش لگوائی ہوتی“

”حیدر آباد نے جو لگوائی ہے“

”آپ کا کوئی قصور نہیں سرجی..... میری قسمت ہی ماٹھی ہے جس پروڈیوسر سے

واقفیت ہو جاتی ہے اس کی تبدیلی ہو جاتی ہے..... اللہ کو منظور ہی نہیں کہ اتل کوئی

پروگرام کرے اب اس ڈاڈے کے ساتھ کون لڑے۔“

قاضی سلا دعا کیے بغیر عاشق صورت رخصت ہو گیا۔

”اچھے آدمی تھے قاضی صاحب..... ہے نا سرجی.....؟“

میں کافی دیر چپ رہا۔

”شادی کیسی چیز ہے اتل..... کبھی تمہیں اس سے پالا پڑا؟“

”ہاں جی کی تھی شادی میں نے بھی..... اس کا پھاہا بھی ڈالا تھا گلے میں“
”بچے؟“

”ایک لڑکا ہوا تھا سرجی..... لیکن..... اس کا بھی دماغ ٹھیک نہیں..... ہم جیسوں
کے ایسے ہی بچے ہوتے ہیں سرجی۔“
”کیا؟“

”ساری عمر حرام کھانا..... ہم لوگ حلال کی اولاد کہاں سے پیدا کر لیں گی جی؟
میرے بیٹے کا بھی دماغ ٹھیک نہیں..... تین بار مینٹل ہسپتال رہ آیا ہے۔ اس کے
باپ کا خیال ٹھیک ہے سائی مجھ میری ہے نہ میں حرام رزق پر پلٹی نہ میرا بیٹا ایسا ہوتا۔“

وہ بہت دکھی ہو گئی۔

”یہ پرانی باتیں ہیں۔“

”ہاں جی میں تو پرانی پر ٹھیک ہیں“

ہم دونوں چپ ہو گئے

”کہاں رہتا ہے تمہارا بیٹا“

”اسی کے پاس ہے جی اب تو جواب ہو گیا ہے۔ بڑا گبرو ہے شکل سے تو نہیں لگتا

کہ دماغ ٹھیک نہیں۔“

”تمہیں ملتا ہے اتل“

”نہاں جی..... مجھے مل کر کیا کرے گا..... میں اسے کیا دے سکتی ہوں باپ نے تو

ساری بلڈنگ اس کے نام کرائی ہے۔“

”پھر ایسے اچھے شوہر کو چھوڑا کیوں؟“

بھابھی صولت نے میرے دماغ میں ایک نیا ایٹم بم چھوڑ دیا تھا۔

”چھوڑا کیوں اسے اتل“

”بس سرجی بھی نہیں“

”پر کیوں وجہ کیا تھی؟“ میں نے اصرار کیا

”میں مڈل کلاس کی طوائف تھی سرجی..... اس چندری کپتی کو محبت درکار ہوتی ہے۔ لیکن عزت زیادہ پیاری ہوتی ہے..... اگر اسے صرف محبت درکار ہونا تو وہ ہمارے ہاں بہت لیکن یہ حریص چاہتی ہے جو بیاہ کر لے جائے وہ محبت کرے دوہرا پنگا ادھر وہ بھی کم بخت مڈل کلاس کا آدمی تھا۔ بھلا بتائیے نباہ کیسے ہوتا..... عشق کے لیے نہ مڈل کلاس کا مرد نباہے نہ عورت..... ایک ڈرپوک دوسرا تھوڑا دلا..... بتائیے ان کا عشق کتنے دن چلتا؟۔“

”تھوڑا دلا مرد کیسا ہوتا ہے اتل“

”تھوڑے دے مرد کی ایک نشانی ہے صاحب جی۔ وہ عورت کو ضرورت کی ہر چیز لا دیتا ہے لیکن عیاشی کا کوئی سامان نہیں کرتا۔ زیور کپڑا سینما، پھول تعریف سب اس کے لیے بیک چیزیں ہوتی ہیں۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں۔“

”سرجی..... یہ جو تھوڑا دلا مرد ہوتا ہے ناں وہ روٹی کپڑا مکان دیتا ہے..... جنس دیتا ہے..... کیونکہ یہ ضرورت کی چیزیں ہیں لیکن وہ بیوی پر محبت ضائع نہیں کرتا تعریف برباد نہیں کرتا..... لاڈ پیار سے خراب نہیں کرتا..... مثلاً..... تھوڑا دلا مرد اگر سوٹ سلا دے گا تو اس پر کڑھائی کو اسراف سمجھے گا زیور اگر اپنی عزت کی خاطر بناو بھی دے تو زیور کبھی جڑاؤ نہیں ہوتا شاعری کی کتاب کبھی خرید کر گھر نہیں لائے گا..... نیک بیبیوں کو نیک مشورے قسم کی کتابیں لا کر دے گا گھر میں..... تھوڑے دے مرد سے اللہ بچائے..... بھڑوے کو یہ علم نہیں ہوتا کہ عورت کا اندت ہی ایسا بنا ہے کہ وہ روٹی کے بغیر تو زندہ رہ سکتی ہے عیاشی کے بغیر نہ زیبائش کے بغیر کملائے لگتی ہے۔“

”کبھی تم نے سوچا اتل کہ شادی کے بعد محبت نہتی کیوں نہیں؟..... وہی جو ایک

دوسرے پر مر مٹنے کو تیار ہوتے ہیں دشمن کیوں بن جاتے ہیں ایک دوسرے کے؟“
 اس نے ناک میں انگلی ڈالی اور کھجلا کر بولی..... ”بات یہ ہے سرجی کہ جب محبت
 مل رہی ہوتی ہے تو سمجھ نہیں آتی کہ کبھی محبت دینی بھی پڑے گی..... شادی ہوئی
 قربانی ساری کی ساری..... گاٹا اتروانا پڑتا ہے چاہے من کا چاہے تن کا۔“

”تمہیں اس سے اصلی گلہ کیا تھا اتل اب تک تو تم کسی نتیجے پر پہنچ چکی ہو گی۔“
 ”اس کا بھی قصور نہیں تھا کچھ ایسا..... بس سرجی اس کا دل چاہتا تھا کہ میں شریف
 عورتوں کی طرح بھانڈے مانجھ کر بچے پال کر بڑوں کی عزت کر کے چھوٹوں کی
 گستاخیاں سہہ کر اس کے گھر میں گزارہ کروں اور ثوابت کروں سب پر کہ بازار
 والیاں شرافت میں کسی سے کم نہیں ہوتیں۔ چونکہ میں شریف تھی اس لیے مجھے
 ڈراموں سے نفرت تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میاں اتنے لوہے کے چنے چبا کر
 جو تیرے گھر والوں کو قائل بھی کر لیا اپنی شرافت کا تو مجھے کیا حاصل ہوگا..... دراصل
 سرجی مجھے اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی عادت نہیں تھی میرا مزاج ہی نہیں تھا
 نوکرانی کا..... بڑی تو تو میں میں ہوا کرتی تھی۔“

”کس بات پر اتل؟“

”خاص بات کوئی نہیں ہوتی سرجی میاں بیوی میں تو تو میں میں کی..... بس باسی
 ہانڈی میں بڑ بڑ ہوتی رہتی ہے کچھ لوگ بڑی پھٹی مت کے ہوتے ہیں پہلے تلی پر
 مرتے پر مرتے ہیں اسے پکڑنے کے جتن کرتے ہیں جب کپڑ لیتے ہیں تو پھر اسے
 شہد کی مچھی بنانے پر تل جاتے ہیں“ وہ جہان دیدہ فلسفی جیسی باتیں کرنے لگی۔

اتل بڑی دیر تک تاسف کے انداز میں سر ہلاتی رہی۔

”کیا ہوا اتل؟“

”اپنا نقشہ یاد آ رہا ہے سرجی..... چہرے پر چھائیاں، کھر درے ہاتھ بوائیاں
 پھٹی ہوئی ہونٹوں پر لکیریں..... یہ سب کس لیے کہ کچھ گمنام سے لوگ کہیں کہ آئی

تو بازار سے ہے لیکن شریفوں کو مات کر دیا..... ہٹ تیری! اتنی سی تعریف سننے کے لیے آدمی ساری عمر تلاش بنا رہے نہ زردہ ڈال کر پان کھائے نہ سر میں مہندی لگائے نہ نقلی باڈس پہنے..... اور سننے کیا ہر وقت بازار سے بھاگ کر آئی ہے..... ہیرامنڈی سے اٹھ کر آئی ہے..... چلو جو یہ سننے میں آئے کہ بازار کا لفظ کبھی نہیں بھولتا۔ تعریف بھی کریں گے تو آپ کی اوقات آپ کو یاد دلا کر..... سر جی خود انصاف کریں جب بازار کا لفظ پیچھے سے اترتا ہی نہیں تو وہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے سے فائدہ؟“

”تمہیں وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔“

سگریٹ کا لمبا کش لگا کر وہ بولی..... ”لگتا تھا جی..... کبھی کبھی تو بہت لگتا تھا پر وہ سارا وقت مجھے ماڈل عورت بنا کر خاندان کے سامنے پیش کرنے میں لگا رہتا تھا..... بچارا! ہائے ہائے اس نے بھی بڑے دکھا اٹھائے۔ لیکن کیا کرتی سر جیا سے میری کمزوریوں غموں، غلطیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یا یوں سمجھئے آپ کہ وہ معاف کرنا نہیں جانتا تھا۔ ہر جگہ ہر محفل میں ہر وقت اسے ایک ہی شومارنی آتی تھی کہ دیکھو میں کتنا نیک ہوں میری وجہ سے ایک بازاری عورت تائب ہوئی ہے اسے میرے تائب ہونے کی خوشی نہ تھی اپنا دباؤ اونچا کرنے کی فکر تھی ہر وقت..... چلیے سر جی محبت کی خاطر تو آدمی سولی پر چڑھتا رہے مرتا رہے کھپتا رہے پر کسی کی انا کو موٹا کرنے کے لیے کوئی کب تک اپنی جان مارے؟“

”اے..... اے تو پیار ہو گا تم سے اتل؟ جس نے معاشرے سے ٹکری لی گھر والوں کے سامنے کھڑا ہوا..... اے پیار تو ہو گا تم سے۔“

سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر وہ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر بولی..... ”تھا جی پیار..... تھا کیوں نہیں پر پولو پولو پیار تھا۔“

”پولو پولو پیار کیسا ہوتا ہے اتل؟.....“ میں نے سوال کیا۔

”ایسا پیار جی جیسی بودی رسی ہوتی ہے زور سے کچھ باندھو تو ترک کر کے ٹوٹ

جاتی ہے ایسا پیار جس کا یقین سب کر دلاتے پھریں اور خود اپنے جی کو کبھی یقین نہ آئے ایسا پیار سر جی ٹھنڈی چائے اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا اس کی دوکان تھی انارکلی میں کپڑے کی..... ماں تھی نہیں تھیں ایک پچھلی منگیت تھی ایک شادی کے بعد کی محبوبہ تھی اتنی لمبی چوڑی ذات برداری کی عورتیں تھیں جو آدمی اتنی عورتوں میں بٹا رہے وہ بیچارہ بھی خالی ہو جاتا ہے اس کی زندگی ساری حصہ پتی میں گزرتی تھی۔ ادھر مجھے عادت نہیں تھی بٹے کے سوالوں کی..... ہم بچپن سے مرد کے جسم دل روح پر سوار ہونا سیکھتی ہیں ہم جب بھی کسی کرپکڑیں مضبوطی سے پکڑتی ہیں..... پوٹے پوٹے [یارس، مجھے نفرت تھی سر جی۔“

وہ تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر آپنی بولنے لگی..... ”ہمارے ہاں رواج ہے کہ مرد کو قابو کریں تو پھر ایسا کہ وہ..... اس کی ساری جائیداد بک جائے اور وہ ہمدردی چوکھٹ پر بیٹھ کر ساری عمر چلیمیں بھرتا رہے غفور درزی کی طرح..... اس کی بیوی ساری عمر مزاروں پو بھکتی پھرے۔ بچے یتیموں کی طرح پھریں..... سر جی ویسے ہر انسان کا جی چاہتا ہے نا کہ اس کے چاہنے والے کا لکھ نہ رہے ہر انسان کے اندر رب جو ہو اس سر جی..... رب اپنے چاہنے والوں کا کچھ رہنے دیتا ہے کبھی؟ سوائے اپنے۔“

”ہر ایک کا نہیں متل..... کسی کسی کا.....“ میں نے لمبی آہ بھر کر کہا۔

”ناں سر جی ہر مرد کا ہر عورت کا..... ہر انسان کے اندر رب چاہتا ہے کہ کوئی اسے ٹوٹ کر چاہے اس کی پرستش کرے..... بیوی بچوں والا ہو تو بیوی بچے چھوڑ دے..... دولت مند ہو تو مانگتا پھرے کسی بیاہی ہوئی عورت سے پیار ہو تو عاشق چاہے گا کہ آدھی رات کو شوہر کے پہلو سے اٹھ کر آئے..... نیک نام ہو تو بدنامی کے کنویں میں اترے۔“

”اُم تھیں سر جی.....“ وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

”کیوں؟.....“

”بس انھیں مجھے ایک کام یاد آ گیا۔“

میں اتل سے بھابھی صولت کی بات کرنے والا تھا لیکن اس وقت اس کی آواز میں کچھ ایسی تیزی تھی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے آج بہت کام ہیں اتل..... ایک ریہرسل ہے ایک ریکارڈنگ ہے پھر کاپسٹ کو میں خاص..... بلوا رکھا ہے۔“

”آپ چلیں تو سہی..... جلدی آجائیں گے۔“

پہلے وہ میرے کمرے سے رخصت ہوئی دس پندرہ منٹ کے بعد میں نکلا ریڈیو سٹیشن کے باہر وہ میرا انتظار کر رہی تھی سڑک پر پہنچ کر وہ میری موٹر سائیکل پر سوار ہو گئی چلتی سواری کے شور میں میں نے اسے کہا ”تم وہاں سے میرے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟“

”کچھ پردہ رکھنا پڑتا ہے.....“ موٹر سائیکل کی فلا بلاسٹ آواز پر غالب آ کر وہ بولی۔

میں نے اسے بتانا چاہا کہ احتیاط کے باوجود خوشبو کی مانند ہوتی ہیں جہاں کہیں ہوا جاتی ہے انہیں ساتھ لیے جاتی ہے..... بھابھی صولت کو اس وقت ساندہ کلاں میں معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

دینی اعتبار سے بھی اتل بڑی رنگارنگ تھی۔

اسکے گھر میں مجلسیں ہوتی تھیں اور وہ بڑی دھوم دھام سے محرم مناتی تھی۔ عاشورے کے دوران اس کے تن سے کبھی سیاہ کپڑا نہیں اترا پنج تن پر جان نثار کرتی تھی بی بی فاطمہ کے گھرانے کی عاشق تھی اس کے دو منزل مکان میں محرم کے دنوں میں مجلسوں کا زور شور سے انتظار رہتا تھا اور وہ ایسے ایسے مرثیہ پڑھنے والے حاضر کر

لیتی جو ساری محفل کو رلائے بغیر نہ رہتے شعبیہ رجحانات کے باوصف وہ لاہور کی تمام درگاہوں پر باقاعدگی سے جاتی تھی۔ حسین زنجانی میاں میر صاحب بابا شاہ جمال اور داتا صاحب کے قدموں میں جانا تو اس کا معمول تھا کرسس کی رات کو وہ بڑی خوش ہوتی اور اکیلی کرسس مناتی اس نے مجھے بتایا تھا کہ قیام پاکستان سے پہلے وہ بڑے خوش سے دیوالی کے دن گھر کی منڈیر پر دیئے بھی جلاتی تھی اور اس نے ایک مرتبہ ایک ہندو بزنس مین کو راکھی بھی باندھی تھی۔

جس وقت ہم دونوں لارنس باغ میں داخل ہوئے میرا دل دھک سے رہ گیا میرا خیال نہیں نہیں تھا کہ وہ مجھے باغ جناح لے جائے گی..... اس باغ میں ایک کانورکا درخت تھا اور اس درخت کی چھاؤں سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

”بس سرجی یہاں اترتے ہیں۔“

”تمہیں معلوم ہے مجھے آج بہت کام ہے..... میں باغوں کی سیر کو نہیں نکل سکتا“
 ”میں آپ کو باغ میں نہیں لے جا رہی سرجی..... وہ دیکھئے بابا تر ت مراد کا مزار۔ بس یہاں حاضری دیں گے اور لوٹ جائیں گے..... بس دس منٹ.....“

ہم barrier کے پاس موٹر سائیکل پارک کر کے مزار کی طرف چلنے لگے مزار کی جانب سے قوالوں نے ہارمونیم کے سراٹھانے شروع کر دیے تھے..... میں چپ تھا اندر باہر..... اتل سے مل کر میں نے سیسی کی یادوں کو قفل لگا کر کولڈسٹورج میں رکھ دیا تھا۔

”بہت چپ ہیں آپ سرجی؟“

”ہاں کچھ کچھ۔“

پتہ نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ اتل کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر رونے لگوں؟ لیکن رونے کی بھی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔

”اس عورت کو دیکھ کر چپ لگی ہے؟.....“ اتل نے سوال کیا۔

”کون سی عورت۔“

”وہ.....؟.....“

میں نے سامنے دیکھا ایک جوان عورت ہاتھ اٹھائے مزار کی دیوار سے لگی، دعا مانگ رہی تھی اس نے ریشم کا کرتا پہن رکھا تھا اور مخالف رخ کی ہوا کے باعث وہ مڑی ہوئی شاخ جیسی پکلیلی نظر آرہی تھی۔

”کیسی ہے؟.....“ احتل نے پوچھا۔

”کسی بوڑھے مرد کی بیوی ہے جوان عاشق سے ملنے کی دعا مانگ رہی ہے۔“

”ناں جی..... جوان آدمی کی محبوبہ ہے اور دعا مانگ رہی ہے کہ شادی ہو جائے

اس سے“

”شادی شدہ تو نہیں لگتی.....“ میں نے کہا۔

”لیکن ہے..... ورنہ پیٹ ایسا نہ ہوتا“

”اگر شادی شدہ ہے تو پھر..... بیٹے کی دعا مانگ رہی ہے“

”بیٹا تو ہے..... اس کے پاس صرف محبت نہیں ہے بچپن کے عاشق کو یاد کر رہی

ہے۔“

”پھر ہمیں کیا؟۔“

”ہاں، ہمیں کیا۔“

ہم دونوں مزار کے قرب میں پہنچ کر چپ ہو گئے۔ ساری فضا والی کے اولین سروں سے بوجھل تھی تر ت مراد کے مزار پر بہت کم لوگ تھے..... ہر طرف آند تھا شانتی تھی، خوشبو تھی کچھ مزار کے پھولوں کی..... کچھ باغ سے اڑ کر آنے والہ بہار کے دنوں میں مزاروں کی فضا آرزوؤں سے سسکنے لگتی ہے قریب پہنچ کر میں نے ریشمی کرتے والی کی طرف دیکھا وہ مزار سے باہر والی دیوار کے پاس ہاتھ اٹھائے چپ کھڑی تھی نہ اس کے چہرے پر کسی آرزو کا کرب تھا نہ کچھ پالنے کی ہوس..... وہ

پچیلی شاخ کی طرح تمام کی تمام شکرگزاری کے پھولوں سے لدی تھی۔

مزار پر پہنچ کر یکدم اتھل اجنبی ہو گئی اس نے وضو کیا۔ گیلے چہرے کے اوپر دوپٹے کی بکل ماری اور اندر مزار کی طرف چلی گئی..... میں قوالوں کے پاس درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ رہا۔

اسی طرح جب میں چند را سے قصور آتا تھا تو میں ماموں کے گھر سے نکل کر روز بابا بھلے شاہ کے مزار پر عین وہاں جا بیٹھتا جہاں قبریں ہیں قوالوں کی آوازیں آتی رہتی اور میں مزار سے ہٹ کر ان قبروں کے بیچ بیٹھا رہتا..... گپ چپ..... ان دنوں نہ مجھے بابا بھلے شاہ سے عقیدت تھی نہ میں قوالوں کی موسیقی سے متاثر ہوتا..... صرف وہاں بیٹھ کر میں آنے جانے والے عقیدت مندوں کو دیکھتا رہتا مجھے ان عقیدت مندوں سے بڑا پیار تھا ان کی شکلیں بدلتی رہتی تھیں لیکن ہاتھوں کو جوڑنے کا انداز بھرائی ہوئی آنکھیں لرزتے ہوئے ہونٹ وہی رہتے تھے کئی کئی گھنٹے میں چپ چاپ قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہتا..... چند راں میری ماں ابا عزیز گاتن سب مجھے ان قبروں میں سوئے ہوئے نظر آتے..... میں ان قبروں کے ساتھ ٹیک لگا سکتا تھا ان کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا.....

بڑی دیر بعد اتھل میرے پاس آئی رونے کے بعد وہ بڑی کمسن لگ رہی تھی

”آپ بھی کوئی دعا مانگ لیتے سر جی۔“

”مانگ لی ہے۔“

”کیا؟“

”بس بتائیں گے کبھی! اور تم نے کیا دعا مانگی ہے اتھل؟“

”بس یہی..... یہی سر جی زندگی تو کسی پیار کرنے والے کے سہارے گزری نہیں

اب موت تو کسی پیارے کے ہاتھوں آئے۔“

ہم دونوں واپس موٹر سائیکل کی طرف چلنے لگے۔

وہ بھی بلا کی دھنسی ہوئی چپ تھی جس وقت ہم بیرئیر کے پاس پہنچے تو پتہ نہیں
کیوں مجھے خیال آیا کہ آج پہلی بار میں اتھل کو وہ مزار دکھاؤ جہاں سبھی میرے
خیالوں میں دفن تھی میں اسے سبھی کے متعلق وہ سب کچھ بتاؤں جس کا اظہار میں آج
تک نہ کر سکا۔

”آؤ، اتھل۔“

”کہاں سر جی۔“

”یہیں اسی باغ میں۔“

”آپ کو دیر ہو رہی ہے..... بہت کام ہے آپ کو دفتر میں۔“

”کام تو ہوتا ہی رہے گا آؤ۔“

بہار کے نئے نئے دن تھے..... کچے ناریل جیسے کچر کچر دن..... گرم ملکوں میں
بہار تنہا نہیں آئی اس کے ساتھ گرمیوں کا احساس بھی آتا ہے جسم میں سردیوں کی یاد
اور گرمیوں کا خوف ہوتا ہے پتے جھڑے درختوں میں نئی کوئٹیل سبز براؤں چکنے
پتے اور بند بند کلیاں ہوتی ہیں ہر رت میں تمام عناصر کی بنیت بدل جاتی ہے ہوا پانی
اور روشنی کا مزاج بدلتا رہتا ہے لیکن روشنیوں کا موسم کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے
سردیوں کی روشنی اور دھوپ میں معافی مانگنے کا انداز ہوتا ہے دیر سے آنے والے
مہمان کی طرح وہ چوکھٹوں کے سایوں سے چمٹی رہتی ہے اور دیر سے آنے کا
اعتراف کیے بغیر وقت سے پہلے رخصت ہو جاتی ہے گرمی کی روشنی دندنا تا سا ہو کار
ہے..... مارشلی لاء ہے پولیس ایکشن ہے..... دندنا تی آتی ہے گلیاں بازار سب
ہونے ہو جاتے ہیں جیسے کرفیو لگا ہو۔

لیکن بہار کی روشنی میں نہ تند ہوتی ہے نہ شکست۔

وہ بار بار رگلے لگنے والی محبوبہ کی طرح ہر ہر مسام میں خوشی بھر دیتی ہے بہار کی
روشنی جگمگاتی ہے سلاتی ہے ہوش میں رکھتے ہوئے بے سدھ کیے رکھتی ہے..... اس

میں دن چڑھنے سے دن ڈھلنے رک ہزاروں کیفیتیں بدلنے کا مادہ ہوتا ہے باغوں میں اس کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔

کوٹھوں پر بازاروں میں اس کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے کھڑکیوں دروازوں میں یہ منتظر کھڑی ملتی ہے..... بار بار گلے ملنے والی محبوبہ کی طرح پذیرائی ہی پذیرائی ہوتی ہے.....

بچھڑنے سے پہلے بار بار ملنے کی وارفتگی!

دراصل بہار کی روشنی مکمل انتظار ہے۔

زردہ زرہ دھوپ میں گھومنے پھرنے والے بھونروں کا انتظار۔

موٹر سائیکل پر آنے جانے والے نوجوانوں کا انتظار۔ بسوں پر سوار ہوتی لڑکیوں

کا انتظار۔

سارے شہر کو نہ جانے کس مسیحا کا انتظار ہوتا ہے کہ بہار کی روشنی پیلارڈ اجاتا ہے اور وہ بسنتی کپڑے پہن کر پیلی دھوپ میں نکل آتی ہے..... مجھے بھی اس بہار کے دن میں پتہ نہیں کس کا انتظار تھا؟..... سیسی کا؟..... عابدہ کا..... یا فقط اپنی ذات کا۔

سامنے درختوں سے چگاریں قطار در قطار، گروہ در گروہ چمکی ہوئی تھیں۔ ایک اندھی چگا ڈر ہمارے سامنے اوپر سے گرمی اور چند بچے گھیرا ڈال کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ ہم چپ چاپ پہاڑی کے بائیں جانگ منگمری ہال کی سمت چلنے لگے۔ بہار کے دنوں میں کبھی کبھی اچانک زندہ رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اگر جلد زندگی کا لہو منہ کو نہ لگے تو آدمی بہار کی زرد روشنی میں صرف سانس روک کر مر سکتا ہے کا نور کے درخت تلے پہنچ کر میں رک گیا۔

”یہاں کچھ کچھ دیر بیٹھیں اتل..... یہ بڑا مقدس درخت ہے۔“

اتل نے اپنے برقعے کا نقاب اتار کر گھاس پر بچھا دیا..... ”آپ اس پر بیٹھ

جائیں سر آپ کا سوٹ خراب ہو جائے گا۔“

میں نے نقاب کو گھنٹوں پر رکھ لیا اور چپ چاپ بیٹھ گیا۔

”اس درخت تلے ایک لڑکی ملی تھی مجھے ایک بار۔“

پتہ نہیں یہ کافر کا درخت کی خوشبو تھی کہ سیسی کے نہ نظر آنے والے وجود کی..... لیکن اس وقت میں اتل کے ساتھ نہیں تھا میں اندر ہی اندر بھیگ رہا تھا جیسے کسی آبشار کے کنارے بیٹھا ہوں۔

”اتل! کبھی تم نے کسی ایسے شخص سے محبت کی ہے جو کسی اور کی محبت میں مبتلا ہو؟“

”ہاں جی..... بلکہ ہمیشہ!“

”بہت ٹوٹ کر..... پاگل پن کی حد تک۔“

”ہاں جی ایک شخص سے کی تھی“

”درزی غفور جیسی محبت۔“

”کی تھی سر جی.....“ اتل نے لمبا سانس لیا۔

”کہاں ملی تھیں تم اسے۔“

اتل نے اپنے گھنٹوں کے گرد بازو حائل کیے اور کھڑے زانو پر سر رکھ کر بولی..... ”پرانے ریڈیو سٹیشن پر ملی تھی جی اسے بہت سال ادھر کی بات ہے تب میری شادی بھی نہ ہوئی تھی ان دنوں ریڈیو سٹیشن شملے پہاڑی کے کچھواڑے ہوتا تھا میں ریڈیو پروگرام کیا کرتے تھے آرڈی صاحب مجھے اپنے کمرے میں بلا کر دھیما دھیما ٹھکر جھاڑا کرتے تھے بڑی عزت تھی میری ان دنوں..... بڑی شان تھی پروگرام پروڈیوسر کا رتک چھوڑنے آتا تھا۔ ذرا لیٹ جاتی تو فون پر فون آتے ریڈیو سٹیشن کی گاڑی لینے آ جاتی..... گھر پر ریڈیو سٹیشن پر..... چہر میں ہر جگہ عزت ہی عزت تھی۔“

”کیا نام تھا اس کا؟“

”ایسے لوگوں کا کوئی نام نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسے بندوں کا کوئی گرام ہوتا ہے“

..... بس وہ دیس بدلیس بجلیاں گراتے بھتے ہیں۔“

”ہم دونوں بڑی دیر تک خاموش رہے سڑک پر لکڑی کی ہیل پہنے کوئی لڑکی جا رہی تھی میں نے آنکھیں بند کر لیں جو توں کی چاپ بالکل سیسی جیسی تھی..... لکڑی کی ہیل..... سیسہ پلائی سڑک کا سینہ کوٹ رہی تھی۔“

”جس وقت میں آرڈی صاحب کے کمرے میں پہنچی وہ جانے کے لیے اٹھ رہا تھا کھدر کی سفید شلوار قمیض کندھوں پر کالی سیاہ چادر..... سفید رنگ، براؤن بال براؤن آنکھیں..... کھڑا ہوتا تو لگتا کہ کھڑے رہنے میں اس کا سارا حسن ہے بیٹھ جاتا تو لگتا کھڑے ہو کر اتنا پیارا کبھی نہیں لگتا..... مجھے دیکھ کر وہ دوبارہ کرسی میں بیٹھ گیا لیکن بولا نہیں میرے سلام کا جواب ہی نہیں دیا۔ آرڈی صاحب نے تعارف کروایا اس نے صرف سر کے ہلکے سے اشارے سے جواب دیا۔ چائے آگئی آرڈی صاحب مجھ سے دھیمادھیماتوجہ بھرا عشق کرتے رہے میں دو گھنٹے بھٹھی رہی وہ ایک لفظ نہیں بولا..... لیکن بار بار دیکھتا تھا..... لچھ لوگوں کی نگاہیں جب بھی آپ پڑتی ہیں ہمیشہ چوم کر لوٹتی ہیں..... ہے نا سر جی؟.....“

وہ چپ ہو گئی۔

یہ ایک نئی اہل تھی یادوں کی غلام گردش میں ننگے پاؤں بال کھول کر پھر نے والی اہل..... اس کی باتوں میں سے سارا ہلکو پن غائب تھا اس کی آواز پنکھڑیوں کی طرح گر رہی تھی پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ایک ذمانہ ضرور ایسا بھی ہوگا کہ جب وہ بہت اچھا لگاتی ہوگی اور لوگ ریڈیو سے کان لگا کر اس کے گیتوں کو سنتے ہوں گے۔

”پھر..... پھر اہل؟.....“

”جب میں ریہرسل کر رہی تھی تو وہ اندر آ گیا۔ بڑا مشہور شاعر تھا ریڈیو کے لیے غنائے بھی لکھتا تھا سب کے ساتھ صاحب سلامت تھی اندر آ گیا اور ایک کاغذ کا پرزہ مجھے پکڑا کر بولا..... اسے گائے..... میں نے غزل پڑھی اور سننے میں آگئی میں

بڑے بڑے خوبصورت مرد کو کوٹھے پر دیکھے ہیں سرجی..... لیکن کسی خوبصورت مرد کو اتنی خوبصورت شاعری کرتے نہیں دیکھا دھن تیار ہوئی میں نے ریہرسل کی سارا وقت وہ آنکھیں بند کیے کونے میں چپ چاپ بیٹھا رہا جب کبھی اچانک وہ میری طرف دیکھ لیتا تو میں لے پکڑنا بھول جاتی اس طرح آگاز ہوا..... پھر..... پھر لمبی داستان ہے بدنامی کی..... جھگڑوں کی..... ہماری طرف تو خدا نہ کرے کسی کو عشق ہو جائے.....“

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں نے اس کے لیے کئی سوئیٹر بنے..... تمہا کو کا اسے شوق تھا کئی پائپ منگوائے ولایتی ٹائیاں..... قمیضیں..... میں اسے جب بھی میرا جی چاہتا میں اس پر کچھ نہ کچھ نچھاور کر دوں اپنا جسم اپنی روح..... ساری ریاضت دھری کی دھری رہ جاتی اور میں اسے خط لکھتی رہتی..... دن میں تین تین خط سرجی..... اور وہ مجھے ہفتے میں ایک آدھ گزل بھیج دیتا اسے نے کبھی مجھے خط نہ لکھا کبھی کوئی تحفہ نہ دیا..... کبھی میرے جسم کو ہاتھ نہ لگایا..... اس کے باوجود..... اس کے باوجود وہ ایسے لگتا جیسے کسی روز مجھے ٹوٹ کر چاہنے لگے گا۔ میں اسی دن کی آرزو میں جی رہی تھی..... ہم روز ملتے تھے ہر روز میں اس ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کرتی..... سرجی کبھی آپ نے ایسے زخمی پرندے کو دیکھا ہے جو اپنے گھونسلے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن پہنچ نہ سکتا ہو؟ ہراڑ ان کے بعد میں منہ کے بل گرتی اور اڑنے لگتی۔“

”ہاں اتل سیکھا ہے اتل غور سے دیکھا ہے۔“

میں ذہنی طور پر حاضر بھی تھا اور غیر حاضر بھی ہر انسان پر ایسے لمحے آتے ہیں جب ارد گرد کی ہر چیز کافی ہوتی ہے کسی نئی چیز کی خواہش یا انتظار بھی نہیں ہوتا بظاہر کسی سے کوئی شکایت یا گلہ بھی باقی نہیں رہتا عشق کا روگ بھی کوسوں دور ہوتا ہے آگے پیچھے ہر سمت سے سکھ کا سندیسہ آتا ہے فضا میں ہوا میں روح میں کوئی پھانس نہیں ہوتی

صرف اس کے سائے کا رنگ بدل جاتا ہے اور اس سائے میں نہ جانے کیا کشش ہوتی ہے کہ وہ سارے کا سارا خوف سے لبریز ہو جاتا ہے اور جیسے ہوا میں سگریٹ کی پنی کا پتھی ہے ایسے ہی اس کی پسلیوں تلے اس کا دل کرزنے لگتا ہے انجانے خوف سے انجانی تبدیلیوں سے۔

”آخر میں نے ایک دن آپار جانے کا فیصلہ کر لیا سر جی..... میں نے اسے خط لکھا کہ وہ مجھے رات کے دو بجے شملہ پہاڑ کے پاس ملے“
 ”اس نے میرے اس خط کا بھی جواب نہ دیا۔“
 ”تمہیں یقین تھا کہ وہ آئے گا؟“
 ”جی مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔“
 ”کیسے متل؟“

”بس سر جی کچھ باتوں کا دل اکو ایسے ہی یقین ہوتا ہے..... میں نے بڑا زمانہ دیکھا ہے مجھے معلوم ہے آج جس پر دم نکلتا ہے کل وہی اجنبی لگے گا..... وقت کے ساتھ ساتھ سب عشق عاشقی ختم ہو جاتی ہے..... لیکن..... وہ ایسا عشق نہیں تھا جیسے وقت کا ہتھوڑا کوٹ پیس سکے.....“

بڑی دیر تک وہ اپنے برقعے کے پھونسٹرے نکالتی رہی پھر بولی..... ”بی بی کو مجھ پر بہت شبہ تھا۔ اس نے کئی دن سے میرا نکلتا بند کر رکھا تھا..... میرا سارا زیور کپڑا بھی بی بی نے نیچے لے جا کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ بڑی کپتی تھی جوانی میں بی بی..... مجھے ایسا ایسا مارا ہے کہ..... کہ پتہ نہیں میں اندہ کیسے ہوں آج..... کوئٹی والا ڈنڈا ہمیشہ سر ہانے رکھ کر سوتی تھی۔“
 ”مارا کیوں؟“

”مارتی نہ تو اور کیا کرتی آپا کر مرے تھوڑا عرصہ ہوا تھا فیروزہ سات سال کی تھی اور باقی پانچ بیٹے تھے بی بی کے سارے کے سارے نکھٹو..... میری مانگ بھی تھی ان

دنوں ڈیرہ غازی خان ہزارہ سہی..... زیارت، شور کوٹ..... سکھر جانے کہاں کہاں
مجرے نہیں ہوئے میرے ان دنوں..... بی بی مالدار ہورہی تھی وہ میرا عشق کیسے
برداشت کرتی بھلا؟“

میں بولنا چاہتا تھا لیکن ہر جگہ سیسی بلھری پڑی تھی..... اس کی جوتیاں، کینوس کا
بیگ، کھلے بال جینز..... گلابی عینک، کستوری کی خوشبو۔

”جس روز میں گھر سے بھاگی ہوں۔ اس کی روز شام سے بارش پڑتی رہی تھی
پہلے میں نے ان مانے جی سے تین چار غز لیں گائیں اور پھر طبعیت کی خرابی کا بہانہ
کر کے بیٹھک سے آگئی..... بڑی بارش تھی بڑی سردی تھی دروازے کھڑکیاں آنے
جانے سے روکتے تھے میں سر پر لحاف لے کر جاگ رہی تھی کہ بی بی نے ایک سندھی
نواب اوپر بھیج دیا بڑی بڑی مونچھیں گہری سیاہ انکھیں..... بڑی بڑی بولنے سے
پہلے مسکراتا..... اور مسکرانے سے پہلے ابرو کے بال کھینچتا..... پرانے مراسم تھے اس
کے میرے ساتھ..... جب بھی لاہور آتا ہمارے پاس ہی ٹھہرتا تھا۔“

اتھل نے لمبی سانس لی اور بڑی دیر بولی..... نواب صاحب کا باغ تھا حیدر آباد
کے قریب کیلوں کا باغ..... بڑی آمدنی تھی..... تین تین کاریں تھیں لیکن ہمیشہ اپنے
بٹوے کو ازار بند سے باندھ کر سوتا تھا..... باہر بارش کی چادر لٹک رہی تھی..... زیور
کپڑا سارا بی بی کے پاس..... قسمت سے سواری کے لیے بھی دھیلا پاس نہ تھا بی بی
نے سونے سے پہلے سارے پیسے مانگ لیتی تھی بہانے بہانے سے اور میں نے اس
سے وعدہ کیا تھا شملہ پہاڑی کے پچھواڑے ملنے کا.....“

”بڑی دیر تک سندھی سائیں اپنے باغ بیوی اور بچوں کی باتیں کرتا رہا پھر بے
سدھ ہو گیا پتہ نہیں کیا بات ہے جب اللہ کو منظور ہوتا ہے تو خود بخود سبب بن جاتا ہے
پہلی بار میریدل میں کسی کو قتل کرنے کا خیال آیا۔ اس وقت وہ مجھے آدمی لگتا ہی نہیں تھا
جی میں تھی کیوں نہ اس بھید کو ذبح کر دوں امیر آدمی ہے بٹوے میں ہزاروں ہوں

گے۔ لیکن مجھے قتل کرنے کا کوئی درست طریقہ نہ آتا تھا۔ نہ میرے پاس کوئی تیز چھری تھی نہ کبھی میں نے پستول کا لائسنس بنوایا تھا لیکن اس وقت مجھے پورا یقین تھا کہ اگر مجھے کہیں سے کند چھری بھی مل گئی تو میں اس کی شہہ رگ کاٹ دوں گی کوئی بیس مرتبہ میں پلنگ سے اٹھ کر غسل خانے گئی آخر میں نے چھری کی تلاش شروع کر دی کبھی کبھی پھلوں کی خاطر میں اپنے کمرے میں چھری رکھا کرتی تھی کبھی میں اپنا پرس اٹھا کر غسل خانے میں لے جاتی کبھی سوٹ کیس اٹھا کر غسل خانے میں لے جا کر اس کی تلاشی لیتی آخر کو میں نے سندھی نواب کے ساتھ والی سائیڈ ٹیبل کا دروازہ کھولا جس وقت میں نے دروازے کھولا نواب صاحب نے میری طرف کروٹ لی اور بولے..... کیا کر رہی ہو سو جاؤ..... میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا میں نے دبی آواز میں کہا..... میری طبیعت خراب ہے دوائی تلاش کر رہی ہوں۔ سندھی سائیں اچھا کہہ کر سو گئے..... میں نے پھر کچھ دیر بعد دروازہ کھولا..... سامنے چھری اور بٹوہ ساتھ ساتھ پڑے تھے۔“

میں نے دل چسپی سے امتل کی طرف دیکھا..... پھر امتل پھر؟.....“

”میں نے چھری اور بٹوہ دونوں اٹھا لیے اور غسل خانے کی طرف لی..... لیکن وہاں تک کا فاصلہ سارا تھل بیلاتا تھا میں جیسے پتی ریت پر چل رہی تھی غسل خانے میں پہنچ کر بٹوہ میں نے اپنے ازرا بند سے باندھ کر اندر اڑا لیا اور چھری کو ڈپر رکھ دی شہ نشین والے راستے سے پچھلی سیڑھیوں پر گئی بڑی احتیاط سے کند کی کھولی اور باہر۔“

”کتنی رقم تھی بٹوے میں؟۔“

”ایک فیروزے کی انگوٹھی اور بائیس ہزار روپے تھے۔“

”پھر پہنچیں تم شملہ پہاڑی۔“

شاہی محلے سے داتا دربار تک پیدل گئی..... وہ بارش وہ بارش ایسی سردی کہ

ہڈیاں تک جم گئیں لیکن میرا دل گرم تھا اس رات میں اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے والی تھی..... بالآخر ایک رکشہ مل گیا سالم پھر کبھی میں اپنا دوپٹہ نچوڑتی کبھی چادر کبھی بال جھٹکتی..... مجھے رکشا ڈرائیور سے بھی خوف آ رہا تھا لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی کہ دل میں خوشی ہی خوشی تھی جب میں شملہ پہاڑی کے سامنے پہنچی تو پتہ نہیں کیوں سر جی میرا جی چاہنے لگا کہ واپس جا کر نواب صاحب کو بوٹہ لوٹا دوں..... اس سے پہلے کبھی میرا ضمیر نہ جا گا تھا..... لیکن ابھی میں نے رکشا والے کو موڑنے کے لیے کہا ہی تھا کہ وہ مجھے لیمپ پوسٹ کے سامنے بھگتا ہوا نظر آ گیا۔“

”آگیا وہ..... بڑی خوش نصیب ہوں!“

”اس وقت میں بھی یہی سمجھتی تھی ہم دونوں مل کر ایک ہوٹل میں چلے گئے وہ سارے کا سارا بھیگا ہوا تھا اور بار بار چھینک رہا تھا ہم دونوں ہیٹر کے سامنے بیٹھے پرندوں کی طرح بیٹھ گئے وہ پہلی دفعہ بولا..... کہنے لگا ”دیکھو نہ میں تم سے شادی کر سکتا ہوں نہ محبت/ میں کسی اور کا ہوں تم اپنے آپ کو سمجھا لو۔“

میں رونے لگی بڑی دیر تک روتی رہی پھر میں نے گیلے کپڑے اتار دیئے اور بستر پر لیٹ گئی مجھے سردی لگ رہی تھی کپڑی سے میرا سارا بدن ہچکولے کھا رہا تھا

”مجھے سردی لگ رہی ہے“

”میں چائے منگواتا ہوں۔“

جب چائے آگئی تو اس نے پیالی بنا کر مجھے دی لیکن بستر کے پاس نہیں آئے میں کئی گھنٹے روتی رہی وہ ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر اپنے بدن کے کپڑے سکھاتا رہا آخر جب رونے سے بھی جی کا بو جھنڈا اتر تو میں نے اسے پکارا

”کیا نام تھا؟“

”آپ کو نام سے کیا لینا ہے سر جی ایسے لوگ بے نام ہوتے ہیں میں نے اسے پکارا تو وہ پاس آ کر قالین پر بیٹھ گیا اس کے کندھے پر میری چادر تھی اور وہ بارش میں

نہا کر اور بھی شفاف ہو گیا تھا میں نے بائیس ہزار روپیہ سرہانے سے اٹھا کر اس کی جھولی میں پھینکا پہلے وہ بھونچکا رہ گیا پھر روپے کو دیکھتا رہا۔“

”تمہارے لیے ہیں..... یہ سب“

”افسوس میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا اتل۔“ بڑی دیر کے بعد وہ بولا ”میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں اس نے بیوگی کے سارے دکھ جھیل کر مجھے پالا ہے۔ اگر میں نے تم سے شادی کر لی تو وہ مر جائے گی..... میں کبھی کسی عورت کا نہیں ہو سکتا، اتل میں صرف اپنی ماں کا ہوں..... میں اس کے دکھوں میں حل ہو چکا ہوں سارے کا سارا۔ پھر اٹھ کر اس نے روپے مجھے لوٹا دیے۔ اتل وہ کہنے لگا میرے دکھوں سے مجھے یہ روپیہ نجات دلا سکتا ہے لیکن میں تمہاری عمر بھر کی کمائی لینا نہیں چاہتا۔ اس نے روپیہ میرے سرہانے رکھ دیا میں اصرار کرتی رہی اور پھر سو گئی۔ اٹھی تو مجھے تیز بخار چڑھا ہوا تھا کھڑکی سے سے تیکھی روشنی آرہی تھی میں نے سرہانے تلے ہاتھ مارا وہاں روپیہ پیسہ کچھ نہ تھا ایک پرزے پر دو شعر لکھے تھے جن میں روپے کا شکریہ ادا کیا تھا..... اس کے بعد سر جی ایک اور لمبی کہانی ہے وہ تو بیچارہ سندھی نواب شریف آدمی تھا ورنہ ہمیں تو تھانے کی شکل دیکھنا پڑتی۔“

”پھر تمہیں نہیں ملا وہ شاعر؟“

”پہلے تو میں کئی مہنے ریڈیو سٹیشن نہ گئی جانے لگی تو پتہ چلا کہ وہ کراچی چلا گیا ہے.....“ اتل نے لمبی سانس بھری اور چپ ہو گئی۔

اس نے اپنے اندر کنڈی لگالی تھی..... بہار کی فضا خاموشی اور خوشبو کی وجہ سے بوجھل ہو گئی..... ہم دونوں کی سوچ الگ الگ سمت میں روں تھی۔

بڑی دیر بعد وہ بولی..... سو گئے بادشاہو۔

وہ موڈ بدلنے کی کوشش میں تھی۔

”سوئے تھے پر کسی خصماں نوں کھانے نے جگا دیا۔“

وہ جھوٹی ہنسی نہ کر بولی..... ”بات نہیں بنی سرجی..... اگر مجھے پان کھانا اور بات کرنا آتا تو میں آپ کا دل بہلاتی۔“

”آج تو خوب باتیں کر رہی ہو۔“

”کچھ نہیں سرجی نہ بات کرنی آئی نہ پان کھانا آیا۔ دونوں باجھوں سے پان کی دھاری ہنستے لگتی ہے بیگمات کو پان کھاتے دیکھا ہے پان کلمے میں اور رنگ ہونٹوں پر..... عورت اچھا پان کھانے والی ہوا اچھی بات کرتی ہو تو مرض و رمتاثر ہوتا ہے۔“

”مجھے تو تم ویسے بھی متاثر کرتی ہو۔“

”چھوڑیے سرجی اب وہ ٹیم نہیں رہا۔ ویسے آپ بھی بہت دور نکل چکے ہیں آپ کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”پڑتا ہے اتل بہت پڑتا ہے۔“

پہلی بار دونوں ایک دوسرے کے ماضی سے متعارف ہو رہے تھے وہ مجھے اندوالی اتل سے ملا رہی تھی اور یہ اتل میرے لیے بالکل نئی تھی واقفیت بڑھنے کے باوجود حجاب بڑھ رہا تھا ہم دونوں قریب آنے کے بجائے اجنبی بنتے جا رہے تھے۔

”آپ سرجی؟..... آپ نے بھی کبھی زخم کھایا ہے؟۔“

بڑی دیر تک میں اسے سیمی کے متعلق سب کچھ بتا رہا تھا اپنے دکھ اس کی حرمان نصیبی ہم دونوں کمان اور تیز کی طرح کیسے ساتھ ساتھ رہے اور کیسے دور دور نکل گئے وہ چپ چاپ سنتی رہی گردن گرائے نظریں جھکائے ایک بار بھی اس نے کوئی سوال نہ کیا کوئی تفتیش نہ کی۔

شام پڑنے لگی اور ہوا میں خنکی آگئی۔ باغ کی چہل پہل میں اضافہ ہو گیا۔ پھر شام کے جاگتے اندھیرے میں بنیاں روشن ہو گئیں اور ہم دونوں بیٹھے رہے آمنے سامنے الگ الگ وقتوں میں مقید علیحدہ گردنوں پر گھومتے ہوئے۔

”آپ کو ایک مشورہ دوں سرجی؟ قسم لے لیں کئی برسوں سے میں نے کسی کو

مشورہ نہیں دیا۔“

”ضرور دو۔“

”آپ شادی کرا لیں سر جی..... آپ جیسے لوگ صرف شادی کے قابل ہوتے ہیں حرام سے کوئی واسطہ نہ رکھیں میں بتاؤں حرام سے کچھ ہو جاتا ہے یہاں۔“ اس نے سر کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا مطلب؟“

”آپ جیسے لوگ کچھ کرنے کرانے جو گے نہیں ہوتے نہ کوئی دھماکہ نہ قتل نہ خودکشی۔ آپ جیسیوں کے لیے شادی بڑی اچھی رہتی ہے۔“

”مجھ جیسیوں سے تمہاری کیا مراد ہے۔“

”آپ جیسے آدمی..... بند آدمی!“

”بند آدمی سے تمہاری کیا مراد ہے اتل؟“

اتل نے ماتھے پر تیوری ڈالی کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی..... ایک نیک آدمی ہوتا ہے سر جی اور ایک بند آدمی..... دونوں ایک سے اگلتے ہیں کچھ فاصلے سے..... پرابڑا فرق ہوتا ہے دونوں میں نیک آدمی کی سرشت نیک ہوتی ہے قدرتی طور پر..... ہو چاہے نیل لوگوں میں رہے چاہے بد لوگوں کی صحبت میں اس کی سرشت کوئی اور رنگ قبول نہیں کرتی بھوک سے مر جائے لیکن عقاب مرادار نہیں کھاتا سر جی..... حرام کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

”میں تمہاری بات اچھی طرح سے سمجھا نہیں اتل.....“ میں نے کہا۔

”نیک آدمی کے اندر جھگڑا نہیں ہوتا..... لیکن بند آدمی کے اندر بڑے جھگڑے ہوتے ہیں سر جی..... اس کے اندر بد کی کشش ہوتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو بد کی اجازت نہیں دیتا اس کے اندر نیکی موجود نہیں ہوتی لیکن وہ نیکی کیے جاتا کئی بار سوسائٹی کے ڈر سے کبھی کسی چاہنے والے کے خوف سے..... وہ دراصل خود پیمانہ

نہیں ہوتا دوسرے لوگوں کی رائے اس کا پیمانہ ہوتا ہے۔ بے چارہ..... کبھی آنکھوں پر پٹی باندھتا ہے کبھی سر پٹ بھاگتا ہے..... کبھی کانوں پر انگلیاں کبھی منہ پر تالا..... تو بہ تو بہ سرجی بڑے عذاب میں زندگی گزرتی ہے اس کی..... میرا مطلب ہے سرجی نیک آدمی بدی دل سے کرنا نہیں چاہتا اس کی بس طبیعت ہی راغب نہیں ہوتی بند آدمی سب کچھ کرنا چاہتا ہے پر خ صلی اللہ علیہ وسلم سے مفلوج رہتا ہے وہ بھی ایسا ہی تھا وہ شاعر بھی.....“ آج انک بالکل نئی منزل سے منزل سے متعارف ہونے کا اتفاق تھا۔

”میں بھی اس کی طرح ہوں..... بائیس ہزار لے جانے والے کی طرح.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”بالکل سرجی بالکل آپ بھی بند ہیں میل بند مہر بند ہوا بند آپ کے اندر بھی کوئی روشن دان نہیں آپ کے چوچہ سے بھی کوئی موری نہیں نکلتی سرجی..... وہ بھی بند کمرہ تھا..... آپ کو بھی گولک کی طرح بند ہیں۔ ہاں کبھی کبھی کوئی شخص آپ کے اندر گھس کر چور کو تھکڑی پہنا دیتا ہے ایسے میں اپنے آپ کو سزا دینے سے آپ بچ جاتے ہیں ورنہ تو..... ورنہ تو.....“

میں نے آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا آج میں نے اسے سیمی کے متعلق سب کچھ بتایا تھا اور پہلی بار مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اور میں ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے اور اب جاننے کا وقت نکل گیا ہے تیل اور پانی بہم رہنے کے باوجود ایک دوسرے میں حل ہونے سے قاصر رہے انسان کا بھی خواب المیہ ہے کبھی کبھی کسی شخص سے پورا رابطہ بڑھا لینے کے بعد یکدم اسے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ تو حل ہونے کے بجائے سطح پر بیٹھا رہا اور ذرا دی چھیڑ چھاڑ سے اوپر آ کر کارک کی شکل میں تیرنے لگا ہر انسان کو کسی اور میں حل ہو جانے کی شدید آرزو ہوتی ہے اسی لیے وہ ساری عمر ہم جنسوں ہم زبانوں ہم وطنوں ہم مشربوں میں گھومتا ہے جھانکتا ہے اور رابطے جب بہت بڑھ

جاتا ہے تو ہر رشتے سے ایسی صدائیں آتی ہیں جیسے اندھے کنویں کی سطح سے جا کر خالی ڈول ٹکرائے اور شرمندہ ٹامک ٹوئیاں مارتا ہلکا پھلکا باہر کی طرف نکلنے لگے۔

”یہاں ہم سب کس لیے آتے ہیں سرجی..... صرف مرنے کے لیے ناں؟۔ زندہ رہنے کے لیے بھی اتل زندہ رہنے کے لیے بھی شاید۔“

اتل نے ماتھے پر ان گنت سلوٹیں ڈالیں..... ناں سرجی آنا صرف مرنے کے لیے ہے..... زندہ رہنا تو ٹامپاس کرنے کے لیے ہوتا ہے اور ٹامپاس کرنے کے لیے شادی سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں..... جلدی سے عمر کٹ جاتی ہے اور پھر حلال رستہ ہے یہ۔

”شاید اصلی مقصد اپنے آپ کو تلاش کرنا ہو اتل۔“

”اپنے آپ کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے سرجی..... آپ جو ان ہیں صحت مند ہیں..... بڑی عزت ہے آپ کی ریڈیو سٹیشن پر آپ سیدھی سیدھی شادی کرا لیں ابھی آپ کا بیلنس ٹھیک نہیں..... دوپٹے یوں پر گاڑی چلے تو بیلنس ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تم..... تم مجھ سے شادی کرا لو اتل..... ہم دونوں۔“

یکدم اس کی آنکھوں سے آنسو بے تحاشا گرنے لگے اور اس کا چہرہ بوڑھی عورت کا ہو گیا وہ بیالیس سے بھی زیادہ کی لگنے لگی۔

”ہم دونوں سرجی؟..... ہم دونوں؟..... میرے جسم کا تو..... ہر قطرہ حرام پر پلا ہے سرجی میں اس لہو سے اب کوئی حلال زادہ پیدا نہیں کر سکتی..... میں..... میں نے کوشش کی تھی ایک بار شاہ کی سرجی..... پر..... چھوڑ دیں اس بات کو میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔“

وہ آنسو پونچھنے لگی۔

”تمہیں کبھی اپنا بیٹا یاد نہیں آتا۔“

”اپنا جو ہوا سرجی..... یاد کیسے نہ آئے؟ پر..... کیا کروں اسے یاد کر کے

.....آپ سرجی غلط عورتوں کے پیچھے وقت ضائع نہ کریں آپ کو چاہیے ایک باکرہ لڑکی طیب دوشیزہ..... جو آپ کو سیدھا راستہ دکھا سکے.....“
 ”باکرہ کیوں اہمل۔“

”آپ کو عورت کے دل کی تلاش ہے باکرہ جو ہوتی ہے سرجی اس کے پن سے ابھی کسی نے پانی نہیں پیا ہوتا..... وہ جسم اور دل ایک ہی جوئے میں ہارتی ہے آپ کے بڑے احسان ہیں مجھ پر خدا قسم میں اگر پہلے جیسی ہوتی تو فوراً آپ سے شادی کرا لیتی۔“

اس وقت وہ کسی مصری راہبہ کی طرح بڑی پر شکوت لگ رہی تھی۔
 ”یہ جسم اور دل بڑے پیری ہیں ایک دوسرے کے سرجی۔ جسم روند جائے تو دل کو بسنے نہیں دیتا..... ان دونوں کو کبھی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ جانے کیوں میرے مولا نے ان کو ایک ہی ہتھکڑی پہنا دی اور پتہ نہیں آپ سے میں کبھی کبھی کیسی باتیں کرنے لگتی ہوں.....؟ میں تو نہیں بولتی سرجی میرا تجربہ بولتا ہے مجھ کو تو باتیں کرنے کا ڈھنگ ہی نہیں۔“

باغ میں شام آگئی..... بہار کی خوشبوؤں سے بوجھل شام۔
 ہم دونوں کرگس جاتی کے شور دے تھے۔ کوئی بات ہمیں اندر ہی اندر آگاہ کر رہی تھی کہ وہ رابطہ جو اتنی دیر ہمارا بھار اٹھائے رہا اب ٹوٹنے والا ہے لیکن اس شام ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان لیا اسی لیے ہمیں کچھڑنے میں مشکل پیش نہ آئی۔ یہ ایک بات ہے کہ اس شام کے بعد ہم پھر نہیں ملے لیکن اگر ہم ملتے بھی رہتے ریڈیو سٹیشن میں سڑکوں پر بازاروں میں تو اس شام کے بعد ہر ملاقات اجنبیوں کی ملاقات ہوتی ہم ایسے ہی ملتے جیسے چیونٹیاں اپنے اپنے رزق کا دانہ منہ میں لیے راستے میں ایک دوسرے سے دعا سلام کرتی ہیں اور پھر اپنی اپنی راہ چلی جاتی ہیں نہ کوئی ماضی کی یاد..... نہ کسی فرد کا وعدہ۔

جب ہم دونوں باغ سے نکلے تو امتل نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا..... ”بس سرجی اب آپ جائیں۔“

”میں تمہیں گھر چھوڑ کر جاؤں گا۔“

”نہیں سرجی میں چلی جاؤں گی خود ہی۔“
”تمہیں

کہیں اور جانا ہے“

”ہاں جی۔“

”کہاں؟“

”بس پاس ہی سرجی بابا شاہ جمال کے۔“

”میں بھی چلتا ہوں..... تمہارے ساتھ“

وہ منہ پرے کر کے بولی..... ”ماں سرجی میں ضعیف الاعتقاد عورت ہوں آپ اب گھر جائیں بڑی دیر ہوئی ہے پہلے ہی..... میں نے آپ کا بڑا وقت ضائع کر دیا ہے۔“

”وہاں کیا دعا مانگو گی امتل سچ بتانا؟“

وہ ہونٹ چبا کر بولی..... ”شاید وہی دعا مانگو شاید ہی دعا..... جو بابا تر ت مراد کے مانگی تھی۔“

میں اس کی دعا بھول چکا تھا

”کون سی دعا؟“

”یہی سرجی..... زندگی تو کسی پیار کرنے والے کے سہارے گزری نہیں۔ اب موت تو کسی پیار کے ہاتھوں آئے..... موت تو حلال ہو میری۔“

وہ بغیر سلام دعا کے مڑ گئی اور جلدی جلدی سڑک کر اس کرنے لگی میں نے اس کے پیچھے جانا چاہا لیکن پہلی بار مجھے اس سے خوف سا آ گیا۔

دوسری صبح میں سیر تک سویا رہا۔ خواب میں رات کو کئی مرتبہ میں نے زنج کیے ہوئے مرنے، اونٹ اور بکرے دیکھے۔ رسی سے بندھے ہوئے جانور آسمان کی طرف منہ کر کے روتے نظر آئے..... کئی بار میں اتھا السر میں شدید جلن اور تکلیف تھی پچھلے دن کا سارا فاقہ تھا منہ میں تیزابی کیفیت تھی رات کو اٹھ کر میں نے ٹھنڈا پانی پینا چاہا تو مجھے یوں لگا جیسے نلکے سے فراٹے بھرتا تازہ لہو بہہ رہا ہے سناٹے اور اندھیرے کے باوجود سارے ساندہ گلاں سے کتوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

اعصابی سکون کی گولیاں کھا کر بہت دیر میں سویا تو صبح خلاف معمول صولت بھا بھی مجھے جگانے آگئیں پہلے انہوں نے ٹیبل پر چائے کاڑے رکھا پھر کرسی سے ٹکرائیں اور اندر غسانخانے میں جا کر انہوں نے نلکے چھوڑ دیا۔ پھر اندر کھانے والی سیڑھیوں پر کھڑی ہو کر مسعود اور فرید کو ڈانٹتی رہیں جہمیں جاگ گیا تو وہ بغل میں اخبار دبائے چائے کے پاس کھڑی تھیں۔

”بڑی خراب ہے آج اخبار میں۔“

میں سمجھا ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی۔

”کیا.....“ میں نے حواس مجتمع کر کے سوال کیا۔

”کسی اتھل عزیز طوائف کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا کل رات۔“

میں ہڑا بڑا کراٹھا۔

”کون..... کیا..... کس کا قتل.....“

”ایک حرام کھانے والی کا..... اور کس کا۔“

بھا بھی نے کچھ جواب نہ دیا اخبار میرے بستر پر بھینکا اور سیڑھیوں کی طرف چلی گئیں۔

اخبار میں اتھل کی پرانی تصویر چھپی تھی جس میں اس نے دو چوٹیاں کر رکھی تھیں

اس کے ساتھ اس کی بیٹی کی تصویر تھی لڑکے کی شکل ماں سے مشابہ تھی وہی نتھنے وہی ہونٹ وہی آنکھیں چوکھتے کے اوپر جلی حروف میں رقم تھا.....مجنوط الحواس بیٹے نے غیرت میں آکر ماں کو قتل کر دیا۔

مجھ میں ساری خبر پڑھنے کی ہمت نہ تھی میں نے اخبار تہہ کیا اور اسے عابدہ کے سلپر کے پاس جہاں سیمی کا خوشبودار رومال بھی پڑا تھا رکھ دیا پھر میں نیچے گیا مجھے معلوم تھا کہ بھابھی بن کہے بغیر کسی سے پوچھے سارا معاملہ جانتی ہیں وہ باورچی خانے کے سامنے کھڑی اپنے دانتوں کو برش کر رہی تھیں۔

”بھابھی!“

”جی۔“

”آپ میری شادی کا انتظام کر دیں۔“

بھابھی نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں

”لیکن ایک شرط ہے“

”وہ کیا“

”لڑکی باکرہ ہونی چاہیئے“

”اچھا۔“

رات کے پچھلے پہر

موت کی آگاہی

جنگل سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے تنگ سرنگ میں بڑی تیز رفتار سے ہوا

داخل ہو رہی ہو۔

ٹولی ٹولی گروہ گروہ حلقہ بہ حلقہ موج در موج بھانت کے پرندے سوکھے تال کے

ارد گرد بڑے بڑے چھتھنارے درختوں پر جمع تھے بڑے پنکھوں والے پرندے تال

کے پاس شامیانوں کی طرح تنے بیٹھے تھے اونچے اونچے تیلوں پر جھاڑیوں میں ڈالیوں میں گچھے دار بیلوں سے ونداائے بیٹھے تھے لاسکا سے بھی چند پرندے سیاہ برقعے اوڑھے ہانپ رہے تھے رایوگرینڈ اور برازیل سے لمبی چونچ اور جھبرے پروں والے پروندے فیصلے کے انتظار میں تھے۔

سانپ بھی آج جرات کر کے پاتھی دو باگھاس میں چھپے پتھے تھے لیکن ان کی سنائیں سائیں سے گھاس سرسرانے لگا تھا پروندوں میں بات کا چرچہ تھا کہ دوسرے سب جگ کے آگاز سے پہلے ایک بار ایسا ہی اجلاس ہوا تھا لیکن اس کے بعد پروندوں کی برادری کبھی انبوهہ درانبوہ اس طرح اکٹھی نہ ہوئی اس مرتبہ جب تبت کی سطح مرتفع پر پروندوں کا کٹھ ہوا تھا تو پروندے انسان سے کلی طور پر مایوس ہو کر کسی اور سیارے میں ہجرت کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ تب متمدن دنیا پہلی بار تباہ ہوئی تھی انسان نے اپنی مکمل دیوانگی کا ثبوت دے کر اپنی ہی نسل کو دنیا سے مٹانے کی کوشش کی تھی..... نیویارک، ماسکو، پیرس، فرینک فرٹ لندن جیسے ہزاروں اور ان گنت شہر چشم زدن میں راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے ساری دنیا پر غبار کا ایک گھومتا غلاف چڑھا تھا آتش فشاں پہاڑ اور انسانی تخلیق کا لاوا ہاتھ میں ہاتھ دے ہر طرف بہتا تھا دور دور تک کسی براعظم پر سبزے کا نشان نہ تھا ملکوں ملکوں محشر بپا تھا تب سارے پروندے تبت کے مرتفع پر جمع ہوئے تھے اور یوں ہانپ رہے تھے جیسے دب دے کے مریض ہوں۔

انسان تمدن کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر قلابازی کھا گیا تھا اس نے اپنے ہی لوگوں کے لیے ایسے بم ایجاد کیے تھے جن سے نہ صرف انسان ہلاک ہوتا ہے بلکہ عورت کا رحم بچہ بنانے اور مرد کا عضو تناسل بچ بونے سے قاصر رہ جاتا ہے اس نے شہروں پر ایسے بم بو پھینکے کہ میٹھے پانیوں کے ایٹم پھٹ کر زرہیں تبدیل ہو گئے۔ پھر جس نے اس پانی سے چکھا وہ اولین گھونٹ کے ساتھ بان بحق ہوا نسل انسانی کے اکا دکا پانی

کی تلاش میں نئے بوجے سرگرداں ہوئے ان کی تلاش ایسی تھکا دینے والی تھی کہ قافلے کے لوگ ہر پڑاؤ پر گھٹتے گئے اور پڑوا کم ہوتے گئے۔..... یہ دوسرے ست جگ کے آغاز کا ذکر ہے تب پرندوں نے تبت کی اونچائی پر بیٹھ کر سوچا تھا کہ آؤ یہاں سے پرواز کریں اور کسی ایسے سیارے میں چل کر گھر بنائیں جہاں انسان کیدیوانگی سے پناہ ملے..... وہ کئی روز تک مشیت ایزدی کے انتظار میں رہے اور ہجرت نہ کر سکے..... حتیٰ کہ ان کا صبر دیکھ کر اللہ کی رضا سے تمام برائےظموں پر پھر سے ہاتھی دوباؤ گھاس اگ آئی۔ جنگل ہرے بھرے ہو گئے اور تال میٹھے پانیوں سے بھرنے لگے۔

اس وقت دوسری بار اس قدر تعداد میں پرندے جمر تھے اور چہ تھے مسئلہ پھر وہی درپیش تھا جنگل سے ایسی ہوک اٹھ رہی تھی جیسے زرد کھیتوں سے پھیکے چاند کی طرف ٹیڑی کی آواز لپک رہی ہو پھر سمیرغ نے تین بار اپنے تن کی بتی بجھائی اور گویا ہوا..... سرخاب تو غیر جانب دار ہے کھیتوں کھلیانوں کا نگہبان رزق کی خوشخبری دینے والا تجھے خدا کی قسم مختصر الفاظ میں بیان کر کہ اصل وجہ نزاع کیا ہے تاکہ جوئے مہمان آئے ہیں اصل حالات سے واقف ہوں۔

سرخاب نے سارا ماجرا مختصر الفاظ میں بیان کیا تو نا تجیر یا کی چیل ملکہ اٹھ کر بولی..... ”آقا جو کچھ سرخاب نے کہا ہے درست ہے لیکن ہماری التجا ہے کہ اس بار انسان کا حوالہ درمیان میں نہ آئے وہ سیاں ہو یا نقال وہ آئینہ ہو کہ کاربن پیپر۔ اس میں گھنٹے بڑھنے کی صلاحیت چاند سے بھی بڑھ کر ہو ہم کو اس کی تہہ ورتہہ سرشت سے کوئی سروکار نہیں ہم کو انسا سے کوئی غرض نہیں ہم جانوروں سے کیڑے مکوڑوں سے اس بحث کا پاک رکھنا چاہتے ہیں جل باسیوں کا حوالہ نہ دیا جائے ہم ہواؤں کے مسافر ہیں اور ہمارا اپنے رب سے معاہدہ ہے کہ ہم صرف رزق حلال کھائیں گے اور سرشت کی حد کو پار کر گئی ہے اور حرام رزق کھانے لگی ہے اس کا سارا دیوانہ پن اسی

سے نکالے ہیں پشتر اس کے کہ یہ بھی ہوا بایسیوں کو جنگل سے نیست و نابود کر دے اسے جنگل بدر کر دینا چاہیے۔“

گیدرڈ نے نہایت ادب سے تین بار ماتھے کو دم سے چھوا اور بولا..... ”شاید کچھلی بار ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ باوجودیکہ رزق حرام ہی سے رجبہ گدھ میں دیوانگی کے آثار پیدا ہوئے ہیں لیکن مسئلہ دراصل سرشت کا ہے..... اگر رجبہ گدھ کی سرشت میں حرام کھانا لکھا ہے تو پھر اس کے لیے حرام گناہ نہیں عین ثواب ہے..... لیکن اگر اس نے اپنی عقل سے رزق حرام کھانا سیکھا ہے تو پھر یہ ضروری اس کے لہو پر اثر انداز ہوگا اور دیوانگی پیدا کرے گا..... طے یہ کرنا ہے کہ کیا رزق حرام گدھ کی سرشت کا حصہ ہے کہ اس کی اپنی تجویز کا رد عمل۔“

اب چیلوں کی ملکہ برافر وختہ ہو کر اٹھیا اور بولی..... دیکھ دوست گیدرڈ ہم اللہ کی عطا کردہ سرشت سے جنگ نہیں کر رہے۔ اس جنگل میں جہاں ڈسنے والا سانت رہتا ہے وہیں مٹی رنگا مینڈک بھہ پھدکتا پھرتا ہے چنگھاڑنے والی شیرنی اور اس کے روع سے بھاگنے والی نیلی گائے

بھی یہیں رہتی ہے ہم جنگل والوں کا سادی سے کوئی بیر نہیں جو ہمارے سرشت کا حصہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں ہمارے سرشت میں بدی کا عنصر ابلیس کی تخلیق نہیں روز ازل سے بنانے والے نے کسی مصلحت کے پیش نظر ہم میں کچھ ایسے وصف رکھے ہیں جو ہمیں تحفظ سے تو آشنا کرتے ہیں لیکن ظلم پر آمادہ نہیں کر سکتے جنگل میں کوئی سانت سے نہیں لڑتا پھنکارنا ڈھنا اس کی سرشت ہے چیتے سے کسی کا بیر نہیں کیونکہ بنانے والے نے اسے اسی ڈھب سے بنایا ہے لیکن گدھ نے اپنی سرشت خود بدلی ہے پہلے یہ بھی شکار کرنے کو اپنی زندگی کا طرہ امتیاز سمجھتا تھا پھر اس نے اپنی عقل سے اپنی تجویز سے اپنی سرشت میں ترمیم کی اور حرام کھانے کا مرتکب ہوا بول اعتراف کر ہم جنوں انسانوں فرشتوں، جانوروں پر وندوں کی سرشت کے

خلاف نہیں اس رزق حرام کے خلاف ہیں جو اپنی عقل سے کھایا جاتا ہے جس کی منہا ہی موجود ہوتی ہے اور جو ہر بن کر لہو میں پھرتا ہے اور دیوانگی باعث ہوتا ہے۔ ایک سانپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا..... ”دیکھو یہ ہمارا ذکر ہے یہ موقع ہے صفائی کا کچھ کہہ گزرو۔“

سانپوں کے راجہ نے آہستہ سے جواب دے..... ”چپ رہو پہلے ہی ہم پر بہت بڑا الزام ہے کہ ہم نے اماں حوا کے ورغلا یا ان کو سوست سے زیادہ بدی پر آمادہ کیا۔ حالانکہ ان کے نفس نے انہیں دھوکا دیا ان کی سرشت میں تو پہلے سے سوچ کی دو شکلیں موجود تھیں اگر انب کی سرشت میں شروع سے دوسرا ستہ نہ ہوتے تو وہ میری بات کیونکہ مانیتے؟..... چپ رہو اور یہاں آنے کا راز مت کھولو۔“

سرخ برادری کو مخاطب کیا اور کڑک کر بولا..... کیا یہ شان عبودیت کے خلاف نہیں کہ کوئی ذی روح اپنی عقل و تجویز سے اپنی سرشت میں نئے رنگ کا اضافہ کرے کائنات کی ہر چیز سے گواہی لے پتھے کے حکم سے پہار ہوئے اور کبھی سفر کے مرتکب نے ہوئے جانوروں کی ان کی جبلت کی پاسبانی رہنے کا حکم تھا سو وہ رہے۔..... تو نے انسان کی نقالی کیوں کی؟ کیا یہ تیری کم عقلی نہ تھی کہ تو نے اپنی عقل سے رزق حرام کھایا؟۔

”تھی..... تھی.....“ گدھ نے زمین پر سر رکھ کر کہا۔

تیبہ کی ٹولی بھاگنے والی تھی لیکن پاس ہی بیٹھے ہوئے مہر لاٹ نے ہمت دلائی اور کہا..... ”ہم کم عقل ہیں آقا ہم کو تو سمجھ نہیں آئی کہ رزق حرام سے دیوانہ پن کیونکر پیدا ہے ہم سرشت کی بات تک کیونکر پہنچیں۔“

عقاب کی ٹولی سے ایک پاپائے روم اٹھا..... ”سن مہر لاٹ! رزق دو طوکا ہوتا ہے ایک رزق وہ ہے جو جسم کا بندھن ہے اور دوسرا رزق وہ ہے جو روح کی توانائی کا باعث بنتا ہے جیسے پانی خوراک حدت ہوا..... جسم کو پالنے کا وسیلہ ہیں اسی طرح

عبادت و شوق قربانی روح کی استقامت کی غذا ہیں۔ بتا گدھ جاتی کے راجہ کہ تو نے جسم کا رزق حرام کھایا کہ روح کا..... بتا وہ رزق کون سا تھا جس سے تیرے جرثومہ ٹوٹ کر پاگل پن کا شکار ہوئے؟“

اب چیل ملکہ اٹھی اور چلا کر بولی..... ”ان بیکار باتوں میں الجھنا تضییعِ اوقات ہے فاضلِ حج جانتا ہے کہ جسم کا رزق بالآخر روح کو لگتا ہے اور روح کا رزق آخر کار جسم کا حصہ ہو کر رہتا ہے رزق حرام چاہے بدنی ہو یا روحی دیوانہ پن کا باعث ہوتا ہے۔“

گیدڑ یہ بات سن کر بہت متاثر ہوا اور تالی بجا کر بولا..... ”خوب چیل ملکہ یہ بات طے ہے کہ رزق چاہے بیرونی ہو یا اندرونی اگر حرام ہے تو ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنتا ہے لیکن بات وہیں ہے کہ کیا گدھ اپنی شرکت کے خلاف رزق حرام کھاتا ہے۔“

مہر لاٹ نے پھر سوال کیا..... ”یہ کیا بحث ہے رزق حرام کا دیوانگی سے کیا تعلق؟“

شاہیں بچے اٹھے اور خفگی سے بولے..... ”کیا تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ پاک رزق سے لہو میں ایسی مثبت لہریں ہوتی ہیں جن سے روح میں کوئی مغارت پیدا نہیں ہوتی۔ جس وقت حلال رزق پیٹے میں پہنچتا ہے تو انسان رب کی ثنا اور اس کے احکامات کا خود بخود پابند ہو جاتا ہے لیکن جب رزق حرام جسم کے اندر داخل ہوتا ہے تو منفی لہروں کا جال لہو میں پھیل جایا ہے اور ہر جرثومہ کی زندگی منفی طور پر متاثر ہوتی ہے اور وہ وقت سے پہلے ٹوٹنے لگتا ہے..... اس گدھ سے پوچھتا جائے کہ یہ اس حقیقت سے واقف نہ تھا؟“

”تھا..... تھا..... تھا.....“ راجہ گدھ چلایا۔

چیل برادری سے آواز آئی..... ”لمبے بکھیڑوں میں پڑنے سے حاصل؟ ہم جانتے ہیں کہ گدھ پہلے طبیب رزق کھاتا تھا پھر یہ اپنی عقل سے حرام کی طرف

راغب ہوا.....“

تیبو کی ٹولی سے ایک پرندہ بولا..... ”آقا! ہم بحث کو الجھانا نہیں چاہتے صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسان نے اپنی سرشت کیونکر بسلی اور وہ رزق حرام کی طرف کیسے مڑ گیا؟“

اب ایک مریل سے بطنخ بولی..... ”ہم کو پتہ چلا ہے کہ انسان کی سرشت ٹھہرے ہوئے پانیوں کی مانند ہے جس میں ہر قسم کا عکس پڑتا ہے درختوں میں رہے تو درختوں جیسا پہاڑوں میں رہے تو پہاڑوں جیسا اٹل مضبوط، جانوروں میں بسیرا کرے تو ان ہی کی مانند حیوان..... اچھوں کی صحبت ملے تو فرشتہ رزیلوں کا رنگ چڑھے تو شیطان!“

نبیلی چونچ والا ست رزگا پرندہ اچانک بولا..... ”تو انسان سیال ہوا کبھی شیر سا بہادر کبھی اونٹ سا کینہ ور..... کبھی فاخہ کی طرح معصوم کبھی پتے کی طرح چکنا اور کبھی پھول جیسا گل رنگ..... لے یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی..... لے دے کے انسان تو ارد گرد کا پابند ہو گیا۔“

”انسان تلاش ہے..... وحدت کی کثرت میں تلاش۔“ ایک طرف سے آواز آئی ”میں صاحبو انسان تضاد ہے آگ پانی کے میل سے بنا ہے۔“

”آقا! انسان نہ رزق حرام کی وجہ سے دیوانہ ہوا ہے نہ اس طاقت کی وجہ سے جس کا ذکر نجد کی مینا نے کیا تھا بلکہ تضاد کے ہاتھوں دیوانہ ہوا ہے..... دن کے ساتھ رات ہے..... زندگی کے ساتھ موت..... شمال کے مخالف جنوب..... لیکن بچارے انسان کے اندر ہر وقت نیکی بدی کی جنگ ہوتی رہتی ہے..... اگر اس کے اندر جنگ ساکت ہو گئی تو خدا ہار جائے گا۔“

یہ کفر کے کلمات سن کر سارے پرندے سنائے میں آئے اور آواز کا تعاقب کرنے لگے۔

”بزدلوں کی طرح بات نہ کر سامنے آ۔“

نافسورس کی جی سے آواز آئی۔

ایک چھوٹا سا کھٹ بڑھی باہر نکلا اور زمین چوم کر بولا..... ”پہلے آقا انسان کی سرشت میں بدی نہ تھی۔ وہ بھی فرشتوں کی طرح نیک اور آئینے کی طرح پاک تھا لیکن ایک روز ابلیس نے موقعہ پا کر اس میں جھانکا اس لمحے حضرت آدم کے اندر حق و باطل کی جنگ شروع ہوئی اگر اللہ اپنے اذن سے اس عکس کو نکال دیتا جو آدم کے دل میں پڑ چکا تھا تو بے انصاف کہلاتا اس لیے اس نے ابلیس کو مہلت دی اور انسان کو ترغیب دی کہ وہ اپنا آئینہ صاف کر لے اس وقت سے آج تک حق باطل کی جنگ جاری ہے جنگ کا میدان“ انسان ہے..... اللہ کی کل کائنات میں صرف انسان ایسا ہے جو اپنی سرشت بدلنے پر قادر ہے اپنے آئینے کو صاف کر سکتا ہے جیت اللہ کی ہوگی لیکن موقع ابلیس کر برابر کافراہم کیا جائے گا آپ دیکھتے نہیں آقا اس جنگ کی وجہ سے انسان کی کیا حالت ہوئی..... اگر وہ دیوانہ ہے تو اس تضاد کے ہاتھوں..... فرزانہ ہے تو اسی تضاد کی وجہ سے سرخاب اٹھا اور مودب لہجے میں بولا..... ”آقا یہ بحث لمبی ہے انسان کی سرشت کو یا تو خدا سمجھتا ہے یا ابلیس..... انسان تو ابھی خود اپنی سرشت کو سمجھ نہیں پاتا تو جانتا ہے کہ انسان کا خمیر نیکی سے اٹھا ہے چور اچکا ڈاکو کو بد معاش ساری عمر بدی کمائے ایک توبہ کے وضو سے اس کی بدی دھل سکتی ہے بدی اس کے آئینے میں فقط ابلیس کے عکس کی طرح رہتی ہے عکس ڈالنے والا نہ ہو تو آئینہ پاک رہتا ہے لیکن پھر یہ بات لمبی ہے۔“

اتنے میں ایک بوڑھا کوا اٹھا اور کہنے لگا..... ”میں انسانوں کے پاس رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ ان کی دیوانگی کا ان کی سرشت بھی ایک..... ایک انسان کو خالق نے اس طور پر بنایا ہے کہ اس کا وجود تو ایک ہے لیکن اس کی روح، سائیکی سرشت عقل قلب جانے کیا کیا کچھ کئی رنگ کے ہیں وہ کسی کے ساتھ شیر ہے کسی کے ساتھ بکری

کسی کے ساتھ سانپ بن کر رہتا ہے تو کسی کے لیے کینچن دے بدتر ہے بدی اور نیکی روز ازل سے اس کے اندر دو پانیوں کی طرح رہتی ہے ساتھ ساتھ ملی جلی علیحدہ علیحدہ جیسے دل کے تیسرے خانے میں صاف اور گندہ لہو ساتھ ساتھ چلتا ہے..... وہ تو ہمیشہ ڈھلتا ہے ہمیشہ بدلتا ہے کہیں قیام نہیں کہیں قرار نہیں وہ ایک زندگی میں ایک وجود میں ایک عمر میں لاتعداد روحیں ان گنت تجربات اور بے حساب نشوونما کا حامل ہوتا ہے اس لیے افراد مرتے ہیں انسان مسلسل رہتا ہے ہم جنگل والے سیدھے ہیں ہماری سرشت طے ہے ہم اس تہہ در تہہ کو نہیں سمجھ سکتے ہمیں انسان کے پرت کھولنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا..... وہ رزق حرام سے دیوانہ ہو کہ تضاد سے عشق لا حاصل سے کہ تلاش بے سود سے ہم جس کی سرشت کو نہیں سمجھ سکتے اس کی دیوانگی کا بھید ہم پر کیا کھلے گا..... بہتر ہے کہ ہم اس باب کو بند کر کے صرف رجبہ گدھ کے مسئلے پر توجہ دیں۔“

اس وقت ایک مینا اٹھی اور بولی..... ”انسان کے ساتھ میری پہچان بھی پرانی ہے..... اگر تفضیع اوقات نہ ہو تو کچھ عرض کروں۔“

چیل ٹولی سے نفی کی آوازیں اٹھی لیکن سرخاب نے اجازت دے دی۔
 مینا گویا ہوئی..... ”میں جانتی ہوں آقا! انسان خود اپنی وحدت کی تلاش میں ہے اور وہ اپنی وحدت کو اس لیے تلاش نہیں کر سکتا کہ وہ ساری زندگی آرزوؤں کے جنگل میں سے گزرتا ہے آرزوؤں کے جنگل کی سرشت کا یہ عالم ہے جیسے ایک آئینہ ٹوٹ کر ہر ٹکڑے میں ایک ہی عکس دینے لگے..... جن انسان ایسے جنگل سے گزرتا ہے آقا تو باوجودیکہ ہر ٹکڑے میں اس کا اپنا عکس ہوتا ہے لیکن ہزار ہا آئینے کے ٹکڑے اسے اپنے وحدت سے ملنے نہیں دیتے اس جنگل کا عجیب شعور ہے یہاں آرزو کی ناکامی ہو کہ آرزو کی بار آوری..... کثرت موجود رہتی ہے اسی کثرت کی وجہ سے انسان کبھی اپنی وحدت سے دوچار نہیں ہو سکتا۔“

مجھے ایک واقعہ پیش آیا میں وہ بیان کرتی ہوں شاید انسان کی سرشت کا کچھ سراغ اس سے لگے آج سے دو ہزار سال پہلے ساپرس کے ملک میں ایک بادشاہ رہتا تھا وہ ہفت اقلیم کا مالک تھا صبح خیزی اس کی عادت تھی کجروم اپنے براق برق رفتار گھوڑے پر سوار ہوتا اور جنگل کے باسیوں کے ملنے چلا جاتا اسے جانوروں کی بولی سے شغف تھا دن کا وقت وہ راج پاٹ کے کاموں بسر کرتا لیکن دوپہر ڈھلتے ہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہ پھر پہاڑوں میں نکل جاتا اور پہاڑوں سے گفتگو کرتا رہتا۔ دن ڈھلے گھر آتا تو تھکا ہارا ایک ایسے کمرے میں استراحت کرتا جس کی دیواریں چھت فرش تمام چھوٹے چھوٹے آئینوں سے مزین تھے۔“

وہ حسن میں اس قدر لاثانی تھا کہ آدھی رات کو میں نے اس کے بستر کے گرد ملائکہ کو طواف کرتے دیکھا ہے۔ اسے سحر آتا تھا آرزوؤں کی تکمیل کا سحر ادھر خواہش کا بیج اس کے دل میں پڑتا ادھر وہ اس سحر کی بدولت حصول آرزو میں کامیاب ہو جاتا۔

اس کے حرم میں دس ہزار پری جمال دوشیزائیں تھیں۔

اس کے خزانے نے بارہ سالوں میں بھی نہ دیکھے جاسکتے تھے۔

اسے آنے والے واقعات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا۔

وہ چہرے سے دل کا حال معلوم کرنے میں لاجواب تھا۔

اسے جڑی پوٹیوں کا مکمل علم حاصل تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہونا چھوڑ دیا اور سحر خیزی کی عادت ترک کر دی۔ پھر اس نے اپنے برق رفتار گھوڑے کو بھی ایک اصطبل کے حوالے کر دیا اور خود اپنے آئینے خانے میں اکیلا رہنے لگا۔ چونکہ میں آئینے خانے میں مثل قطب نما رہتی تھی اس لیے سارا سارا دن اسے ملول دیکھ کر میرا دل پھٹنے لگتا میں اسے دور دراز کے ملکوں میں بسنے والی خوبصورت دوشیزاؤں کے جمال کی باتیں

سناتی لیکن وہ کروٹ بدل کر کہتا..... ”مجھ سے حسن ناپائیدار کی بات نہ کرنا مینا۔ کبھی تو نے ایسی عورت دیکھی جو بوڑھی نہ ہوئی۔؟“

میں اس سے دوسرے ملکوں کے عجائبات کی بات کرتی تو وہ کہتا..... ”عجائبات وقتی کرشمہ ہیں ان کو مسلسل دیکھو تو عجائبات نہیں رہتے!“

رفتہ رفتہ وہ ہر طرح کے عیش سے متغیر رہنے لگا ہفتے میں ایک بار جو کی روٹی کھاتا قلیل الطعام، قلیل الانام قلیل النوام اپنے پر ایسی پابندیوں کا شکنجہ کس لیا کہ اس کی رعایا کا مفلوک الحال فقیر بھی حالت میں اس سے بہتر ہو گیا۔

ایک رات جب پورا چاند چڑھا اور ہر آئینے میں بادشاہ کی صورت منعکس ہوئی۔ میں نے جرات کر کے اس سے پوچھا..... ”اے شاہ سچ بتا تجھے کیا ہوا ہے؟“ کہنے لگا..... ”اے مینا! میں اپنی رنگارنگی سے اکتا گیا ہوا آرزو کی ناکامی ایک حجاب ہے لیکن آرزو کی بار آوری دوسری قسم کا ایک پردہ ہے میں اپنے میں دو راستے دیکھنا نہیں چاہتا میں اس قدر تنہا ہونا چاہتا ہوں کہ مجھ میں صرف ایک رنگ رہ جائے دیکھتی نہیں کہ میں نے ہر ذی روح کو چھوڑ دیا نباتات جمادات مجھ سے چھوٹ گئے میں نے بدی کی ساری بنیر اکھاڑ پھینکی تاکہ نیکی کا خاکستر رنگ میری ذات کو ایک رنگ میں رنگ دے میں اپنی تنہائی کی ایسی اکائی تلاش کر رہا ہوں جہاں بنانے والے کو مجھ پر ترس آجائے اور پھر میری وحدت کی پیچا رگی کو وہ اپنی وحدت میں سمو لے گا..... میں اپنی وحدت کی تلاش میں ہوں تاکہ اس کی وحدت کی پہچان سکون جو ہمیشہ تنہا رہتا ہے اور جسے زوال نہیں۔“

دوسری صبح جب اس کا برق رفتار گھوڑا کھڑکی کے پاس آ کر ہنہنایا تو میری آنکھ کھلی وہ مرچکا تھا اس نے اپنے خنجر سے خودکشی کر لی تھی ہر آئینے میں ایک خنجر کا عکس موجود تھا لیکن کسی شیشے میں اس صاحب جمال کا عکس نہ تھا اس کی خودکشی..... خودکشی جو دیوانگی کی دوسری شکل ہے..... کیا اس کی سرشت کی وجہ سے نہ تھی۔ کیا اس دیوانگی

کا تعلق اس تلاش سے نہ تھا جو کثرت میں وحدت کی تلاش کرتی ہے؟۔

اس وقت چیلوں کے ہراول دستے میں دھماکہ خیز شور ہوا۔

ایک بوڑھی لقوہ زدہ چیل نے اٹھ کر کہا: ”آقا! ہم ان مباحثوں سے بد دل ہو چکے ہیں جو گھوم پھر کر انسان کی سرشت کے گرد گھومتے ہیں تجھ کو اگر انصاف کرنا ہو تو کرورنہ ہم چلے..... تمام گدھ جاتی منقار زیر پر بیٹھے تھے۔“

”بول راجی گدھ..... کیا تجھ پر جو الزام لگا ہے درست ہے۔“

”الزام درست ہے لیکن میں خود نہیں جانتا کہ مجھ میں دیوانگی کے آثار پہلے پیدا ہوئے کہ میں نے رزق حرام کی طرف پہلے قدم اٹھایا..... پتہ نہیں مردار کھانے سے میری روح ملوث ہوئی کہ میری روح کو گھن لگ چکا تھا اس لیے میں نے رزق حرام کھایا؟۔“

چیل ملکہ چلائی: ”ہم اسے برسوں سے دیکھ رہے ہیں اس کا دیوانہ پن بڑھ رہا ہے..... تو ہمیں باتوں میں نہ بہلا ہم سب جانتے ہیں ایک دن یہ تمام پرندوں کو نیست و نابود کر دے گا۔“

گیدڑ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ صلح کے انداز میں پھرا کر کہا: ”حضور! یہ بات طے کیجئے کہ کیا راجہ گدھ اپنی سرشت سے مجبور ہو کر رزق حرام کھاتا ہے کہ یہ اس کی اپنی اختراع ہے اپنی عقل کا کرشمہ؟۔“

”راجہ گدھ سے پوچھا جائے.....“ فاسفورس کی جی تین بار بجھی۔“

سرخاب نے راجہ گدھ کو مخاطب کر کے پوچھا: ”کیا تو بتا سکتا ہے کہ اولاتیری سرشت کیا تھی۔“

راجہ گدھ نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

”آقا! یہ اپنی اولین سرشت کو بھول چکا ہے!“ گیدڑ نے التجا کی۔

سرخاب نے سخت لہجے میں سوال کیا: ”تو یہ بتا کیا تجھ میں انسان کی طرح

تضاد کا نمیر موجود ہے؟“

”نہیں..... فاضل سرخاب نہیں۔“

”کیا عشق لا حاصل کے آب حیات سے تجھے گوندھا گیا۔“

”نہیں بڑی شان والے میری سرشت میں عشق کا عرفان شامل نہیں۔“

”تو کیا تو تھکا دینے والی جستجو کا حامل ہے؟ کیا تیری سرشت میں ایسی تلاش ہے

جو زمان و مکان سے پرے کھینچتی ہے ایسی تلاش جو کثرت میں وحدت کی متلاشی رہتی

ہے۔“

”کیا تو بے نشان منزلوں کی تلاش میں دیوانہ ہوا؟۔“

”نہیں..... کھلیانوں کے پاسبان ایسا نہیں۔ میری سرشت کو تلاش سے کوئی

سروکار نہیں۔“

”پھر یہ بات طے ہے کہ تو مردار کھانے کے باعث دیوانہ گردانا گیا؟۔“

”شاید۔“

فاسفورس کی باطنی روشنی تین بار گل ہوئی اور سمیرغ کی گرجدار آواز آئی..... ”رلجہ

گدھ الزام تجھ پر ثابت ہوا ہی چاہتا ہے تجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہو تو کہہ۔“

گدھ مردار کھاتے ہیں

وہ جانے زیست کے کس موڑ پر رزق حرام سے شناسا ہو چکے تھے۔

ان کی اڑانیں شاہیں سے بھی زیادہ تھکا دینے والی تھیں۔ گیدڑ نے تالی بجا کر کہا

..... ”اس کی صفائی میں جو کچھ کہوں گا میں کہوں گا آقا!“

لیکن گدھ نے اپنی گردن زمین پر رکھ کر عرض کی..... ”نہیں اپنی صفائی میں جو

کہوں گا میں خود کہوں گا۔“

سرخاب نے زور سے سانس لے کر کہا..... ”دیکھ رلجہ گدھ الزام کی نوعیت بدل

چکی ہے اگر تو نے کوئی تشفی آمیز جواب دے سکا بری الذمہ ہو جائے گا اگر تیرے

جواب سے حاضرین کی تسلی نہ ہو سکی تو تجھے جنگل بدر کا حکم سننا ہوگا۔

بتا بول..... کیا تو نے اپنے ماحول سے خائف ہو کر اپنے آپ کو بدلا..... کیا تو نے انسان کی تقلید میں اپنی سرشت بدلی؟..... کیا..... وجہ تھی کہ تو نے اللہ کی دی ہوئی سرشت پر قانع نہ رہا اور مردار کھانے پر مجبور ہوا؟۔“

گیدڑ نے راجہ گدھ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ آنکھیں بند کر کے گویا ہوا..... ”آقا میں بھی تمام پرندوں کی طرح یکسر معصوم تھا اور اپنی سرشت بھرتیگی اور بدی کے سہارے زندگی بسر کر رہا تھا۔ میرے اندر اپنے متعلق کوئی شبہ موجود تھا نہ اپنے گرد و پیش کے متعلق کوئی تجسس لیکن جس درخت پر بیٹھ کر میں شکار کے لیے نگاہیں دوڑایا کرتا اس کے نیچے ایک جوگی نے آکر بسیرا کر لیا اس کے تن پر بھبھوت کے علاوہ کوئی لباس نہ تھا رفتہ رفتہ اس کی ڈاڑھی اس قدر لمبی ہو گئی کہ وہ برگد کی جڑوں میں بیٹھا درخت کا ایک حصہ نظر آنے لگا..... وہ سارا دن نگاہیں آسمان پر جمائے دیکھتا رہتا میں اس کی شخصیت سے اس درجہ مغلوب ہوا کہ میں نے اپنی تھکا دینے والی اڑانیں ترک کت دیں اور پہروں اسے دیکھنے کا کسب اختیار کیا

ایک روز اس نے مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں بغیر آواز کے آپس میں باتیں کرنے لگے اب ہمارا معمول ہو گیا کہ ہم دونوں روز کچھ دیر کے لیے یکجا ہوتے۔ وہ مجھے زندگی کے کئی بھید بتاتا اور میں اسے جنگل کی زندگی کے راز سمجھاتا وہ آرزو کے جنگل سے نکل تو آیا تھا لیکن تمام آرزوؤں سے چھٹکارا پالینے کے بعد اب وہ ابدیت کے خواب دیکھنے لگا تھا وہ خدا کی طرح مستقل ہونا چاہتا تھا ہر صبح جب موت اپنے ترشول لے کر آتی اور برگد کے درخت کے سامنے ترشول پر اپنا سرخ ہاتھ رکھ کر پوچھتی..... چلتا ہے کل آؤ تو جوگی ہنسنے لگتا اور کہتا..... جا اپنا کام کر تو مجھے کیا مارے گی۔“

جب موت بہت اصرار کرتی تو جوگی کہتا جسم لے جاتی ہے تو لے جا!

موت کچھ اور تقاضے کرتی۔

میں اس کی یہ جنگ روز دیکھتا۔

رفتہ رفتہ موت کے آنے پر جوگی چھپنے لگا۔ جب وہ چلی جاتی تو جوگی مجھے بلاتا۔ ہم دونوں بغیر آواز نکالے گھنٹوں باتیں کرتے۔ ان باتوں میں وہ مجھ سے ہر روز ایک بات ضرور کہتا کہ اس کی روح ہمیشہ رہے گی موس اس کی روح نہیں لے جاسکتی۔

ایک روز صبح کے وقت جب سورج ابھی اچھی طرح دریا سے اٹھنا کر کے نہ نکلا تھا جوگی برگد کے سرخت سے لٹکا ہوا تھا اس نے برگد کی ٹکٹی جڑ سے پھندا لے کر جان موت کے سپرد کر دی تھی۔ میں اونچی شاخوں سے اتر اور میں نے اسے اس گروہ سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میری چونچ اور پنچے گروہ کھولنے میں مصروف تھے جب اس کے لہو کی پتلی سی دھا میرے حلق میں داخل ہوئی۔

آدام زاد کا لہو۔!

”جوگی درخت سے اپنے بوجھ سمیت زمین پر جا گرا ایسے کہ میری چونچ اس کی گردن میں پیوست تھی اس وقت میری سرشت بدلی آقا! سوائے انسان کے کوئی موت سے خائف نہیں پہلی بار میں موت سے ڈرا..... اس روز کے بعد میں اونچے درختوں پر موت سے چھپ کر رہتا ہوں لیکن موت سے میرا رشتہ کچھ ایسے منسلک ہو گیا ہے کہ میرے جسم میں تمام لہو مردار جسم سے بنتا ہے میں موت کا دشمن اور موت ہی کا پروردہ ہوں۔“

”پھر؟..... پھر؟.....“ سارا جنگل گونجا۔

”اس وقفے کے بعد میری آنے والی نسلیں حرام کھانے لگیں میں دریائے نیل کے شمال میں آباد ہو گیا۔ مجھ سے پیدا ہونے والوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جس میں ایک بھی نہ باقی نہ رہا۔ وشتے بھوک کو انہوں نے شعوری طور پر زندہ کیسے نکال

دیا۔ اس علاقے میں اڑنے والی مادہ گدھ جب بچہ پیدا کرنا چاہتی تھی تو ہوا میں دور
 تک اڑتی اڑھی اڑان میں واپس لوٹتے وقت خود بخود اس کا رحم کھل جاتا اور وہ ہوا
 اسے ایسے بار آور ہوتی جیسے درخت پورے پوا سے پولن لے کر بار آور ہوتے ہیں
 ہماری سرشت میں اس کے بعد تبدیلیاں آتی رہیں..... کچھ کا علم رہا کچھ تبدیلیوں کو
 ہم نے اپنی ازلی سرشت کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ ہم پر دیوانگی کے دورے
 پڑنے لگے۔ ہم اب موت سے گریزاں لیکن موت ہی کی تلاش میں رہتے ہیں مردار
 جانوروں سے زندگی کی حدت حاصل کرتے ہیں چند پرند کوئی موت سے آگاہ نہیں
 صرف انسان موت سے خائف رہتا ہے..... موت! اس کے لیے ایک حقیقت
 ہے آقا..... بچپن میں وہ باقی ذی روح کی طرح موت سے آشنا نہیں ہوتا لیکن جوں
 جوں وقت گزرتا ہے اور اس میں شعور پیدا ہوتا ہے وہ موت سے شناسا ہونے لگتا ہے
 پہلے چھوٹی چھوٹی حقیقتیں کھلتی ہیں ناپائیداری..... بے ثباتی..... تبدیلی
 موسم بدلتا ہے تو وہ اندر ہی اندر ڈرتا ہے..... بچپن گزرتا ہے تو وہ غیر شعوری طور
 پر پچھپن رہتا ہے..... محبوب کا رنگ روپ گہنا جائے تو وہ تلماتا ہے..... یہ تبدیلی
 ناپائیداری..... یہ احساس زیاں یہ سب چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہیں جو ایک منظر کی
 طرف کھلتی ہیں موت کا گھپ اندھیرا..... فنا کی آخری منزل..... جانور..... پرندے
 سب آزاد ہیں اس آرزو سے..... لیکن انسان اور میری جاتی کے لوگ صدیوں
 سے دیوانے ہیں آقا..... صدیوں سے..... اور اسی آگاہی کی وجہ سے انسان دیوانہ
 ہے وہ چھوٹی سی ناپائیدار زندگی میں ہمیشہ کی بقا چاہتا ہے..... کیا اس احساس کے
 ساتھ کوئی دیوانے پن سے بچ سکتا ہے.....“
 سارے میں خاموشی چھا گئی۔

گیدڑ نے دل ہلائی اور فخر سے بولا..... ”آقا! اب بات واضح ہے موت کا
 احساس انسان اور گدھ کی سرشت کا حصہ ہے جو فیصلے رب اور اس کی مخلوق کے

درمیان ہوں ان فیصلوں پر ہم قادر نہیں موت سے آگاہی کا مسئلہ گدھ اور اس کے رب کے درمیان ہے ہم کو اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کون جانے اصلی مسئلہ کیا ہے۔“

”لیکن یہ آگاہی..... یہ احساس اولاد اس کی سرشت میں نہ تھا۔؟“

رلجہ گدھ نے پر نام کے انداز میں پر جوڑے اور بولے..... ”چیل جاتی کی ملکہ دیکھ تو اپنے آپ کو شانت رکھ! اور میرے رب اور اس کی بنائی ہوئی سرشت کو سمجھنے کی کوشش نہ کر..... ہم تو خود ہجرت کرنے والوں میں ہیں ہمارے لیے قیام اور سفر میں فرق نہیں لیکن جانے سے پہلے ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔“

گیدڑ نے اونچے اونچے رو کر کہا..... ”یہ تو کیا کر رہا ہے رلجہ گدھ۔!“

رلجہ گدھ نے نظریں جھکا کر جواب دیا..... ”آقا! ہم جارہے ہیں ہرے بھرے جنگلوں کو چھوڑ کر اجڑے بنجر علاقوں کی طرف لیکن ایک غلط فہمی میں مت رہنا..... دیوانگی دو طور کی ہوتی ہے..... ایک دیوانہ پن وہ ہوتا ہے جس کی مختلف وجوہات بہان بیان کی گئیں..... جن کی وجہ سے حواس مختل ہو جاتے ہیں اور انسان کائنات کی ارذل ترین مخلوق بن جاتا ہے..... لیکن ایک دیوانگی وہ بھی ہے جو انسان کو ارفع و اعلیٰ بلند یوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی میں تنکا اوپر اٹھتا ہے..... پھر وہ عام لوگوں سے کٹتا جاتا ہے..... دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اوپر اوپر اور اوپر چلتا جاتا ہے..... حتیٰ کہ عرفان کی آخری منزلیں طے کرتا ہے..... عام لوگ اسے بھی پاگل سمجھتے ہیں..... لیکن انسان جب بھی ترقی کرتا ہے پاگل ہوتا ہے..... اس وقت وہ ایسے زہر آگیاں بم بنا رہا ہے جن سے یہ کرہ زمین تباہ ہو سکتی ہے..... یہ اس کے دیوانے پن کی دلیل ہے..... لیکن جب اس کرہ ارض کو بچانے کی ضرورت آئے گی۔ تب بھی ایک مقدس دینے آئے گا..... کاش ملکہ چیل کو میرے دیوانے پن پر اس قدر اعتراض نہ ہوتا تو ہم پونزدوں کے لیے نئی سمیتیں

نئے دروازے..... نئی جہتیں کھول دیتے ہمارا دیوانہ بھی عرفان کی ایک شکل ہے
“.....

رلجہ گدھ نے اپنی برادری کا حکم دیا اور وہ چپ چاپ پرے بادھ کر جنگل سے نکل گئے۔ آہستہ آہستہ تمام پرندے جنگل سے کھسکنے لگے۔ برگد کے درخت میں روشنی نہ رہی صرف دیر تک چیل برادری کے لوگ چپ چاپ تال میں بیٹھے رہے اور ہاتھی ڈوباؤ گھاس سے سانپوں کی سائیں سائیں فیڈ بیک ہوتی رہی۔

☆☆☆☆☆

بظاہر اہتل کی موت کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن دفتر کی کام کرنے کی..... اہلیت اچانک مجھ میں نہ رہی اور میں نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ ادھر بھا بھی صولت میرے لیے لڑکی تلاش کرنے میں مصروف تھیں ادھر میں کمرے اور کوٹھے کی چھت پر گھومتا رہتا بے مصرف بے ارادہ جاگتے میں سونا اور سوتے وقت چوکس رہنا میرا معمول ہو گیا۔ پہلے مجھے انہماک سے کتابیں پڑھنے کی عادت تھی اب مطالعہ عبث خیالات کے ہیر پھیر کا باعث ہوتا پہلے میں نے کئی ناول شروع کیے لیکن تعجیل کی وجہ سے میں آخری صفحے پہلے پڑھ لیتا، پھر باقی ناول پڑھنے میں لطف باقی نہ رہتا۔ سیاست، سوچیا لوجی اور سائیکالوجی کی کتابیں دل چسپ تھیں لیکن ان کے مطالعے میں دماغی توجہ کو دوڑنے پھرنے کی مہلت نہ ملتی۔ ایک ایک جملہ کئی کئی بار پڑھنا پڑتا پھر کچھ عرصہ میں نے جاسوسی کہانیوں سائنس فکشن پر بسر کیا۔ ان کی طلسماتی فضا بھی موافق نہ آئی جنس اور شادی سدہ محبت کے متعلق کتابوں سے بازار بھرے پڑے تھے۔ ان کتابوں میں وہی بات بار بار دوہرائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے دو چار کتابوں کے بعد دلچسپی کا گراف گرنے لگا۔ سفر نامے اور یادداشتیں وقت کٹی کا باعث ہوتیں اگر میں موجودہ سکتا مطالعے میں جو سب سے بڑی مشکل درپیش تھی وہ یہی تھی کہ کاغذ کی سطح پر الفاظ کے ساتھ ساتھ واقعات، چہرے، کیفیات، باتیں حتیٰ

کہ خوشبوئیں بھی تیر نے لگھیں دماغ کہیں کا کیس بھٹک جاتا اور ایک ایک صفحہ کئی کئی گھنٹوں میں ختم ہوتا۔ کتابوں کی پناہ جب تمام وجود کو مرکز پر لانے سے قاصر رہتی تو میں اٹھ کر باہر شہ نشین پر جا بیٹھتا کبھی کبھی آسمان کو تکتے مجھے آدھی رات ہو جاتی چاند راتوں میں مجھے لگتا جیسے میں ثقل مہتاب کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھ رہا ہوں بالکل سمندر کی لہروں جیسی بیتابی مجھ میں پیدا ہوا جاتی۔ چاند کی روشنی میرے وجود میں شبنم کی طرح اترتی اور میں محسوس کرتا کہ میرا جسم پتھر کی طرح ٹھنڈا رہنے لگا ہے ایسے میں بار بار میں اپنے ہاتھ پوؤں دیکھتا اس روشنی میں مجھے اپنے جسم پر قلعی کیے ہوئے برتن کا شبہ ہوتا۔ میری آرزو ہوتی کہ میں کسی سارس کی طرح پہروں ایک ہی ٹانگ پر کھڑا ہوں چپ چاپ!

جسمانی طور پر بھی میں نارمل نہ تھا سارا منہ کڑوا رہتا اور زبان پر کتھی رنگ کا لپ چڑھانظر آتا۔ دن کے وقت میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کچھ نہ کچھ کھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن سہ پہر کے قریب ایک غبار سا دماغ کو چڑھنے لگتا پہلے معدے میں جلن شروع ہوتی پھر جلن کا غبار بن کر سینے میں اوپر کی طرف اٹھنے لگتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ تھوڑی دیر بعد میرا دل بند ہو جائے گا کئی گولیاں اور مکچر میرے پاس جمع ہو گئے تھے اصلی دورہ رات کو ایک اور تین کے درمیانی وقفہ میں شروع ہوتا اس وقت میرے ہاتھ پاؤں میں پہلے چیونٹیاں سی چلتیں بعد میں سارے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اس لرزے کی وجہ سے میں رخ علیہ السلام ﷺ زدہ رہتا دن کے وقت بھی مجھے اس لرزے کا خوف متوحش کرنے کو کافی تھا میرے آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور کان باہر کو نکلے ہوئے دکھائی پڑتے۔ ہونٹوں کو دیکھتے رہنا میرا محبوب مشغلہ تھا ان کا کھر دراپن ہیئت ناخن ہاتھوں کی لکیریں میری دلچسپی کا باعث تھیں السمر کی تکلیف کے باعث میں بار بار ڈاکٹر سے ملتا ایک ڈاکٹر تسلی بخش ثابت نہ ہوتا تو پھر کسی اور ماہر کے پاس منتقل ہو جاتا حالانکہ میرے اندر غالباً یہ آرزو

تھی کہیں میں ٹھیک نہ ہو جاؤں میں anxiety اور withdrawal کی وجہ سے کبھی دوست نہ بنا سکا کالج کے دوست تو چھوٹ ہی چکے تھے اب ریڈیو سٹیشن سے بھی کوئی ملنے آ جاتا تو میں یہ بہانا بنا دیتا کہ میں گھر پر نہیں ہوں..... میں اندر سے یوں تنہا ہو چکا تھا جیسے کنویں میں اگے ہوئے خود رو پودے.....

اول تو میں ساری رات جاگ کر گزارنے کا خواہش مند رہتا۔ لیکن اگر ڈاکٹر کی دی ہوئی خواب آور دوائیوں سے نیند آ جاتی تو اچانک پسینے میں شرابور آدمی رات کو آنکھ کھل جاتی جو نہی آنکھ کھلتی مجھے محسوس ہوتا جیسے کمرے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی ہے اور میں آسنوگیس کے مرض میں مبتلا ہوں ایسے میں میرے پیچھے پڑے شدید گھٹن محسوس کرتے لیکن مجھے کھانسی نہ آتی فقط حلق کا پردہ بند ہونے لگتا میرا منہ ایسے سوکھ جاتا جیسے میں صحرائے گوبی میں سفر کر رہا ہوں ہڑا کر میں بستر چھوڑ دیتا گرمیوں کا آغاز تھا نلکے کے نیچے سر رکھ کر میں پانی کھول دیتا۔ جب ٹھنڈے پانی کی جھلار سے کچھ آفاقہ ہوتا تو پھر میں باہر کو ٹھٹھے پر جا کر شہ نشین پر جا بیٹھتا یہاں بھیگے سر کی وجہ سے ایک بار بلہا کر تھر تھری چھوٹ جاتی ایسا لرزہ طوری ہوتا کہ پاؤں کے انگوٹھے تک کانپتے نظر آتے کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ میں نیچے جا کر صولت بھا بھی سے اپنی حالت کہوں اور پھر ان کے گلے لگ کر اونچے اونچے رونے لگوں..... لیکن بھا بھی صولت اور بھائی مختار گڈی کاغز میں لپٹے رہتے تھے ایسے کہ نظر تو آتے لیکن ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔

نیند کا وقفہ گو کم تھا لیکن ان میں آنے والے خواب لاتعداد تھے۔ خوابوں میں نہ کبھی سیمی نظر آتی نہ عابدہ نہ اہمل..... بلکہ ایسی انجانی لڑکیاں جو کبھی کبھار ریڈیو سٹیشن پر نظر آتی تھیں جب بھی کوئی لڑکی مجھے خواب میں دکھائی دی اس کا دہن ہمیشہ پھٹا ہوا ہوتا جیسے ہاتھ ڈال کر مچھلی کے گلے پھڑے نکال لیے جائیں ایسے ہی لڑکی کی زبان دانتوں کے اندر سے نظر آتی بے آباد ریگستان اور ریگستانوں میں گھومنے والا

چھوٹا سا خرگوش بمباری سے تباہ شہر اور شہر میں بجنے والا اکلوتا سارن..... اندھے کنویں میں مصلوب کتا..... بنجر زمین میں مری ہوئی ویل مچھلی بغیر پائیلٹ کے اڑنے والا جہاز پانیوں کے بغیر کھدی ہوئی نہریں..... انسانی ڈھانچے قبروں کے اندر اور باہر ٹن ٹناٹن ٹوٹنے والے برتن..... اور ان سب خوابوں میں ہر جگہ خالی براؤں گدھے..... چپ چاپ دم سادھے..... شانت پرانت..... ٹولی درٹولی ہجرت کرتے ہوئے جنگل سے کوچ کرتے ہوئے۔

جاگنے کا سماں سونے کے وقت سے بھی نرالا تھا۔

صبح شیو کرتے وقت مجھے اپنی شکل یوں نظر آئی جیسے روشنی کی سفید کرن طیف منچوری میں سے نکل کر سر رنگوں میں بدل جاتی ہے سادہ شیشے میں میری شکل کئی چمکوں میں منتقل ہو جاتی کسی عکس میں مونچ غائب ہوتی۔ کسی حصے میں بابر بادشاہ جیسی ڈاڑھی نظر آتی کبھی کبھی اپو پروالے ہونٹ پر لپ سٹک لالیپ ہوتا۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی ہوتی کبھی کسی چہرے کی آنکھیں غائب ہوتیں آئینے میں نظر آنے والی صورتوں سے میں خوفزدہ ہو جاتا۔ پھر میں الماری کھول کر اندر دیکھا مجھے یقین تھا کہ الماری میں ٹرنک کے اندر گدے کے نیچے مجھ سے مشابہ کئی بونے رہتے ہیں اور کسی دن مجھے اکیلا پا کر وہ مجھ پر اچانک حملہ آور ہو جائیں گے۔

چونکہ میرا دن زیادہ تر گھر پر گزرتا اس لیے لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکتی۔ اسی دوران ایک دو خط ڈاکٹر سہیل کے آئے۔ وہ امریکہ میں دھڑا دھڑا تجربات علمی وسعت اور مغربی کلچر سیکھ رہا تھا۔ اس کے ایک خط میں درج تھا کہ وہ ایک ٹاپ لس بار پر گیا۔ لیکن ایسی جگہیں اتنی ہلا دینے والی ہوتیں ہیں کہ دوبارہ جانے کی ہمت نہیں ہوئی مجھے وہاں کا کلچر اور اپنے کلچر کے تقاب؛ میں کوئی دلچسپی نہ تھی امریکہ اخلاقی طور پر تنزل کی طرف راغب تھا کہ سائنسی اعتبار سے عروج کی جانب مجھے کسی ملک کسی مذہب کسی انسان کے عروج اور زوال کی پروا نہ تھی میں نے پہلے

پروفیسر سہیل کو خط لکھنے چاہے لیکن اب میں سہیل کے مشورہ سے آگے نکل گیا تھا۔
 اہتل کے مرنے کے تیسرے روز بعد مجھے آفتاب کا خط بھی ملا لیکن چونکہ اس میں کوئی
 پتہ نہیں تھا اس لیے میں جواب دینے کے فرض سے آزاد ہو گیا۔ ہاں یہ بات اس
 میں قابل ذکر تھی۔

”میرا خیال تھا تم سنی کے بہت قریب ہو لیکن سنی کے بعد تم نے بھی مجھے خط
 نہیں لھا..... کیا بات ہے کیا وطن میں کسی کو بھی پروا نہ تھی..... وہ کیسے مری؟
 کیوں مری..... تمہیں تو معلوم ہوگا؟۔“

کئی دن میں یی خط پر ہٹتا تھا میں نے خواب بھی لکھا پھر مجھے محسوس ہوا جیسے
 آفتاب نے جان بوجھ کر مجھے ایڈریس نہیں لکھا۔ وہ میرے خط کا منتظر نہ تھا۔ شاید
 اسے سنی کے متعلق درست انفرمیشن بھی درکار نہ تھی۔

تنہائی بیماری، غم خوری اور بے اعتدال عادتوں کے باعث میں جلد کسی ہسپتال میں
 پہنچ جاتا اگر بھابھی صولت میرے لیے ایک لڑکی تلاش نہ کر لیتی۔ اس روز اچانک
 آسمان ابر آلود ہو گیا۔ سارے آسمان پر بھاری پستانوں کی شکل کے گول گول بادل
 چھائے تھے آسمان مایکل اینجلو کی بنائی ہوئی تصویر نظر آتا تھا۔

میں چہ نشین پر بیٹھا تعجب سے آسمان کے ان ہی بادلوں میں حلوں کرنے کی
 کوشش کر رہا تھا جب بھابھی صولت اوپر آئیں وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک
 گئیں۔

”قیوم!“

”جی۔؟“

”اوپر کیا دیکھ رہے ہو۔“

”بادل دیکھ رہا تھا۔“ میں نے نظریں جھکا کر کہا

”تمہارے لیے میں نے لڑکی تلاش کر لی ہے۔“

”میں عابدہ کی بہن سے شادی نہیں کروں گا۔“

”نہیں بھئی..... وہ نہیں یہ اور..... ہے۔“

وہ نشین پر پہلی مرتبہ میرے قریب بیٹھ گئیں..... ”ستاروں نے بھی اسے بے نقاب نہیں دیکھا صوم و صلوة کی پابند..... سلامتی کڑھائی اچھی..... کھانا پکانا جانتی ہے بڑے اچھے لوگ ہیں۔“

”آپ تسلی کر لیں۔“

”بالکل باکرہ باعصمت لڑکی ہے جیسی تمہیں درکار ہے بالکل ویسی۔“
پہلی مرتبہ میں نے جرأت کے کے پوچھا..... آپ کو کیا معلوم ہے کہ مجھے کیسی لڑکی چاہیے۔

بھابھی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا..... ”مجھے معلوم ہے ناں..... تم چاہتے ہو کہ..... کہ تمہیں ایسی لڑکی ملے جو پہلی نظر میں تمہاری ہو جائے۔ ہے نا؟“
میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
”جی ایسی..... کہاں.....!“

”بس وہ ڈبے میں پیک ہے پوری طرح..... تم ہی اس کا کاربن کھولو گے پہلی بار۔“

میں چپ ہو گیا۔

”کوئی فکر نہ کرو قیوم وہ خوبصورت بھی بہت ہے۔ پڑھی لکھی تو خیر زیادہ نہیں لیکن خوبصورت بہت ہے۔“

مجھے سر دست لڑکی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے نگاہیں آسمان پر جمالیں وہاں بڑے بڑے مرور پستانوں جیسے بادل ساکت کھڑے تھے مجھے یوں لگا جیسے ابھی ان میں سے دودھ برسنے لگے گا۔

”مجھے افسوس ہے۔“

”کس بات کا بھابھی؟“

”ہر بات کا..... اماں جی کی موت کا..... ابا جی کے پاگل پن کا..... اور..... اور

.....“

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے منہ پھیر لیا اور وہ چپ چاپ نیچے چلی گئی۔
میری نظروں میں چند راگھوم گیا۔

ہمارے گاؤں کو مکمل طور پر کھرا گیا تھا۔ آخری بار جب بھائی مختار ابا سے ملنے گئے تو انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا..... لیکن میں آخری بار ابا سے مل چکا تھا مجھے معلوم تھا کہ ابا حویلی چھوڑ کر کبھی لاہور نہیں آئے گا پھر بھی میرے اندر ہی اندر کہیں آرزو تھی کہ ابا لاہور آجائے مجھے وہ ماں کی آخری نشانی لگتا تھا۔ میں بھائی مختار کی آمد و رفت میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ لیکن جس روز انہیں شیخوپورہ سے واپس آنا تھا میں ایک موہوم امید کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ وہ گاڑی سے اترے ابا ان کے ساتھ نہیں تھا مجھے اسٹیشن پر پا کر لمحہ بھر کے لیے ان کی آنکھوں میں حیرانی آئی اور پھر انہوں نے مجھے بیگ ایسے پکڑا دیا جیسے انہوں اسٹیشن پر لینے جانا میرا معمول ہی ہو۔

ہم دونوں چپ چاپ ٹیکسی میں بیٹھ گئے مجھے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ تھی وہ کچھ بھی بتانے پر رضامند نہ تھے سارا راستہ میں شیشے سے باہر دیکھتا رہا اور وہ سیٹ کی پشت سے سر لگائے آنکھیں بند کیے اصل موضوع سے گریزاں رہے جب ہم دونوں کرشن نگر کی حدود سے آگے کھیتوں کھلیانوں والے حصہ میں پہنچے تو میں نے ڈرتے ڈرتے بھائی مختار پر نظر ڈالی۔

”گاؤں کیسا تھا؟“

انہوں نے بغیر آنکھیں کھولے کہا..... ”اب گاؤں کہاں؟ لوگ سب چلے گئے ڈھور ڈگمر کھپ گئے۔ مکان تقریباً گر گئے کنوئیں تال سب کھاری پانی سے بھر گئے

گاؤں اب کہا؟“

”اور ابا؟“

مختار بھائی چپ ہو گئے۔

”ابا کو ساتھ نہیں لائے آپ۔“

”وہ نہیں آسکتا اب۔“

”کیوں؟.....“ میرا دل دھڑکنے لگا۔

پہلی بار بھائی ختار نے اتنی لمبی بات کی..... ”جس روز میں رات کو پہنچا ہوں وہ اوپر والے چوہارے پر کھڑا تھا۔ میں بھی اوپر چلا گیا اس نے مجھے پہچانا نہیں..... میں پاس گیا..... سلام کیا..... ابا بولا..... چلو میں تیار ہوں اتنی دیر کیوں لگائی میں تو ہر روز تمہاری راہ دیکھتا تھا پھر ابا اتنی تیزی سے نیچے اتر اکہ میں حیرا رہ گیا چلو..... سیڑھیوں سے اتر کر اس نے کہا اب کل چلیں گے ابا آج تو نہیں جاسکتے ناں کل شیخوپورہ سے روانہ ہوں گے یہ بات سن کر اس نے مجھے غور سے دیکھا دیکھتا رہا اور اچھا اچھا کہتا رہا بہت دیر کے بعد دیوار کے ساتھ لگ کر بولا لیکن میں شیخوپورہ تو جانا نہیں چاہتا مجھے وہاں کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ تم مختار بھائی کے پاس سے نہیں آئے؟..... نہیں ابا لاہور چلیں گے..... میں نے جواب دیا وہ چپ ہو گیا اور جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا..... کون ہو تم؟..... جب میں نے اپنے باپ سے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا۔ اچھا میں کچھ اور ہی سمجھا تھا تم وہ نہیں ہو جس کا مجھے انتظار ہے۔“

ڈرتے ڈرتے میں نے سوال کیا..... ”اے کس کا انتظار ہے مختار بھائی۔“

”وہ..... وہ موت کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید جس روز سے وہ پیدا ہوا ہے اسی روز سے اے موت کا انتظار ہے لیکن..... اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ رات کو میں اسے مناتا رہا کہ وہ میرے ساتھ لاہور چلا آئے لیکن وہ بولا نہیں مانا نہیں بس

چپ چاپ چھت کی طرف دیکھتا رہا صبح میں اٹھا تو وہ اپنے پلنگ پر نہیں تھا۔
”کہا گیا؟“

”پتہ نہیں..... تین دن مسلسل میں اس کی تلاش کرتا رہا لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملا
شاید..... وہ اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔ یا شاید وہ کہیں چلا گیا سڑکوں پر مزاروں پر
..... بازاروں میں..... ایسے لوگ ہوتے ہیں ناں قیوم۔“

بھائی مختار خاموش ہو گئے ہم ساندکلاں کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ ہم
دونوں میں جو سانجھا رشتہ تھا تین دن کی مسلسل کوشش کے باوجود اس رسی کو وہ ساتھ
نہ لاسکا جس پر چل کر ہم نٹ بازی گروں کی طرح ایک دوسرے کی طرح بڑھ سکتے
تھے۔ ابا شاید ان لوگوں میں سے تھا جو ساری عمر موت سے محبت کرتے ہیں انہیں
زندگی سے اگر پیار بھی ہوتا تو وقتی..... موت ہی کی کشش انہیں زندگی رہنے پر مجبور
کرتی ہے!۔

میں اور بھابھی صولت خاموشی سے ٹیکسی میں بیٹھے رہے موچی دروازے کے
باہر جہاز مونگ پھلی چلنوزے اور دیگر ڈرائی فروٹ کی دوکانیں ہیں۔ بھیشیاں بھنے
ہوئے چنے پھلیاں تھوک کے بھاؤ بیچتے ہیں یہاں ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل
چل دیے..... گرمیوں میں یہ بازار باہر کی نسبت بہت ٹھنڈا تھا اس بازار کی اشیاء
لوگ اور بولی سن کر لگتا تھا جیسے ہم کسی قصابی علاقے میں آ گئے ہیں چھوٹی اینٹوں کے
مکان تین تین منزلہ اوپر کر نکلے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے اوپر جا کر ان کے ماتھے آپس
میں مل جائیں گے۔

اچار والوں کی دوکان کے پاس سے جہاں سامنے ہی پتنگوں والے نے بڑے
بڑے قد آدم پتنگ سجا رکھے تھے ہم ایک بغلی گلی میں مڑ گئے۔ یہاں ہی اس گلی میں
روشن کا مکان تھا یہ مکان ضرور غدر سے پہلے تعمیر ہوا ہوگا اس کے چھجے شہ نشین

کھڑکیاں اندر داخل ہونے والا دروازہ سب علی بابا کے عہد کی چیزیں تھیں اندر مکان کے فرشوں میں کالی سیاہ شطرنج بچھی تھی۔ جس کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا وہ بیک وقت پتھک آفس اور مہمان خانہ تھا۔ ایک کونے میں ہرٹیل فین پڑا تھا جو ہماری آمد سے لے کر ہماری رخصتی تک بہت کوشش کے باوجود ایک بار بھی نہ چلا۔ صوفوں پر سفید چادریں اور پلنگ پر کڑھائی سے اٹا ہوا لیس لگا پلنگ پوش چھا تھا۔

ہماری آمد کے بعد روشن کی ماں آئی ماں کے بعد روشن کی دو چھوٹی بہنیں دو ممانیاں اور پھر ایک پھوپھی آکر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد مرد آنے شروع ہوئے آہستہ آہستہ کمرے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جس پر کوئی بیٹھا نہ تھا۔ میزروں پر کوکا کولا پھل موچی دروازے کی خاص مٹھائی شامی کباب اور جانے کیا کیا سجا دیا گیا وہ تمام لوگ نروس ہونے کی وجہ سے خاموش تھے صرف گلبرگ میں بیابھی ہوئی ایک پھوپھی اپنے رتبے کے اعتبار سے بات چیت کرتی رہی۔

”آپ ریڈیو سٹیشن پر کام کرتے ہیں ناں..... پھوپھی نے سوال کیا۔“

”جی۔“

”آج کل چھٹی پر ہیں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں آجکل.....“ بھابھی صولت

نے میری طرف سے جواب دیا۔

”آپ حامد صاحب کو جانتے ہیں؟“

”کون سے حامد صاحب۔“

”وہ میرے شوہر کے کزن ہیں ریڈیو سٹیشن پر انجنیر ہیں۔“

مجھے چھوٹے سے قد کے سیامی بکری جیسے حامد صاحب یاد آ گئے۔

”جی جانتا ہوں“

”ذکی صاحب کے گھر بھی آنا جانا ہے ہمارا۔“

”کون ذکی صاحب.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ ڈراموں میں کام کرتے ہیں بڑی مزاحیہ طبعیت ہے ان کی..... میرے بچے انہیں بہت پسند کرتے ہیں جب بھی ہمارے گھر میں کوئی فنکشن ہوتا ہے وہ ضرور آتے ہیں اپنے سازندے بھی لے کے آتے ہیں ریڈیو سٹیشن کے۔ انہیں بڑے فلمی گانے آتے ہیں۔“

مجھے سرے سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ ذکی صاحب کون ہے لیکن میں نے لاعلمی ظاہری کر کے پھوپھی کو شاک کرنا مناسب نہ سمجھا

”بڑے اچھے آرٹسٹ ہیں۔“

”ان کو تو فلم میں کئی آفر آ چکی ہیں لیکن وہ جاتے نہیں کہتے ہیں فلم کا ماحول خراب ہوتا ہے..... بڑے شریف آدمی ہیں ہم جب بھی پارٹی کرتے ہیں انہیں ضرور بلاتے ہیں کوئی مانڈ نہیں کرتا۔“

موچی دروازے کی باقی سادہ لوح عورتیں تحیر سے ہم دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ شلواری میضوں میں ملبوس تاجر پیشہ، دوکاندار مرد کھانے کی چیزیں لانے میں مصروف تھے پھوپھی کی معلومات کے اگے کسی کا دیا جل ہی نہیں سکتا تھا۔

بڑی دیر تک پھوپھی جان مجھ سے گلہ گ والوں کی باتیں کرتی رہیں۔ پھوپھیوں نے اس سامان کا ذکر شروع کر دیا جو وہ حال ہی میں ہانگ کانگ سے لائی تھیں اس کے بعد انہوں نے اپنے بچوں کی پڑھائی کے مسئلے پر مجھ سے رائے چاہی اس موضوع کے بعد انہوں نے پاکستانی کردار کی دھجیاں بکھیریں ہم لوگ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کس قدر پست کردار ہیں اور کیوں ہیں اس کا تجزیہ کیا حالیہ سیاست پر اظہار خیال ہوا یہ ٹاپک ختم ہوا تو انہوں نے مرد عورت کے باہمی تعلقات اور مرد کی فطری کمزوری اور جعلی کمینگی پر بڑی فصیح گفتگو کی اس دوران بھابھی صولت مکان کے اندر روشن سے ملنے چلی گئیں۔

بڑی دیر بعد بھابھی صولت باہر آئیں تو ان کے ساتھ روشن تھی۔

میں نے اپنی کھڑے دیکھا..... موتیا رنگت، ہکا زرد لباس، پھیکے پھیکے ہونٹ اور بہت خوبصورت ہاتھ..... اس کے بعد میں نے اس پر نظر ڈالی۔ وہ مجھے پہلی موم کا بت نظر آئی اس کی پلکیں رخساروں سے پیوست تھیں غالباً اس نے میری طرف ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا کمرے میں شام کا اندھیرا چھایا ہوا تھا جس وقت پھوپھی نے پہلا بلب جلایا میں اور صولت بھابھی وہاں سے رخصت ہوئے۔

والپسی پر پتنگ بازار میں سے چلتے ہوئے بھابھی صولت نے پوچھا۔ ”کیسی ہے؟“
 ”اچھی ہے۔“

”سب سے اچھی بات بتاؤں سخت پردے میں پلی ہے۔ ماموں زاد، چچا زاد پھوپھی زاد بھائیوں سے بھی ملنے کی اجازت نہیں تمہاری طرف بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا خوش نصیب ہو قوم..... ایسی لڑکی اب ان ہی علاقوں میں مل سکتی ہے ورنہ اگر گلابرگ ہیں ڈھونڈتے تو بڑی تیز لڑکی ملتی۔“
 میرے دل میں چھوٹی سے امید کرن پھوٹی۔

بقول متل ہر انسان کے اندر ایک چھٹا سار ب چھپا ہوا ہے جو چاہتا ہے کہ زندگی میں اسے ایک سچا پجاری ایک صادق عبد اور ایک سرہتیلی پر رکھنے والا عاشق مل جائے جس وقت اللہ نے حضرت آدم میں اپنی روح پھونکی۔ اسی وقت سے یہ چھوٹا خدا اس بات کا آرزو مند ہوا۔ اسی لیے آدم کی خواہش کے احترام میں حضرت حوا وجود میں آئی یہ بات ہے کہ اس کے بعد حضرت آدم اللہ کے سچے عبد نہ رہے لیکن چھوٹا سار بننے کی تمنا ان کے ساتھ ہی زمین پر آئی۔

میں بھی کسی بچکاری پر اپنی ذات کا مکمل بوجھ ڈال کر آزاد ہونا چاہتا تھا۔ انسان ساری عمر آزادی کی خواہش میں بھٹکتا رہتا ہے یہ اسکی دوسری ایسی خواہش ہے جس

کے اندر تضاد پہلے سے موجود رہتا ہے چونکہ مشیت غالباً آزادی کی خواہاں نہیں اس لیے اس نے روح کو پابند کرنے کے لیے جسم کی بیڑیاں پہنائیں جب بھی روح مکمل طور پر آزاد ہو جانا چاہتی ہے یہی جسم اس کی اڑانوں کو سست رفتار کرتا ہے جب جسم پورے طور پر کھل کھیلنا چاہتا ہے اور ہر جوا اتار کر اپنے لیے مکمل آزادی کی کوشش کرتا ہے روح جسم کے اندر کبھی احساس جرم کبھی احساس گناہ تصور خدا کبھی تخیل مابعد کے نامعلوم جال پھیلا کر جسم کو قید کر لیتی ہے بنیادی طور پر شروع سے انسان قید پیدا ہوا ہے اور اس قید سے بھاگنے کی سعی میں دیوانہ اور بھاگتا رہتا ہے شاید ابابا کو بھی اسی قید کا شاید احساس تھا کچھ لوگ اسی احساس سے اس قدر بوجھل رہتے ہیں کہ زندگی بھر انہیں نیستی کے سوائے اور کسی چیز سے پیار نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اسی وقت پر سکون ہوتے ہیں جب نیند یا بیہوشی کا غلبہ ان پر ہو جائے پھر ان کے اندر جسم اور روح کی جنگ وقت طور پر بند ہو جاتی ہے عمر رفتہ میں مجبوس یا دیں ان کا کٹھ بگاڑ نہیں سکتیں آنے والے مستقبل کی زنجیریں انہیں پابوس نہیں کر سکتیں اور وہ کچھ دیر کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں بالکل آزاد۔ آزادی کی اسی خواہش نے انسان کو ہمیشہ بے قرار رکھا ہے حالانکہ وہ اندہی اندر جانتا ہے کہ اس کے ضمیر میں ایک بہت بڑا حصہ غلامی کا بھی ہے..... اور وہ مقید رہے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتا..... آگے نہیں بڑھ سکتا جس قدر وہ آزادی کا خواہاں رہتا ہے اسی شدت سے اطاعت غلامی اور انکساری اس کی ذات کے لیے ضروری ہوتی جاتی ہے۔

شادی سے پہلے کنیدن میں ان ہی دو خواہشوں میں پرویا رہا ایک طرف یہ تسلی تھی کہ روشن جس وقت میرے گھر میں داخل ہوئی اس میں اتنی شکلی ہوگی کہ وہ میرے جسم اور روح کا تمام تر بوجھ اپنی محبت کے جیک پر اٹھالے گی اور سچا پجاری پا کر آئندہ میرے تجربات میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے میں اپنے آپ میں نہیں اس کے وجود میں زندہ رہنے لگوں گا دوسری طرف مکمل آزادی کی خواہش تھی مجھے لگتا تھا اگر وہ

روزن ثابت نہ ہو سکی تو پھر میں شادی میں محصور ہو جاؤں گا جیسے کبھی کبھی ندی رستہ پا کر ایک گہری جھیل میں جا گرتی ہے اور پھر اس کے پانی نشیب کی تلاش میں نہیں رہتے صرف پاتال کی طرف اترتے جاتے ہیں اندھیرے کی طرف گرم لادے کی طرف۔

شادی سے دو ایک دن پہلے میرے دل دماغ اور جسم بالکل سن ہو گیا۔ سارا دن میری کھوپڑی پر ڈھولک بجتی رہتی نیچے کی رونق سے گو میرا تعلق کم تھا پھر بھی یہ شادی والا گھر تھا اور میں سارا سارا دن اکیلا نہ بیٹھا رہ سکتا تھا جس وقت میں سہرا پہن کر کار میں بیٹھا آخری بار رسہ تڑوا کر آزاد ہونے کی خواہش دل میں جاگی اور جب قبول ہے قبول کے مرحلے سے گزر کر سب طرف چھوہارے اچھے مبارک مبارک کی صدائیں اٹھیں اس وقت میں نے جانا میرے اندر کے چھوٹے سے رب نے گواہی دی کہ آج مجھے ایک سچا عاشق ملے گا جو میرے بوجھل وجود کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈال لے گا۔ اب اس خواہش کے ساتھ ہی میرے دل میں عجیب قسم کی خوشی بیدار ہوئی ایک خاص قسم کی ecstasy جیسے بہار کے دنوں میں خوشبو سے بوجھل ہوا ہوتی ہے۔

رات گئے تک میں نیچے بھا بھی صولت اور بھائی محنت کے مہمانوں میں گھر ا بیٹھا رہا کچھ ریڈیو سٹیشن کے ساتھی بھی موجود تھے کچھ آرٹسٹ برادری بھی آن پہنچی تھی۔ ان لوگوں کے بے تکلف لطیفوں نے مجھ میں اور بھی خوش اعتمادی پیدا کر دی اور مجھے ان سلیم شاہی جوتیوں نے کاٹنا بند کر دیا جو میرے پیروں میں کچھ کچھ تنگ تھیں آدھی رات کے قریب میں اوپر گیا..... یہ وہی کمرہ تھا جہاں عابدہ چائے کی ٹرے اور مونگ پھلیوں کا لفافہ لے کر آیا کرتی تھی اسے بیک وقت مونگ پھلیاں کھانے اور باتیں کرنے کا کس قدر شوق تھا..... عابدہ کہاں تھی؟..... جس نے بچے کی آرزو میں اپنے آپ کو تنزائیو کا پر آمادہ کیا تھا..... شاید وہ بھی مہمانوں میں تھی لیکن آج میں

سارا دن اسے پہچاننے سے بھی قاصر رہا۔

کمرے کی صورت پھولا اور ہاروں کی وجہ سے بدلی ہوئی تھی ہر جگی نئے سوٹ کیس سرخ کسہری کاغزوں میں لپٹے ہوئے ڈبے پڑے تھے کمرے میں باسی چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ ساتھ دلہن کی خوشبو تھی ہم دونوں اکیلے تھے اور شادی شدہ تھے۔..... بڑی آرزوؤں کے ساتھ اور بڑے عہد و پیمان کر کے ہم دونوں کو باقی کی زندگی کا سفر کاٹنا تھا۔

”میرا نام قیوم ہے۔“ میں نے پلنگ پر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔.....“ میں نے سوشیالوجی میں ایم اے کیا ہے۔..... ریڈیو سٹیشن میں ملازم ہوں السر کا مریض ہوں، سالن میں مرچیں نہیں کھا سکتا۔..... آپ کو اس کی طرف سے احتیاط کرنا ہوگی۔..... مجھے ایماے سوشیالوجی کی تعارفی کلاس یاد آگئی۔..... کیا انسان ساری عمر اپنا تعارف ہی کراتا رہتا ہے۔“

روشن نے بغیر تکلف کے منہ سے گھونگھٹ اتار دیا۔..... ایسا زرد سورج کبھی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی ساری زندگی آپ کو دوں۔..... بمع اس کی تلخ یادوں کے۔..... کیا آپ میں اتنی ہمت ہے کہ آپ میری یادوں کا بو جھ بھی اٹھالیں اپنے دل پر؟..... اور مجھے ہکا پھکا کر دیں؟..... میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے پیلے رنگ کے آنسو زرد گالوں پر بہنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں اس لیے غالباً وہ میری بات کی تاب نہیں لاسکی میں نے جیب سے رو مال نکال کر اس کے آنسو پونچھے اس نے مدافعت نہ کی اور چپ رہی۔

”کیا آپ میری تلخیوں کو جذب کر لیں گی؟..... میں اتنا کچھ سہہ چکا ہوں کہ اگر آپ نے وعدہ نہ کیا تو میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔..... مینٹل ہسپتال سے مجھے صرف

آپ ہی بچا سکتی ہیں۔“

پہلی بار روشن بولی..... چھوٹی سی کم عمر آواز جیسے کوئی نو عمر کبوتری بولے ”اگر آپ نے میری تلخیوں کو جذب نہ کیا تو میں تباہ ہو جاؤں گی پوری طرح..... پوری طرح..... پوری طرح.....“

میرے اندا کے مرد نے پچاری عورت کو سہارا دینے کے لیے کہا..... ”تم میرے ہوتے ہوئے تباہ نہیں ہو سکتیں روشن..... تمہاری تمام تلخیوں کو میں جذب کر لوں گا جیسے..... جیسے بارش کو ریت جذب کرتی ہے۔“

ہم دونوں خاموش ہو گئے مجھے لگا جیسے میں ٹاس ہار گیا ہوں میں نے سگریٹ سلاگ لیا اور کتنی ہی دیر تک سگریٹ پیتا رہا۔

”پھر.....؟.....“ بڑی دیر بعد میں نے سوال کیا۔

”جی.....“ وہ اب ہولے ہولے رو رہی تھی اور کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر بتا رہی تھی کہ میں اسے چپ کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

”پھر..... بتاؤ ناں.....؟“

”بتانے والی بات نہیں ہے..... میں اچھی طرح سے بتا بھی نہیں سکتی۔“

”ہم ریڈیو والے بہت کچھ جانتے ہیں ہمارے لیے کچھ نیا نہیں ہوتا، تم بتاؤ تو

سہی!.....“

دو تین گھنٹوں کے دم دلا سے کے بعد وہ اپنی تلخی کی طرف آئی۔

”جی مجھے بچہ ہونے والا ہے۔“

یکدم مجھے یوں لگا جیسے کوئی بھاری چیز میرے ماتھے سے اندھیرے میں ٹکرائی میں بھنا گیا۔ بناہر میں نے جرات سے کہا..... ”اچھا پھر تو..... پھر..... تو ایک

دوسری بات ہے۔“

اب وہ اونچے اونچے رونے لگی..... ”میں نے اماں جی سے بہت کہا..... ہاتھ

جوڑے خدا قسم..... بہت منتیں کیں لیکن وہ تو کہتی ہیں میں کسی قصائی کو بیچ دوں گی اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی تیری۔“

”کون ہے وہ؟..... بچے کا باپ؟“

”ہماری گلی میں پتنگوں کی دوکان ہے اس کے باپ کی پہلے وہ باپ کی دوکان پر بیٹھا کرتا تھا اب..... اب تو وہ جدے چلا گیا..... میرے گھر والوں نے اسے تکلے ہی نہیں دیا۔“

”بڑا افسوس ہے.....“ یہ بات میرے منہ سے بڑی فروغی لگی

”ایک روز وہ فلم دیکھنے گیا تو..... تو میرے بھائیوں نے اسے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے پکڑ لیا کالر سے..... اتنا مارا..... اتنا مارا..... بھلا اسے کیوں مارتے تھے یہ لوگ قیوم صاحب..... قصور تو سارا میرا تھا..... سارا میرا..... اس نے کئی بار میری منتیں کیں ہاتھ جوڑے لیکن..... لیکن میں اسے چھوڑ ہی نہیں سکتی نہ اس زندگی میں نہ.....“ یکدم وہ میرا چہرہ دیکھ کر چپ ہو گئی۔

”آپ کو میری باتیں بری لگ رہی ہیں؟..... روشن نے اٹک اٹک کر سوال کیا.....“ تم نے..... تو پھر تم نے یہ شادی کیوں کی روشن؟..... جب تم اس حد تک بیاہی جا چکی ہو تو اس شادی کی کیا ضرورت تھی؟“

اب اس کی آواز دھیمی پڑ گئی..... ”مجھے تو ضرورت نہیں تھی جی..... یہ میرے گھر والے اگر اسے جان سے مارنے کی دھمکی نہ دیتے تو..... تو میں کبھی رضامند نہ ہوتی میرا خدا گواہ ہے۔“

اتنے زرد معصوم چہرے پر اتنی وثوق کی باتیں کچھ اوپری معلوم ہو رہی تھیں۔

”اب کیا کریں روشن؟“

وہ چپ ہو گئی پھر چپ چاپ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

”جیسی آپ کی مرضی؟۔“

”تم جدے خط لکھو کہ..... وہ تمہیں آکر لے جائے..... میں تمہیں اس کی امانت سمجھوں گا۔“

یکدم اس کی آنسو خشک ہو گئے اور وہ ہکا بکا میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ دیکھتی گئی اس کی آنکھوں میں تحیر خوف کی حد تک منجمد ہو گیا تھا۔

”آپ..... آپ جی؟“

”چاہو تو میں ابھی تمہیں طلاق دے دوں..... چاہو تو اس کی آمد پر..... فیصلہ کر دوں گا.....“ میں نے جیب سے ایک خوبصورت گھڑی نکالی۔ اس گھڑی میں دن وقت مہینہ چاند رات سب کچھ نظر آتا تھا۔ یہ گھڑی میں نے اس امید پر خریدی تھی کہ جس وقت میں یہ گھڑی روشن کی کلائی پر باندھوں گا۔ اس لمحے کے بعد میں اپنی زندگی کا پیٹرن مکمل طور پر بدل دوں گا اس کے بعد میرے وجود کی تمام سوئیاں اس کی تابع چلیں گی اور اس طرح میں اپنے بوجھ سے آزاد ہو جاؤں گا میں نے گھڑی اس کے پاس رکھ کر کہا..... ”وقت دیکھ لو روشن..... اس وقت میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ..... کہ تم یہاں مہمان ہو۔ جب تک تمہارے حالات اجازت دیں یہیں رہو اپنے آپ کو میری بیوی ظاہر کرنے میں سہولت ہو تو ایسے سہی..... میری بیوی کا رتبہ ناپسند ہو تو کھلم کھلا اظہار کر سکتی ہو کہ تمہارا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔“ اس کی آنکھیں بالکل ساکت مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

”آپ جی..... آپ کو.....“ وہ چپ ہو گئی۔

ہم دونوں تھری دیر خاموش بیٹھے رہے پھر میں نے گلے سے پھولوں کے سنہری تاروں والے روپے کے کئی ہار اتار کر اس کے پاس پلنگ پر رکھے۔ اپنی زری کی اچکن اتار دی عین صاف کی اور وہ سلیم شاہی جوتا صبح سے پاؤں دبارہا تھا اتار دیا۔

”شکر ہے تمہارے ماں باپ ماڈرن نہیں ورنہ جہیز میں ڈبل بیڈ سے دیتے.....“

میں نے ہنس کر کہا..... ”اس صورت میں مشکل پیدا ہو سکتی تھی..... آرام سے سو جاؤ

جب میں آؤں گا تو یہاں اس پلنگ پر لیٹ رہوں گا۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں اس وقت؟“

”کوئی خاص جگہ نہیں..... بس ایسے ہی۔“

وہ گھبرا گئی۔

”آپ بھابھی صولت کو بتانے چلے ہیں؟..... ڈر کر اس نے سوال کیا۔“

”نہیں!“

”اگر آپ نے کسی سے ذکر کیا..... تو میں مرجاؤں گی۔“

مجھ میں عجیب قسم کی قوت آگئی تھی..... میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ روشن۔

..... لیکن اگر جدے والا کسی وجہ سے نہ آسکا..... اور بچے کی آمد ہوگئی تو..... تو تم اسے

میرا بچہ ظاہر کرنا۔“

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن آنکھوں سے مسلسل آنسو بہنے کی وجہ سے مجھے اس

کی آنکھوں دکھائی نہ دیتی تھیں۔

”وہ ضرور آئے گا..... ضرور آئے گا..... وہ ایسا نہیں ہے جیسا اماں سمجھتی ہیں۔“

میں روشن کے قریب ہو گیا اور اہستہ سے میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ

کر کہا..... ”انشا اللہ..... وہ ضرور آئے گا..... ہم دونوں دعا کریں گے۔“

یکدم روشن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا بلبل کر بولی..... ”آپ کو بھی تو کچھ بتانا تھا مجھے

..... آپ کو بھی تو۔“

”ابھی اس کا وقت نہیں آیا روشن..... بتاؤں گا کسی روز۔“

جس وقت میں سیڑھیوں سے اترا سارا گھر خاموش تھا آنکلیں میں بریانی اور

قورمے کی خوشبو تھی سب ٹوٹے ہوئے پھول بکھرے تھے برآمدے میں قالین پر

ڈھولک کے ساتھ دو تین باکری لڑکیاں بے سدھ سوئی ہوئی تھیں ان کے پاس

بھابھی کے دونوں توام بیٹے مسعود اور فرید گتھم گتھا بے سدھ پڑے تھے۔ اندر باہر بجلی

کے پنکھوں کی گھوکر جاگی ہوئی تھی۔ میں نے میڑھیوں کے نیچے سے اپنا موٹر سائیکل دے پاؤں باہر نکالا اور دو رتک موٹر سائیکل کو پیدل چلاتا نکل گیا پھر یکدم اس پر سوار ہو کر میں نے ریس دی رات کے پچھلے پہر موٹر سائیکل کی آواز چنگھاڑ کر دو ر دور پھیل گئی یکدم مجھے یوں لگا جیسے دکھائی نہیں دے رہا میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا..... خدا جانے کب سے میرے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں مال روڈ کی طرف سے جناح باغ میں داخل ہوا رات کے وقت منگمری ہال جنات کا محل لگ رہا تھا میں نے باغ میں جانے سے بہت پہلے موٹر سائیکل کا انجن بند کر دیا اور کینٹین کے قریب اسے پارک کرنے کے بعد میں بائیں جانب مڑ گیا کانور کا درخت تلے عجیب قسم کی خوشبو تھی۔ سارے باغ میں جھینگڑوں کی آواز اور جگنوؤں کی ٹماٹماہٹ تھی۔ باغ سے ایک خاص قسم کا خوف پھوٹ پھوٹ کر ساری طرف پھیل رہا تھا۔

میں چھتڑکارے کا کانور کے سرخت تلے لیٹ گیا۔ ہوا میں موت کی خوشبو تھی۔ میرے معدے میں تیزاب بھینچا جا رہا تھا اور منہ کڑوے کھیرے کی مانند تھا میں کچھ بھی سوچنا نہ چاہتا تھا پھر بھی یادوں کی چیونٹیاں میرے جسم پر تیر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ..... میرے تمام رونغٹے کھڑے ہو گئے اور مجھے لگا جیسے میری نکیر بہہ رہی ہے۔

شادی سے چند دن پہلے مجھ میں دو خواہسیں آگاہی کے ساتھ ابھری تھیں۔ اب مجھ پر یہ حقیقت بھی کھل رہی تھی کہ انسان جب تک چاہے جانے کی رب بننے کی آرزو رکھتا ہے وہ کبھی آزار نہیں ہو سکتا۔ چاہا جانا اور آزاد رہنا صلیب کے بازو ہیں جن پر آدمی مصلوب ہو جاتا ہے پہلی مرتبہ مجھے مہاتما بدھ کی سمجھ آئی کہ وہ کیوں خواہشات کو ختم کر کے اپنی مکتی چاہتا تھا جب تک انسان میں ہلکی سی خواہش بھی ہو وہ

تابع رہتا ہے خواہش کی وجہ سے قیدی ہوتا ہے کبھی حاکم نہیں ہو سکتا۔ خواہش سے آزادی کیونکر ممکن ہے؟

کیونکر کیسے؟

موت سے پہلے موت..... زندگی کے ساتھ زندگی کی نفی..... آخر نجات سے پہلے کلی فرار۔

نجات کی آرزو تک سے..... ہر مسلک سے ہر بت سے چھٹکارا حاصل کرنے ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان ہر قسم کے بت توڑ دے ہر مسلک سے آزاد ہو جائے۔ کسی ملت میں شامل نہ ہو۔ کسی ملک کا باشندہ نہ ہو..... کسی معاشرہ کا فرد نہ ہو کسی کلچر سے وابستہ نہ ہو۔ کسی خاندان کا فرد نہ ہو..... نہ کسی کا عاشق ہو نہ محبوب..... ہر کیفیت سے آزاد..... ایسی حالت میں وہ سوائے موت کے اور کسی کامرہون منت نہیں ہوگا کسی اور کا عاشق نہ ہوگا۔

موت جو یقینی ہے..... موت سے پہلے موت۔

کیا انسان پیدائش کے لمحے سے لے کر موت کی گھڑی تک صرف اسی کوشش میں رہتا ہے کہ وہ کسی طرح اس محسن کو پہچان سکے جو اسے زندگی کے ہر احسان سے نجات دلا سکتا ہے کبھی کبھی اچانک کسی کے چہرے پر خاموشی اور غم کی دہلیز لہریں چھا جاتی ہیں۔ کیا اس لمحے سے مراجعت کی فکر ہوتی ہے کیا موت کا مہربان سایہ اس پر پڑتا ہے؟ کیا بانی وطن کی طرف لوٹ جانے کی آرزو ہر ذی روح کو یہاں کی لذتوں میں بھینا آسودہ رکھتی ہے؟ کبھی کبھی بھری محفلوں میں شام کے وقت سب خاموش ہو جاتے ہیں کیونکہ موت کا فرشتہ وہاں سے گزرتا ہے اور سب کی سائیکسی جانتی ہے کہ انسان موت کی مدد کے بغیر مکمل طور پر کبھی آزاد نہیں ہو سکتا خواہشات کا تمام بوجھ انسان کے کندھوں سے اتارنے والی صرف موت ہے۔

یسی زندگی میں کتنی کرب ناک تھی..... وہ کیسے تملقاتی رہتی تھی اور موت سے

ہمکنار ہوتے ہی اس کا چہری کتنا شانت کیسا آزاد ہو گیا۔

اس دن کے بعد میری زندگی کا ہر لمحہ موت کے متعلق سوچنے میں گزرنے لگا۔ موت کے ساتھ ہمکناری کے بعد مجھ میں ایسا خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ جاتا۔ مجھے گرد و پیش کی سدھ بدھ نہ رہتی اور کئی بار ایک ہی پوزیشن میں کتنی کتنی دیر بیٹھایا یا کھڑا رہتا مجھے لگتا تھا جیسے میں اسی لیے پیدا ہوا ہوں کہ موت کا منتظر ہوں۔ میں جیتے جی کسی عورت کے عشق کا سہارا لے کر آزاد نہیں ہو سکتا۔ خواہشات کے خوش رنگ اور عطربیز جنگل سے اگر کوئی چیز مجھے نکال سکتی ہے تو وہ صرف موت ہے..... اور اگر میں جسمانی طور پر نہ بھی مر سکوں تو بھی اندر مجھے مر ہی جانا چاہیئے۔

اس وقت ایک گھنٹی جھاڑی سے ایک نوگزے آدمی برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کئی آدمی تھے۔ کسی کے سر پر بال نہ تھے اور چار بروؤں کا بھی صفایا تھا ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی روشن مشعلیں تھیں اور وہ دائرے میں ایسے چل رہے تھے کہ نوگزے آدمی درمیان میں آٹھ نمبر بناتا آگے بڑھتا اور باقی تمام بالیشے اس آٹھ کے گرد واٹر بال کی طرح گول گول چکر لگاتے آتے اس نوگزے کو میں ان دنوں بھی دیکھا تھا جب سیبی موت سے ہمکنار تھی اس وقت مجھے یقین تھا کہ اب وہ میرے خیر مقدم کے لیے آیا ہے مشعلوں کی روشنیاں کبھی تا بناک ہو جاتیں کبھی بھک سے جل کر واپس مشعلوں میں گھس جاتیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے بالیشے ساری مشعلیں چاٹ جاتے، اب وہ تمام کے تمام خود مشعلوں کی طرح بھڑک رہے تھے لیکن ختم نہ ہوتے تھے کبھی کبھی جگنو ساں بجھ جاتے لیکن پھر لُٹھ دو لُٹھ بعد ان کا دائرہ بھڑک اٹھتا نوگزے کو البتہ نہ ان کی فکر تھی نہ آگاہی وہ آٹھ کا ہندسہ بناتا دائرے میں آگے بڑھتا آ رہا تھا۔

اپنی طرف اسے بڑھتے دیکھ کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا میں اٹھ کر بھاگنا چاہا۔

لیکن اس کی نظروں میں ایک مقناطیسی کشش تھی اس نے مجھے ایسے باندھ رکھا تھا جیسے سانپ کو بین مسکور کر لیتی ہے۔ اس کا سارا تن سفید چادر میں چھپا ہوا تھا یہ چادر نہ سلی ہوئی تھی نہ کھلی..... نہ جبے کی شکل کی تھی نہ تمہد جیسی بس ایک لبادہ تھا جیسے روئی میں نگندے ڈال کر پہنی ہوئی ہے وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا لیکن ہم دونوں میں عجیب طور پر بغیر بولے گفتگو جاری ہو گئی۔

”تم مجھ سے موت کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو؟“

”ہاں..... ہاں..... میں جاننا چاہتا ہوں..... انسان کہاں سے آیا ہے اور کہاں چلا جائے گا..... وہ..... جہاں سے آیا ہے کیا وہیں لوٹے گا کہ نہیں اور..... یہ سارا وقفہ..... یہ ساری دیوانگی..... اس سے چھٹکارا..... کیا موت سے پہلے نہیں ہو سکتا؟..... کیا آزاد ہونے کے لیے صرف اس سوئی کے ناکے سے گزرنا ہوگا؟“

وہ خاموش تھا اور میری طرف سرچ لائٹ جیسی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

”بتاؤ تم بتا سکتے ہو.....؟ کیا موت کی آرزو نے انسان کو دیوانہ بنا رکھا ہے..... کیا ہر انسان شروع دن سے صرف موت کی آرزو کرتا ہے..... بولو بتاؤ..... کیا نسل انسانی صرف تصور موت کے ہاتھوں پاگل ہوتی ہے؟ بتاؤ ناں۔“

اس کی نظروں میں جلادینے اور بھسم کرنے کی قوت تھی۔

میں دیر تک سوالاں کرتا رہا وہ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا صرف اس کے ارد گرد بالیشے روشنی کے گولے بناتے رہے۔

”بتاؤ..... بتاؤ موت کیا ہے؟ یہ اسرار یہ بھید کیا ہے..... فنا کا ذائقہ کیا ہے؟ مر کر آدمی پر کیا بیت جاتی ہے؟“

اس نے تین مرتبہ بغیر پلکوں کے پوٹے جھپکائے اور بغیر آواز کے گویا ہوا۔ سن! جب آسن مرتا ہے تو دو آدمی مردے کے پاس آتے ہیں۔ غالباً ان ہی کو منکر نکیر کہا جاتا ہے ان دونوں کا مقصد تمہیں الجھانا ہوتا ہے..... ایک آدمی جھوٹا ہوتا ہے اور

ایک سچا..... جھوٹے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں اس فریب میں مبتلا رکھے کہ تم زندہ ہو۔ اور ابھی تمہاری روح واپس جسدِ خاکی میں چلی جائے گی سچے آدمی کو یہ مشکل درپیش ہوتی ہے کہ کس طرح آپ کو یہ یقین دلائے کہ آپ مر چکے ہیں اور اب آپ کی روح جسدِ خاکی میں کبھی نہ جاسکے گی..... اس مرحلے میں تین دن لگتے ہیں۔“

”پھر..... پھر؟..... پھر؟“

”بڑی رو و کد کے بعد انسان بالآخر سچے آدمی کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ وہ مر گیا ہے اب جھوٹا ستھیر خست ہو جاتا ہے اور سچا آدمی کئی سائز کے نیم شفاف ڈبے لے کر پہنچتا ہے..... یہ ڈبے بڑے ریفر جریٹر کے کھوکھلے سے لے کر دوائی کے کپسول جتنے ہوتے ہیں ان سب کا رنگ پہلکا گلابی ہوتا ہے اب سچا آدمی مرے ہوئے آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان ڈبوں میں سے کسی کو منتخب کرے جس قدر بڑی روح ہوگی اسی جتنا بڑا ڈبہ تلاش کرنا پڑتا ہے کئی بار مرنے والا ل چھوٹا ہوتا ہے لیکن بڑے کھوکھے میں جا بیٹھتا ہے اور سچے آدمی کو منتوں سے منانا پڑتا ہے کہ وہ یہ کھوکھا چھوڑ دے۔ درست ڈبے کے انتخاب اور اس میں بند ہونے میں قریباً چالیس دن لگ جاتے ہیں لیکن ایک بار جب روح ڈبے میں بند ہو جاتی ہے تو پھر سچا آدمی جلدی سے ڈبے لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔“

”کہاں..... کہاں؟“

وہ نمائوش رہا اس کی ٹکلی سے شعاعیں نکل رہی تھی۔

”دریائے نیستاں پر..... اس سر یا میں سچا آدمی وہ سارے ڈبے پھینک دیتا ہے جن میں روہیں مقید ہوتی ہیں..... پھولے ہوئے تمام ڈبے اپنے اپنے بوجھ سے دریا کی تہہ میں اترنے لگتے ہیں اور ڈبوں میں روہیں بند روہیں باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں یہ ڈبے عجیب طرح سے بند ہوتے ہیں نہ کہیں زپ نہ بٹن..... نہ کنڈا..... صرف کسی ایک جنگلی مناسب بوجھ پڑ جاتا ہے تو ڈبہ خود بخود کھل جاتا ہے کئی

لوگ سالوں میں قرونوں میں صدیوں میں یہ ڈب نہیں کھول سکتے کئی پہلے غوطے میں کچھ ایسے اطمینان سے بوجھ ڈالتے ہیں کہ کھٹاک سے ڈبے کا منہ کھل جاتا ہے اور روح تیر کر باہر نکلتی ہے۔ اور کائی جی سطح کو کاٹ کر باہر نکل جاتی ہے۔ ان کے لیے نئی زندگی ہوتی ہے۔“

”کچھ ایسے بدنصیب بھی ہوں گے جو..... جو باہر نہیں نکل سکتے..... وہ لوگ وہ روحیں؟۔“

”ایسے بدنصیب نیچے سطح پر جا پہنچتے ہیں یہ روحوں کا قبرستان ہے..... یہ روحیں قیامت تک وہیں رہیں گی۔ روز جزا تک..... یہ وہیں بند سپیوں کی طرح منتظر رہیں گی کوشش کرتی رہیں گی لیکن باہر نہ نکل سکیں گی۔“

پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ میں کانور کے درخت تلے سے اٹھا اور بھاگنے لگا۔ گول داؤروں میں..... کبھی گراؤنڈ کے اندر..... کبھی سڑکوں پر..... کبھی درختوں کے گرد..... کہتے ہیں کہ جب گدھ کی موت آتی ہے تو وہ مردار سے بھی منہ پھیر لیتا ہے پھر وہ ایک ٹانگ پر دو دو رزید بنجر علاقوں میں یوں بھاگتا ہے جیسے دلوں کا پیاسا ہو مردار جانور کا تعفن اس کے نتھنوں میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ آتا رہتا ہے لیکن اس تعفن سے اشتہا بڑھنے کے بجائے اسے متلی ہونے لگتی ہے اس کے جسم میں مردار کھانے کے خلاف احتجاج ہونے لگتا ہے ایسے میں وہ گم ہینے کا شکار ہو جاتا ہے اشتہا عروج کو پہنچ جاتی ہے لیکن جڑے نہیں کھاتے معدہ کچھ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے وہ بنجر زمین پر پڑے ہوئے مردار لاشوں کو دیکھ کر بھاگتا ہے اور آخر کو خاردار جھاڑیوں الجھ کر دم توڑ دیتا ہے مرے ہوئے گدھ کے لاشے کو ٹھکانے لگانے فطرت کے خاکروب نہیں آتے۔ اس لاشے کو سورج کی کرنیں..... ریت کے سوکھے انبار، خشک پتے..... بارش اور ہوا کے تھپیرے توڑ پھوڑ کر پھر مٹی کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

کہتے ہیں ایسی مٹی میں جو بھی بیج ڈالو..... کبھی بار آور نہیں ہوتا..... کبھی زمین

سے سر نکال ہی نہیں سکتا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا!

کچھ دیر تک میں اپنے ارد گرد کا صحیح جائزہ نہ لے سکا دھوپ بہت تھی ماحول نیا تھا میرے بازو میں گلوکوز کی ڈرپ لگی تھی اور سامنے کرسی پر روشن بھٹھی تھی..... روشن سے کوئی یقینی تعارف نہ تھا شاید میں اسے پہچان ہی نہ سکتا..... اگر اس کے ساتھ دائیں بائیں بھائی مختار کے دونوں بچے کھڑے نہ ہوتے۔ بھابھی صولت میرے پائنتی بیٹھی تھیں اور منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔

”اب طبعیت کیسی ہے.....“ روشن نے سوال کرتے ہی نظریں جھکا لیں۔

”باتیں نہ کرو.....“ بھابھی صولت نے خفگی کے ساتھ کہا..... ”پتہ نہیں ڈاکٹر نے منع کیا ہے..... اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔“

”چچا جی آپ جناح باغ کیوں گئے تھے؟“ مسعود نے پوچھا۔

”آپ چڑیا گھر گئے تھے نا..... چاچا جی نیاز میرا دیکھنے.....؟“ فرید نے سوال کیا۔

”چپ کرو..... اور باہر چلے جاؤ.....“ بھائی مختار نے جھڑکا۔

”آپ بیہوش کیوں پڑے تھے جناح باغ میں چاچا جی.....“ مسعود نے پھر

پوچھا

”چلو نکلو یہاں سے جاؤ.....“ بھابھی صولت نے بچوں کو پانچ روپے کا نوٹ پکڑا

کر کہا..... ”باہر جا کر آئس کریم کھاؤ۔“

میں نے آنکھیں بند کر لیں دن کی روشنی ہسپتال کا کمرہ، کمبل، ڈرپ، روشن کا چہرہ

سب میرے لیے بے حقیقت چیزیں تھیں میں ابھی تک نوگزے کے ساتھ تھا اور

میرے نتھنوں میں کانور کی خوشبو تھی۔ ڈاکٹر کے آنے تک میں دم سادھے آنکھیں

بند کیے لیٹے رہا روشن اور بھابھی صولت سے کوئی بات کرنے کو نہ تھی۔

”وہ کہاں ہے.....؟“ وہ..... میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

بلڈ پریشر کا آلہ میرے بازو پر فٹ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے تعجب سے میری جانب دیکھا اور بولا..... وہ کون حضرت!..... یہاں تو ہم سب ہیں آپ کی خدمت کے لیے۔

”وہ نوگزے کا آدمی..... جو مشعل لے کر چلتا تھا جو..... جس نے مجھ سے باتیں کی تھیں

ڈاکٹر بے معزز تھا ہوا، عینکو، زمینی شخصیت کا آدمی تھا ڈاکٹری اس کا صرف پیشہ تھا..... وہ بناوٹی بے تکلفی اور خوش دلی سے بولا..... ”حضور آپ تو پانچ دن سے بے ہوش پڑے ہیں خدا کا شکر کریں جان بچ گئی ورنہ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔“
میں نے آنکھیں بند کر لیں مجھے معلوم تھا کہ وہ میری باتیں سمجھ نہیں سکتا۔
پھر بھابھی صولت اور ڈاکٹر کھسر پھسر کرنے لگے۔
”بے ہوش ہو گیا ہے پھر.....؟“

”بس آرام کی ضرورت ہے ہم Tranquilizers دے رہے ہیں“
”ابھی تو ٹھیک تھے“ روشن کی آواز آئی
”بس جی باڈر لائن کیفیت ہوتی ہے کبھی مریض ہمارے پاس واپس آ جاتا ہے
کبھی ادھر چلا جایا ہے ایب نارمل لوگوں میں“
”آپ ان کی مدد نہیں کر سکتے؟“.....“ روشن نے سوال کیا۔

”کر رہے ہیں بی بی..... ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن ایسا کیس ہمارا نہیں ہوتا۔
انہیں کسی سائیکو تھرپسٹ کی ضرورت ہے..... سر دست جو کچھ بھی ممکن ہے کر رہے
ہیں“

اس کے بعد کسی نے میرے بازو میں انجکشن لگایا بھابھی صولت کے رونے کی

آواز آئی اور رفتہ رفتہ مجھے یوں لگا جیسے میں کھسک رہا ہوں چارپائی سے بستر سے
..... میرا سر بوجھل تھا میں باز واٹھا کرناک کھجانا چاہتا تھا آنکھیں کھول کر دیکھنے کی
آرزو تھی۔ لیکن نہ میری آنکھیں کھلتی تھیں نہ باز واٹھتا تھا۔

”یہ..... یہ ٹھیک تو ہو جائیں گے.....“ روشن کی آواز تھی اور اسی آواز کے ساتھ
میں دوباری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

ہسپتال سے واپسی پر سب سے پہلے میں نے اپنے سر کے سارے بال منڈا
دیے سر منڈوانے سے میں نے وہ ڈیڈھنٹ کا فاصلہ اور بڑھالیا جو روشن اور میرے
پلنگ کے درمیان تھا میں ابھی تک چھٹی پر تھا لیکن اب ریڈیو سٹیشن سے کبھی کبھی کوئی
واقف میری طبیعت کا پوچھنے آجاتا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے تعلق ریڈیو پر کیسی
باتیں ہوتی ہوں گی۔ کچھ آرٹسٹ اور انٹرٹینر مجھے دیوانہ سمجھتے ہوں گے شروع سے
..... نیچے بھا بھی صولت اور بھائی مختار بھی مجھے دیکھ کر شرمندہ ہو جاتے ان کی شکلیں
دیکھ کر مجھے لگتا جیسے وہ مجھے نہیں اپنے آپ کو قصور وار سمجھتے تھے ادھر روشن کی عجیب
مصیبت تھی وہ دن بدن پیلی ہوتی چلی جا رہی تھی پہلے اس کی رنگت زرد سا بن جیسی تھی
اب وہ پیلے کھدر جیسی نظر آتی۔ میرا سارا کام وہ کرتی اس کی ضروریات کا میں خیال
رکھتا اس کے باوجود ہم دونوں میں ہم ہی بات ہوتی۔ کمرے میں ترتیب آگئی تھی۔ یا
تو میرے آنے سے پہلے وہ سو جاتی لیکن اگر وہ جاگتی نظر آتی تو میں نیچے چلا جاتا اور
بے مصرف سرکوں پوگھومتا رہتا۔ یہ عجیب دن تھے جیسے پانی کی سطح ہو ہو لے ہو لے
کاٹی جمتی چلی جائے میرے اندر بھی ہر خواہش آہستہ آہستہ شرمندہ ہو رہی تھی اور میں
عجیب طرح سے آزاد ہوتا چلا جا رہا تھا موت سے اس قدر گہرا رابطہ قائم کرنے کی وجہ
سے زندگی یکدم بے معنی ہو گئی تھی..... میں دوکانوں کے سامنے کھڑا سوچتا رہتا
..... لوگ یہ سارا سامان کیوں خریدتے ہیں کیمرے..... کپڑے..... قالین، برتن

.....گیس کا سامان فرنیچ کاریں سارے بازاروں میں بے ہودہ سامان دیکھ کر میں جان بچا کر کسی فلم ہاؤس کے سامنے جا کھڑا ہو جاتا فلموں کے پوسٹر اب جاذب نظر نہ رہے تھے میں کوشش کرتا کہ ان فلموں میں مجھے دل چسپی پیدا ہو جائے لیکن جن وجوہات کی بناء پر فلمیں دیکھی جاتی ہیں وہ باقی نہ رہی تھیں۔
 بانگوں میں سڑکوں پر سب جگہ مجھے بے مصرف لوگ نظر آتے۔

یہ وہ دور تھا جب میں مکمل آزادی یا تمام تر فنا کے بالکل مقابل تھا۔
 گھر پر میرا کوئی کام نہ تھا۔ روشن مجھے دبی زبان میں آرام کرنے کو کہتی۔ لیکن مجھے گھر سے وحشت ہوتی تھی۔ باہر چلا جاتا تو بھی کوئی کام میرے کانے کا نہ تھا۔
 میں فٹ بال کی طرح کبھی اس کورٹ میں کبھی اس کورٹ میں بھاگتا رہتا ایک صبح مجھے روشن نے کہا..... ”اگر آپ چاہیں تو میں موچی چلی جاؤں اماں کے پاس.....“
 ”تمہاری مرضی ہے۔“

”آپ بتائیں۔؟“
 ”میں کیا بتاؤں اگر تم کو یہاں آرام ہے تو یہاں رہو ورنہ وہاں چلی جاؤ۔“
 وہ رونے لگی۔

”آرام تو مجھے یہاں زیادہ ہے لیکن..... لیکن میری وجہ سے آپ کو آرام نہیں ہے۔“

میں اس کے مقابل پلنگ پر بیٹھ گیا..... ”دیکھو روشن تمہاری وجہ سے مجھے کوئی تکلیف نہیں اس وجہ سے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“
 ہم دونوں چپ ہو گئے۔

”اس کا کیا جواب آیا ہے؟۔“
 روشن اٹھی اور نئے سوٹ کیس کی جیب میں سے یو اے ای کی ٹکٹ والا لفافہ نکال لائی۔

یہ خط اس کا تھا۔ روشن کے افتخار کا۔

”کیا لکھا ہے۔؟“

”آپ پڑھ لیں۔“

میں نے بڑی دیر میں خط پڑھا..... پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں جالے سے آرہے تھے تحریر معمولی تھی۔ پتنگ فروش کے بیٹے کی سیدھی سادی تحریر۔ لیکن تحریر میں حدت خلوص محبت سب کچھ تھا اس نے اصرار سے لکھا تھا کہ جتنی جلدی میں اسے آزاد کر دوں گا۔ وہ آجائے گا اور پھر دونوں واپس جا سکیں گے۔

”تم اسے لکھو کہ تم آزاد ہو اور ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”سب کچھ جلدی ہونا چاہیے..... میں..... میری حالت زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔“

“

”یہ تو افتخار پر منحصر ہے جتنی جلدی وہ آجائے گا معاملہ طے ہو جائے گا۔“

وہ چپ ہو گئی..... بڑی دیر چپ رہی۔

”میں جی پھر چلی جاؤں موچی دروازے۔“

”جیسا تمہارا جی چاہتا ہے روشن..... میں..... تمہاری زندگی میں کسی قسم کے فیصلے

نہیں کرنا چاہتا۔“

وہ اٹھی اور میرے پاس آکر بیٹھ گئی اس کے عورت پن کی خوشبو میرے اس قدر

قریب تھی کہ میں اس خوشبو کی وجہ سے ہی اپنے فیصلے بدل سکتا تھا۔

”آپ قانونی طور پر میرے شوہر ہیں آپ کا حق ہے میرے فیصلے بدلنے کا۔“

میں اٹھ کر سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر میں زرو سے کھانسا اور

تھوک دور پھینک کر عجیب لذت محسوس کی۔

”دیکھو اگر تمہارے خط آسانی سے موچی دروازے آسکتے ہیں تو وہی جگہ اچھی

ہے..... ورنہ.....“

”میں پھوپھی جان کے جاسکتی ہوں گلبرگ میں وہ..... وہ ماڈرن ہیں اور
..... افتخار کو پسند کرتی ہیں۔“
”جیسی تمہاری مرضی۔“

شام کو میں روشن کو لے کر پھوپھی جان کے گھر پہنچا وہاں روشن اور میرے لیے
ڈبل بیڈ والا کمرہ مخصوص تھا اس ڈبل بیڈ کو دیکھ کر میں بد کے ہوئے گھرے کی طرح
باہر کو بھاگا۔ میں روشن سے مل کر بھی نہ آیا۔ بلکہ پھوپھی جان پیٹری میں ٹرولی سجاتی
وہ گئیں اور میں باہر نکل گیا۔ عین کٹھی کے باہر جس وقت میں موٹر سائیکل موڑنے کی
کوشش میں تھا ایک لمبی سفید کارر کی اور ہارن بجا۔ گو میں حاضر نہیں تھا۔ پھر بھی وہیل
پر دونوں بازو رکھنے والا مجھے جانا پہچانا نظر آیا۔
”سہیل!..... سر۔“

پروفیسر نے دروازہ کھولا میں نے موٹر سائیکل چھوڑی اور پھر ہم دونوں شدت
سے بغل گیر ہو گئے۔

سہیل نے فرینچ کٹ داڑھی اور موٹے شیشوں کی ڈگ عینک پہن رکھی تھی اس
کے جسم پر سرخ چیک کی قمیض تھی جس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں اور
قمیض کے تین بٹن کھلے تھے اس کی جینز موری بند تھی اور کلائی پر ڈھ جمل گھڑی تھی۔
جس کا سیکنڈ کا پھول ہر سیکنڈ کے بعد بدلتا جاتا تھا وہ سارا کا سارا تمباکو کولون اور آفٹر
شیو لوشن سے مہکا ہوا تھا۔

”یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے کو جیک؟.....“ اس نے امریکہ کے مشہور گنجے ایکٹر
کے نام سے مجھے پکارا۔

”بس ایسے ہی؟..... سر۔“

یہاں کہاں پھر رہے ہو میری چچی کے گھر؟

”اپنی بیوی جمع کروانے آیا تھا۔“

”تو ہو گیا پڑا..... ختم ہو گئی تلاش..... کچھ نہ ملا زندگی میں.....؟“

یہ نے اپنا موٹر سائیکل وہیں پورچ میں رکھا اور ہم دونوں وارث روڈ چلے گئے
بڑی دیر سہیل مجھے امریکہ کے متعلق بتاتا رہا۔

”وہ ملک بھی کھوکھلا ہو گیا ہے..... انسانوں کی طرح ملک اور قومیں بھی ہمیشہ اپنی
کمزوریوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی خوبیوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں.....“ ہمیشہ
کی طرح وہ بہت چمک دار اور ذہین تھا اس کے چہرے پر تمام تر امریکی چھاپ تھی۔
”کیسے؟..... سر۔“

”خوبی وہ چیز ہے جس پر انسان خود اعتماد کرتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے لوگ
اس کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ خوبی اس کی اصلی اچھائیوں کو
کھانے لگتی ہے اسی خوبی کی وجہ سے اس میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اسی
خوبی کے باعث وہ انسانیت سے گرنے لگتا ہے..... فرد..... قومیں سب اپنی خوبیوں
کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔“

ہم دونوں وارث روڈ کی ایک بہت پرانی کوٹھی میں بیٹھے تھے اس کی چھتیں اینٹوں
کی تھیں اور باہر لال گیر و رنگ پھرا ہوا تھا گیٹ پر بوگن ویلا کی بیل کا سنی پھولوں
سے لدی تھی۔ گھر کے پچھواڑے بے مسلسل کوئی نلکہ چل رہا تھا جس کی مدھم آواز
آئے جا رہی تھی۔ کمرے میں پرانا فرنیچر، بوسیدہ پردے اور کین کا صوفہ تھا ایک
قالین جو کبھی ایرانی ہوگا۔ اب فرش سے چپکی ہوئی دری نظر آ رہا تھا کھڑکیوں میں
دھول سے اٹے کاغذی پھول تھے۔ سہیل کے خالو کا گھر تھا اور وہ امریکہ سے ایک
مہینے کی چھٹی پر صرف رشتہ داروں سے ملنے آیا تھا۔

بہت ٹھہر ٹھہر کر سوچتے ہوئے میں نے پرفیسر سہیل سے اپنے موجودہ حالات
کہے وہ چپ رہا۔

”پھر؟.....“

”پھر کیا؟.....“ میں نے جواب دیا

”پھر کیا ارادہ کیا ہے؟“

میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا..... اس نے کوئی مشورہ نہ دیا۔

”میں..... میں سارا وقت سوچتا رہتا ہوں سر..... کہ انسان کی روح کہاں جاتی

ہے؟..... موت کیا ہے؟ کیا موت سے ہمکنار ہوئے بغیر آدمی کبھی آزاد ہو سکتا ہے؟

..... مکمل آزاد.....“

سہیل ایک ماڈرن کپسول ساز زولی تھا۔ اس کی آنکھوں میں توجہ کی ایسی شعاعیں

تھیں جو ماڈرن تعلیم یافتہ آدمی کا سینہ شق کر کے اس پر اثر انداز ہو سکتی تھیں اور اس

کے باوجود اپنے گریڈ اپنے..... اپنے مستقبل کے لیے بڑی جدوجہد کرتا رہتا تھا۔

”آپ تو امریکہ سے آرہے ہیں وہ لوگ تو آج کل E.S.P پر بہت ریسرچ کر

رہے ہیں آپ کا کیا خیال ہے کیا روح واقعی کوئی چیز ہے؟..... کیا..... کیا..... انسان

واقعی موت کے دروازے سے نکل کر کہیں جاتا ہے گیا مابعد واقعی ہے؟“

”مغرب والے ابھی ابتدائی کوششوں میں ہیں مسمر ازم ہپنٹائزم اور سپر چولزم

جیسی کچھ میں نے وہاں دیکھی ہے یہ ایک طرح سے Consentrution کے

کرشمے ہیں تصور اور خیال کی مشق سے بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے لیکن عالم ناسوت

سے یہ لوگ آگے نہیں بڑھتے..... تمہیں اگر شوق ہو تو ایک بزرگ سے ملا دوں گا وہ

تصور اسم ذات سے اگلی دنیا کھولتے ہیں جس سے انسان عالم ناسوت سے پرواز کرتا

عالم ملکوت جبروت اور لاہوت میں جا داخل ہوتا ہے..... دراصل عالم ناسوت میں

جن رہتے ہیں خبیث روحوں میں رہتی ہیں..... اس لیے یہاں بہت خطرات ہوتے

ہیں کئی بار شیاطین یہیں نفس کے رفیق بن جاتے ہیں اور روح آگے نہیں بڑھ سکتی۔“

میں فریج کٹ داڑھی والے ماڈرن پروفیسر کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ میری مدد کر سکتے ہیں سر..... روح کے سفر میں۔“

”میں تو تمہاری مدد نہیں کر سکتا ہاں کسی ایسے شخص کی تلاش کی جاسکتی ہے جو تمہاری اعانت کر سکے یہ جو آسٹریل باڈی کے سفر ہیں ار جادو گروں کی ساحری ہے یہ سب ہمزاد کے کرشمے ہیں ان کا روح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہمزاد چونکی ساری عمر انسان کے ساتھ رہتا ہے انسان کی کوئی بات اس سے چھپی نہیں ہوتی جب حضرات بلائے جاتے ہیں یا ررو حیں حاضر کی جاتی ہیں تو یہی ہمزاد حاضر ہوتا ہے۔ یہی ماضی۔ کے واقعات بیان کرتا ہے۔

میں نے سوالوں کا طور مار باندھ دیا۔“

”میں زیادہ نہیں جانتا قوم..... میں خود تلاش میں ہوں تمہاری طرح راہرو ہوں..... دیکھو اگر تمہیں کوئی راستہ مل جائے تو مجھے اطلاع دے دینا..... مجھے خبر ہوگئی تو میں تمہیں انگلی پکڑ کر لے چلوں گا..... وہاں بھی بہت چھان بین کی میں نے لیکن کوئی راستہ نہیں ملا وہ لوگ بھی تلاش میں ہیں بہت صوفی سنٹر کھل گئے ہیں کئی بھگتی آشرم ہیں ان گنت ادارے ہیں Protetant,baptist لیکن ابھی کامل یقین کا وقت نہیں آیا..... نہ یہاں نہ وہاں.....“

میں بہت پریشان تھا میرے اندر کی آگ اب بہت بھڑک گئی تھی۔

”کسی طرح..... آپ میری ملاقات کسی روح سے نہیں کر سکتے..... میرے ابا کی روح سے..... میری ماں کی روح..... وہ..... وہ..... وہ مجھے اس کرب سے نجات دلا سکتے ہیں۔“

پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میں کچھ نہیں جانتا قوم..... کچھ تھوڑی سے سوچو بوجھ آگئی ہے..... لیکن صرف کتابوں سے مجھے یعنی یقین حاصل نہیں۔ بس میرے تمام علم کی طرح یہ بھی ایک Academic research ہے لیکن میں تلاش میں ہوں۔“

اس وقت پروفیسر سہیل سے ملنے تین جوان یونیورسٹی سے آ گئے انہوں نے رسا

تھوڑی سی باتیں کہیں پھر تینوں نے سگریٹ بجھا دیے۔ ایک میز پر ایک بڑا شیشہ رکھا گیا۔ درمیان میں گلاس پر سہیل اور دولڑکوں نے انگلیاں رکھ دیں اور کمرے کے پردے برابر کر کے صرف ایک موم بتی روشن کر دی گئی۔

اب روحمیں بلانے کا عمل شروع ہوا۔

”کوئی روح جو ادھر سے گزر رہی ہو۔ گلاس میں آجائے اور گلاس ہلا کر اپنے وجود کا یقین دلانے.....“ انگریزی میں سہیل نے کہا۔

ابھی سہیل کا استدعا کرتے ایک آدھ منٹ ہی گزرا تھا کہ گلاس ادھر ادھر سرکنے لگا۔

”آپ کس کی روح ہیں۔“

”میں رائیو گریڈ کے کنارے رہنے والا ایک برو جو ہوں.....“ روح نے مختلف الفاظ پر ججے کیے۔

”آپ کو مرے کتنے سال ہوئے ہیں۔“

”جب راپ پورٹ کے قریب پالشی قبیلے کی جنگ ہوئی تھی تو میں ایک انگریز کی گولی سے مارا گیا تھا۔“

”دنیا کا مستقبل کیسا ہے؟“

”تاریک!.....“

”کیوں؟.....“

”ہو پی قبیلے کی پیش گوئی کے مطابق شمال مشرق سے آنے والے ایک ایسا کدو ایجاد کریں گے جس میں راکھ ہوگی جب وہ کدر ہوا میں اچھالیں گے تو دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔“

سہیل نے گلاس میز سے اٹھا کر اس میں پھونک مار دی اور پھر ایک نئی روح کو

بلایا۔

”ہم سینٹ فراس آف اسکی کو بلانا چاہتے ہیں.....“ سہیل نے کہا
”کیوں؟.....“ نئی روح نے سوال کیا۔

”ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ انسان کی فلاح کس میں ہے۔“

“

”غریبی، عصمت اور اطاعتیں.....“ روح نے جواب دیا۔

”ہمیں سینٹ فاس بلا دو۔“

”وہ نہیں آسکتے۔“

”کیوں کیوں؟۔“ سب چلائے۔

”وہ جس عالم میں ہیں وہاں سے آیا نہیں جاتا۔“

مجھ پر اس مشغلے کا عجیب اثر ہوا۔ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ گیا۔ اور
میرے معدے میں شدید جلن اٹھی۔

”سہیل میرے ابا جی کو..... میرے ابا جی کو..... بلاؤ.....“

سہیل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا..... ”وہ
نہیں آسکتے قوم..... میں تمہیں بنا چکا ہوں یہاں صرف عالم ناسوت سے پیغامبر
آتے ہیں۔“

نوجوانوں نے شیشہ اور گلاس ایک طرف رکھ دیے اور سگریٹ پینے لگے۔ اب
گفتگو امریکہ کی جنسی زندگی کی طرف مڑ گئی۔ ابھی چند لمحے پہلے جو لوگ ارواح سے
ناطہ جوڑنے میں مگن تھے بڑے تپاک سے مغرب کی جنسی زندگی کے متعلق باتیں کر
رہے تھے۔ سہیل انہیں گروپ شادیوں کے متعلق کی رنگ سوسائٹی وائف
سو پینگ۔ سیکس شاپ اور بلوفلموں کے متعلق تفصیل سے بتا رہا تھا اس وقت وہ اس
قدر چسکے لے کر باتیں کر رہا تھا کہ مجھے شبہ ہوا وہ امریکہ میں سٹڈی ٹور نہیں کر رہا بلکہ
امریکہ کی انڈر ورلڈ میں مافیا کا جیتا جاگتا حصہ ہے۔ وہ امریکی لڑکیوں کے متعلق

ایسی انفرمیشن دے رہا تھا جو پلے بوائے رسالوں میں بھی ملنی مشکل ہے اس کی باتوں میں پوری اشتعال انگیزی تھی اور وہ اس وقت مجھے ایسا شیطان لگ رہا تھا جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے خرگوش جیسے کان ہوتے ہیں رات گئے تک وہ مینوں نو جوان بیٹھے رہے پاکستان کی ملکی سیاسی حالات روس اور امریکہ کی خارجی پالیسی خاص کر تھرڈ ورلڈ میں ان کی حیثیت اور خود ساختہ ایمپائر کے فرائض کی تشریح اسلامی اخوت اور ملت کا مستقبل تعلیمی مسائل ابلاغ کی حالت دریا غیر میں اور مقامی پالیٹکس میں، لڑکیوں کی آزادی اور پیشہ طلبی ملازمتوں میں گریڈ کی اونچ نیچ مہنگائی موسم فیشن بہت کچھ زیر بحث رہا۔ پروفیسر سہیل بے تکان اور بڑے سلیقے سے بات کرنے کا عادی تھا وہ جب بھی بات کرتا ایسے جیسے لکڑی میں ایک ہی ہتھوڑے سے کیل اندر دھنس جائے، وہ پہلے موضوع کو دوسرے آدمی کے سامنے پھینک دیتا چوڑنے کے بعد جب موضوع اس تک پہنچتا تو وہ اسے غلیل کے ربڑ کی طرح کھینچ کرتان کر نشانہ باندھتا اس میں دوسرے کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی اہلیت تھی..... بلکہ قائل..... کرنے کا مادہ تھا وہ بحث میں الجھے بغیر گفتگو کو مناظرے کی شکل نہ دیتے ہوئے اپنا مطلب منوانے میں کامیاب ہو جاتا اور یہی اس کی گفتگو کا خوبصورت ڈھنگ تھا جس کی بدولت وہ مختلف محفلوں میں اچانک چمکنے لگتا اور رفتہ رفتہ چھا جاتا رات گئے جب وہ مجھے لے کے باہر نکلا تو پورا چاند چمک رہا تھا۔

”آؤ چلیں۔“

”میں چلا جاؤں گا..... سر“ میں نے اصرار کیا۔

”کیسے جاؤ گے تمہاری موٹر سائیکل تو وہیں رہ گئی۔“

پہلی بار مجھے خیال آیا کہ اپنی موٹر سائیکل کو ساتھ نہ لانا بہت بڑی احمق پن تھا۔

”بیٹھو..... اور اندر سے اس قدر کس کرمت رہا کرو۔ relax relax رات کے

ڈھائی بجے میں پھوپھی کے گھر پہنچا۔ کار جس وقت پھانک تک پہنچی دو بڑے بڑے

اسیشن کتے اندلان سے بھونکتے اور بھاگتے ہوئے آئے اور پھانک کے اوپر پاؤں رکھ کر بھونکنے لگے۔ کافی دیر تک اندر سے کوئی نہ آیا۔ ہم دونوں بھی کتوں کی وجہ سے کار کے اندر ہی بیٹھے رہے پھر بوڑھا خانساں اور روشن برآمدے میں آئے پہلے پورچ کی دو بتیاں روشن ہوئیں پھر خانساں اور روشن گھر کے پھانک کی طرف آئے خانساں نے دونوں کتوں کو گلے کے پٹکے سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ روشن میری طرف بڑھتی آئی میں نے پروفیسر سوہیل سے خدا حافظ کہا اور اندر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”افسوس میں موٹر سائیکل یہیں چھوڑ گیا ورنہ یہاں نہ آتا۔“
 ”اچھا ہوا کہ..... کہ آپ آگئے پھوپھی جان بار بار پوچھ رہی تھیں۔“
 ”کیا؟“

”کچھ نہیں جی..... بس یہی.....“

ہم دونوں چپ چاپ اندر کی طرف چلے۔

ڈبل بیڈ پر لیٹنے سے پہلے اس نے اونچی آواز میں کہا

”افتخار کا خط ہے..... آپ دیکھ لیں۔“

میں غسل خانے کے اندر روشن کے برش سے دانت صاف کر رہا تھا۔

”اے رکھو.....“ میں نے اندر سے کہا۔

”آپ پڑھ لیں جی۔“

باہر آ کر میں نے سعودی عرب کا نیلا ایرو گرام کھولا لکھا تھا۔

ہم دونوں چپ ہو گئے پھر کچھ دیر بعد وہ ڈبل بیڈ کے ایک کنارے اور میں

دوسرے کنارے پر لیٹ گئے۔ اب بھی ہم میں دو بازو بھر فاصلہ تھا بتیاں بجھا دی

گئیں تو چھلی کھڑکی سے پوری چاند کی روشنی اندر آئے گی۔

”آپ کو روشنی بری لگتی ہو تو کھڑکی کے آگے پردہ کر دوں.....؟ روشن نے بڑی

دیر کے بعد پوچھا۔“

”نہیں ٹھیک ہے۔“

ہم دونوں ہمیشہ ایک ہی کمرے میں رہے تھے لیکن ہمارے پلنگ ہمیشہ علیحدہ تھے اس ڈبل بیڈ نے دوری اور نزدیکی کا ایک اور بکھیرا کھڑا کر دیا۔

بڑی دیر بعد میں نے سوال کیا..... تمہارا پاسپورٹ تیار ہے؟“

”ہاں جی..... وہ تو..... وہ تو افتخار نے جانے سے پہلے بنوا دیا تھا۔“

”اچھا۔“

پھر ہم دونوں میں خاموشی چھا گئی۔

”اگر تم کو کوئی خرید و فروخت کرنا ہو تو پیسے مجھ سے لے لینا۔“

”نہیں جی۔“

بڑی دیر تک وہ آنکھیں کھولے چھت کو دیکھتی رہی میں نے کروٹ بدل لی۔

”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں غسل خانے کی بتی جلا لوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ضرور۔“

اس کے بعد میں نے سر کے نیچے سے تکیہ اٹھایا اور اپنے چہرہ پر لے لیا مجھے معلوم

نہیں وہ چاند رات میں غسل خانے کی بتی جلا کر جاگتی رہی کہ سو گئی۔

پکی سڑک کے کنارے فرو پیسر سہیل نے گاڑی پارک کر دی اور ہم سائیں جی

کے ڈیرے کی طرف پیدل طلنے لگے۔ یہ ڈیرہ پکی سڑک سے قریباً پونے دو میل دور

تھا رواستہ میں ایک نہر کئی کھیت کیکر کے درختوں کے جھنڈ پرانے بے آباد بھٹے مٹی

کے ٹیلے اور جھاڑیوں آئیں۔ سارا راستہ سائیں جی کے کشف و کرامات کے متعلق

بتاتا رہا امریکہ پلٹ سہیل پوری عقیدت سے سائیں جی کا متعرف ہو رہا تھا۔

”وہ چاہیں تو موت کا حجاج اٹھا کر تمہیں ادھر کی دنیا کا رخ دکھا سکتے ہیں۔“

”تمہاری پریشانی کا حل کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ مجھے کتابوں سے کوئی راستہ مل سکتا ہے لیکن جب تک سائیں جی کے ڈیرے پر نہیں پہنچتا میری پریشانیوں کا حل نہیں ملا۔“

”تو کیا اب آپ Anxiety سے آزاد ہو چکے ہیں سر؟“
 ”نہیں.....“

”تو پھر حاصل؟.....“

”انسان کو دنیا میں ایک سب سے بڑی پریشانی ہے قیوم..... وہ پائیدار ہونا چاہتا ہے اور مور کے ہوتے ہوئے وہ کبھی مستقل نہیں ہو سکتا۔ انسان کی ہر پریشانی کا تجزیہ کرو اصل میں پریشانی موت سے پیدا ہوتی ہے..... آرزو کی موت راحت و خوشی کی مرگ..... دیکھو تو آدمی ہر وقت مرتا رہتا ہے بدن کی موت تو آخری نفل ستاپ ہے موت کی جھلکیاں چھوٹی موٹی ملاقات تو روز ہوتی ہے موت سے۔“
 ”مجھے اب فلسفہ نہیں چاہیے پروفیسر سہیل..... میرا خیال ہے زیادہ سوچ نے میری زندگی میں بار دو بھر دیا ہے۔“

”سائیں جی سے ملو گے تو پتہ چلے گا موت کچھ نہیں ہے..... وہ پردہ اٹھا کر دکھا دیں گے کہ کیسے انسان اس جسم کو چھوڑنے کے بعد پھر ابدی زندگی پالیتا ہے..... جنت وہ جگہ ہے جہاں خوشیاں کی موت نہیں آرزو کی مرگ نہیں..... موت نہ ہوتی موت کا شعور نہ ہوتا تو آدمی کبھی غم سے آشنا نہ ہوتا..... دیوانہ نہ ہوتا!“
 ”وہ مجھے ابا کی روح سے ملادیں گے۔“

وہ پتہ نہیں کیوں مجھ سے نظریں چرانے لگا۔

ڈیرے پر مکمل خاموشی تھی کھلا احاطہ تھا جس میں ایک طرف چھوٹی سی کچی مسجد تھی مسجد کے احاطے میں چٹائیوں پر دو سفید ریش بزرگ بیٹھے کجور کی گھلیاں ہاتھوں میں لیے ذکر میں مشغول تھے۔ ایک ہرا جھنڈا سائیں جی کے کوٹھے پر لہرا رہا تھا

سارے میں گرمیوں کی دوپہر چھائی تھی۔ ڈیرے پر کوئی درخت نہ تھا پھر بھی کہیں سے کول کی آواز گرد آلود آسمان کو چیر کر پہنچ رہی تھی۔ سائیں جی کے کپے کوٹھے میں ٹھنڈک اور شانتی تھی وہ کھجور صف پر کہنی کے بل نیم دراز نہ تھے اور ان کا ایک مرید کھجور پٹکے سے انہیں جھل دے رہا تھا کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے چند لمحے تک کچھ نظر نہ آیا۔ سائیں جی کا مشفق چہرہ اور لمبی سفید ریش بہت بعد میں نظر آئی۔

”آؤ بیٹھو بیٹھو آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔“

سائیں جی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، اب کے جسم پر تہہ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ چھاتی کے سفید بال سینے کو ڈھانچے چمک رہے تھے۔

”جا بھائی ان کے لیے چائے لا۔“

مرید نے پٹکھا چھوڑا اور حق سائیں کہہ کر ڈیرے سے نکل گیا پتہ نہیں چائے کہاں پکتی تھی کیونکہ بظاہر نہ کہیں دھواں تھا نہ چولہا۔ مجھے لگا جیسے ڈیرے پر ہمزاد کچی پکائی چیزیں اتارتے ہوں۔

”آرام سے کھلے ہو کر بیٹھیں.....“ سائیں جی نے مجھے کہا اور پھر کتنی ہی دیر اللہ اللہ کرتے رہے۔ کجراتی پیالوں میں گرم گرم چائے آگئی۔ کچھ عرصہ بعد تندوری روٹیاں مکھن اور مچھلی کا طشت لے کر ایک اور مرید حاضر ہو گیا۔

”لنگر کریں..... لنگر میں برکت ہوتی ہے۔“

ہم مودب انداز میں کھانا کھانے لگے۔ میں خاموش تھا لیکن ڈسکٹر سہیل سلوک کی مختلف منزلوں پر سائیں جی سے تبادلہ خیال کر رہا تھا گفتگو میں خاص ٹیکنیکل توجیہات کی وجہ سے بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

”اچھا تو آپ کے دوست دعوت الارواح کی مجالس میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔“

”جی میں اپنے باپ کی روح سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”بیٹا اگر یہ فقط تجسس کے لیے ہے تو باز رہو اگر باطنی فتح کی خاطر مطلوبہ روح کی رویت چاہتے ہو تو ہم راستہ بتا دیں گے۔“

”کیسے؟ حضور کیسے؟ سائیں جی میں بہت بے قرار رہتا ہوں۔“

”خواب میں چاہو تو خواب میں..... مراقبے میں استغراق میں چاہو تو ویسے عالم بیدار میں روح کو تجسم دیکھنا چاہو تو اس طرح۔“

”کیا روح دوبارہ جسم میں آسکتی ہے سائیں جی۔“

”روح دوبارہ جسم میں نہیں آتی۔ لیکن جس صورت میں مشکل۔ ہونا چاہے ہو سکتی ہے۔ ملائکہ جنات بھی یہ قدرت رکھتے ہیں..... لیکن بیٹا کیسویں شرط ہے۔“

”کیسویں کی کوشش کروں گا تو سائیں جی.....“ میں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”ہم تم کو ایک طریقہ بتاتے ہیں..... اسم ذات کسی کاغذ پر لکھ پر دیوار پر ٹانگ لینا ایسے کہ تمہاری نظریں اس کے متوازی ہوں پھر آرام دہ تکیے سے ٹیک لگا کر اس کر دیکھنا اور پاس انفاس جاری رکھنا..... روز..... بلاناغہ پہلے پانچ منٹ پھر ہر دن کے ساتھ ساتھ ایک مناور..... ظلمات پھری جب دور ہونے لگیں گے تو خود بخود عالم ملکوت کا راستہ کھلے گا۔“

میں نے اس سے پاس انفاس کا طریقہ سیکھا بڑی دیر تک اس عمل کا تجزیہ ہوتا رہا کہ لاکھ کیسے کہا جائے اور اللہ کی ضرب کیسے قلب پر جاری کی جائے۔

کچھ دیر کے لیے سائیں جی نے مجھے پاس انفاس کا ورد پر کیٹیکل شکل میں کر کے دکھایا۔

”کتنے دن یہ عمل جاری رکھنا ہوگا سائیں جی۔“

سائیں جی ہلکا سا کرائے۔ کڑی دھوپ میں جیسے نیم کی گھنی چھاؤں۔

”بیٹا یہ تو سالک کی اپنی لگن پر منحصر ہے کچھ لوگ دنوں کی منزل سالوں میں طے کرتے ہیں کچھ سالوں کو لمحوں میں پار کر جاتے ہیں اونگھنے سونے یا سستی کرنے سے

راستہ کھوٹا ہوتا ہے..... جب یہ مشق ہوگی تو اندھیرے میں بھی اسم ذات نظر آنے لگے گا۔ اس وقت تم کسی چیز کو بھی متوجہ کر کے اسے اپنی طرف کھینچنے کی قوت اپنے میں پاؤ گے۔“

یکدم روشن کا شرچہ میری نظروں میں گھوم گیا
 ”جب یکسوئی کا مرحلہ طے ہو گیا تو پھر قوت ارادی کا عمل بتائیں گے۔ جب یکسوئی تصور و قوت ارادی مضبوط ہو گئے تو پھر لطیفہ خفی کا مقام کھلے گا۔“
 ”لطیفہ خفی کا مقام؟.....“ میں نے لجاجت سے سوال کیا۔

”دوا بروؤں کے درمیان لطیفہ خفی کا مقام ہے جس طرح ناسوتی چیزوں کو دیکھنے کے لیے آنکھ کام دیتی ہے جب باطنی آنکھ کھلے گی تو روح ملائکہ اور دیگر باطنی اشیاء خود بخود ﷺ نظر آنے لگیں گی۔“
 ”کیا میری باطنی آنکھ کھل سکے گی؟“

”ہاں بھی کیوں نہیں..... بچہ جو دیکھ ہے سمجھتا ہے؟ ارد گرد کے لوگ بتاتے ہیں یہ گھوڑا ہے یہ بلی ہے ایسے ہی ہر آدمی اپنی باطنی آنکھ سے کچھ نہ کچھ کبھی نہ کبھی دیکھتا ہے لیکن سمجھ نہیں سکتا۔ رہنمائی شرط ہے جب یہ مرحلے طے ہو جائیں گے تو ہم تم کو ایسا رو دیتا دینگے جس سے روح عالم شکل میں آکر تم سے خود ملے گی ان کی زیارت کے وقت اگر فیض چوہو گے تو کئی منزلیں طے ہو جائیں گی۔ دنیاوی رہنمائی کی آرزو کھو گے تو وہاں اعانت کریں گے۔ لیکن بہتر یہی ہے روحانی فیض حاصل کرو۔“

میں خوفزدہ ہو کر تھیل کی طرف دیکھا..... ”یہ تو بہت لمبا کام ہے سر..... کون جانے یکسوئی نصیب ہونہ ہو..... قوت ارادی مضبوط ہو سکے نہ سکے۔ سائیں جی کوئی چھانا راستہ نہیں ہے..... کوئی شارٹ کٹ۔“

”ہے!“

”بتائیے خدا کے لیے بتائیے۔“

”بزدل ہو؟“

”جی کوئی خاص نہیں“ شاید ہوں بھی۔“

”اندھیرے سے تو ڈر نہیں ااتا“

”نہیں جی۔“

”شیطانی آوازوں سے تو نہیں گھبراتے؟“

پروفیسر سہیل نے میری طرف نظر ڈالی جیسے وہ مجھے روکنا چاہتا تھا۔

”جی نہیں۔“

”تو آؤ میرے ساتھ۔“

ہم دونوں اٹھ کر سائیں جی کے پیچھے پیچھے چلے، وہ ہمیں ڈیرے سے کوئی دو فرلانگ دو لے گئے یہاں مٹی کے اونچے نیچے تو دے اور بکائن کی جھاڑیاں تھیں۔ ان ہی ٹیلوں کی راٹ میں ایک پکی قبر بنی تھی۔ جب ہم قبر کے قریب پہنچے تو نظر آیا کہ قبر کے اندر جانے والی سیڑھیاں صاف نظر آرہی ہیں جس وقت سائیں جی قبر میں داخل ہوئے اس لمحے پروفیسر سہیل نے خوف سے میری جانب دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن میں دور تک فیصلہ کر چکا تھا اس لیے آہستہ آہستہ سائیں جی کے پیچھے پیچھے اترنے لگا آتھ سات سیڑھیاں اتر کر ہم قبر کے اندر پہنچے تو گھپ اندھیرا تھا غم مٹی کی خوشبو آرہی تھی اور باہر کی نسبت اندر تھنڈک تھی۔

سائیں جی نے اندر جا کر ماچس جلانی اندھی کھوہ میں لپائی بڑی نفاست سے کی ہوئی تھی اور ایک طاقتے میں قرآن کریم ریشمی کپڑے میں ملفوف دھرا تھا سائیں جی نے موم بتی روشن کر کے طاقتے میں رکھ دی کیونکہ قبر کے اندر کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی اس لیے ہم کمریں جھکا کر ایستادہ تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“

ہم دونوں لیے ہوئے فرش پر سائیں جی کے پاس بیٹھ گئے۔

”یہ ہماری قبر ہے یہاں ہر رات ہم قرآن کریم کی تلاوت کرنے کے لیے آتے ہیں اور اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں۔“

آپ کے پیر و مرشد بھی یہاں آتے ہیں؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
 ”ان کے وصال کو چالیس سال ہو چکے ہیں لیکن یہاں وہ باقاعدگی کے ساتھ ہمیں ہدایت دینے آتے ہیں۔“

”سائیں جی..... آپ کو یہاں ڈرنے لگتا.....“ پروفیسر ہیل نے سوال کیا۔
 ”جس بشر کے ساتھ ظلمات بشری ہوا سے ڈر لگتا ہے جس اس جہالت سے نکل جاتا ہے وہ نور ہدایت سے منور رہتا ہے خوف اور بزدلی اسے چھو نہیں سکتی۔“
 قبر کی چھت سے نا معلوم سی مٹی چھن چھن کر گر رہی تھی۔
 ”برخوردار اگر تم کو اپنے والد کی روح سے ملنا ہو تو یہاں مل سکتے..... ہو۔“
 ”جانے دو یا ر.....“ آہستہ سے ہیل نے کہا۔

”ہاں میں تیار ہوں۔“

”پہلے چار ہفتے تم میرے ساتھ یہاں آؤ گے۔ پھر ایک جمعرات ہم باہر ہوں گے تم اندر ہو گے۔ تم کو اپنے والد کی روح ملنے آئے گی یا در کھو روح گزند نہیں پہنچاتی۔ لیکن اس کی ہیبت بہت ہوتی ہے ہم باہر ہوں گے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔“

”ٹھیک ہے سائیں جی میں تیار ہوں.....“ میں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

”تم کو اپنے والد کی قبر کا نقشہ یاد ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔

چندرا کا سارا گاؤں میری نظروں میں گھوم گیا۔..... کلر کھائی زمینیں، دو منزلہ چھوٹا اینٹ کی حویلی..... اماں کا کھلا صحن جس کے ایک طرف دیوار زدہ تخت پوش پڑا تھا۔ اوپر چڑھنے والی گول سیڑھیاں اور چوتھی سیڑھی کی ٹوٹی ہوئی اینٹ مٹی کے ساتھ

بوڑھے گدھ جیسا میرا باپ..... مجھے تو یہ معلوم نہ تھا کہ ابازندہ تھا کہ مر گیا؟ اس کی قبر کہیں تھی بھی کہ نہیں؟

”سائیں جی مجھے اپنے والد کی قبر کا نقشہ یاد نہیں“

سائیں جی نے دونوں ابرو اٹھا کر پوچھا..... ”بیٹا پھر زیارت کیسے کرو گے باپ کی قبر کو ہی تو یہاں بیٹھ کر یاد کرنا ہوگا۔“

سہیل نے مجھے کہنی مار کر کہا..... ”کس بکھیڑے میں پڑ گئے ہو..... چلو.....“

”بیٹا ملاقات صرف اسی کی ہو سکتی ہے جس کی قبر کا نقشہ ذہن میں ہو۔“

یکدم سیسی میری نظروں میں گھوم گئی پتہ نہیں اتنی دیر میں نے باپ کی رٹ کیوں لگا رکھی تھی؟ مجھے سیسی سے ملنے کی آرزو تھی میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ دنیا کے جہنم سے نکل کر کیا اب وہ شانتی سے ہے کہ اب بھی اس کی روح لندن کی سڑکوں پر آفتاب کے تعاقب میں بھٹکتی ہے؟ کبھی اسے میرا خیال بھی آیا ہے کہ مرنے کے بعد فروعی تعلقات یاد نہیں رہتے۔؟

”کسی لڑکی کے بارے میں سوچ رہے ہو بر خوردار۔؟“

میں نے گھبرا کر سائیں جی کی طرف دیکھا۔

”جی..... میں اس سے ملنا چاہتا ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں وہ کہاں دفن ہے؟“

”ہم تمہیں بتا چکے ہیں قبر کے تصور کے بغیر یہ عمل بیکار ہوگا۔“

اتل؟

اتل کہاں دفن تھی کیا وہ میانی صاحب کے نشیبی علاقے میں دفن تھی کیا راوی کے آس پاس اس کا استانہ تھا۔

میری ماں؟

ماں کی قبر کا نقشہ بھی مجھے یاد نہ تھا..... پتہ نہیں اس کی قبر کو کھرچاٹ گیا یا شاید وہ مائی تو بتو بہ کے پتلوں کی طرح مٹی پر بے آسرا ہی پڑی ہو کہیں؟

”سائیں جی کیا سہی مجھے مل سکتی ہے۔“

پروفیسر سہیل نے مجھے کہنی مار کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”مل تو سکتی ہے بیٹا لیکن اس کی قبر کا تصور تو لانا پڑے گا ذہن میں۔“

میں نے سر جھکا لیا آخری بار جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ ہسپتال کے لال کمبل میں لیٹی ہوئی تھی۔

”اچھا سائیں جی اجازت دیں؟“

پروفیسر سہیل اٹھ کھڑا ہوا اور ہم دونوں قبر سے باہر نکلنے لگے۔

”اچھا بیٹا تم کل آنا..... ہم تمہارے لیکچر سوچیں گے۔“

واپسی پروفیسر سہیل نے کار بہت تیز چلائی اور کئی جگہوں پر بریکیں لگائیں۔ وہ بہت مضطرب تھا، وارث روڈ کی کوٹھی میں داخل ہونے کے بجائے اس نے گیٹ کے سامنے کار پارک کر لی پارکنگ لائیٹر کی وجہ سے سڑک پر ہلکا سا چائن ہو گیا۔ پھر اچانک ایک بوسیدہ عمارت کے پیچھے سے پورا چاند رسی ٹاپا سامنے آ گیا ہمیں دیکھتے ہی اس نے اپنی رسی دائرے کی شکل میں اپنے گرد پھیلاتی اور ساکت ہو گیا۔

”یتم بار بار سہی سے ملنے کی آرزو کیوں کر رہے تھے؟“

میرے پاس اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔

”میں تمہیں بہت لیکچر دیتا رہا ہوں لیکن ابھی تک بہت احمق ہو سٹوڈنٹ

..... سائیں جی برگزیدہ ہستی ہیں کشف و کرامات سے آگے نکلے ہوئے ہیں ایسے

بزرگان دین سے سہی ویکی کا ذکر نہیں کرتے۔“

پھر ان سیموں کا ذکر کن سے کرتے ہیں سر؟ کن سے۔

”مجھ جیسے فری سٹائل پروفیسر سے جو تمہیں دنیا کے علم کے مطابق ایسی باتوں کا

حل بتائیں۔“

”پھر بتائیں حل۔؟“

وہ سر کھجانے لگا..... ”گو میں خود بہرا لجھا ہوں اس سیمی کے ٹاپک میں..... لیکن جھببغلی راستے ملتے رہے ہیں تم میں وہ صلاحیت نہیں ہے۔“

مجھے کوثر یاد آگئی اسی نے مجھے بتایا تھا کہ پروفیسر سہیل بھی سیمی کا گرفتہ رہ چکا ہے۔
”یار..... یہ لڑکیاں بڑی لعنتی چیز ہیں پتہ نہیں چلتا کہ کہاں اتر چکی ہیں
..... تمہارے اندر..... خاص کر سیمی شاہ تو بہت ہی دور تک اترنے والی تھی..... تھی
.....؟“

”تھی جی..... بہت“

”پچا رے پروفیسر بھی کیا کریں وہ بھی جب کہ وہ عمر میں اپنے طالب علموں سے
کچھ ہی سال بڑے ہوں۔“
میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”پروفیسر کی شان یہ ہے کہ باپ بن کر رہے گرو بن کر رہے
..... اور..... لڑکی..... یہ چاہتی ہے کہ پروفیسر سر پر راکھ ڈال کر پیچھے پیچھے چلے
..... لعنت ہے اس مخلوط تعلیم پر!“

”سہیل اور میں بہت دیر کا میں بیٹھے باتیں کرتے رہے امریکہ سے واپسی پر وہ
میرا پروفیسر نہیں رہا تھا دوست بن گیا تھا۔ ایک طرح سے دوست تو وہ شروع دن
سے تھا لیکن اب وہ مراتب کا لحاظ بھی جانتا رہا تھا۔ جب ہم دونوں نے تیسری ڈبیا
سگریٹ کی شروع کی تو سہیل بولا..... یا لڑکی آخر چیز کیا ہے..... کچھ سمجھنے نہیں
دیتی۔ کہیں پہنچنے نہیں دیتی۔ ہمیشہ ہر سوال کے سامنے اور ہر جواب کے پیچھے آکھڑی
ہوتی ہے۔“

میں حیرانی سے اس کا چہرہ تنکے لگا۔ فرنچ کٹ داڑھی اور سرخ چیک کی بش شرٹ
میں یہ نوجوان مجھے کچھ اجنبی سا لگا کبھی اس نے کسی ٹاپک پر ہار نہیں مانی تھی۔

”آج تک ہمیشہ تم نے اپنی مشکلات کا مجھ سے ذکر کیا ہے آج میں تمہیں اپنے اندر کی زندگی کے متعلق کچھ بتاؤں گا۔“

بڑے تعجب کی بات تھی کہ ابھی تک میں نے کٹھی ڈاکٹر سہیل کی زندگی میں دلچسپی نہ لی تھی۔ وہ میرے لیے فقط علم کا Bionic Man تھا بغیر جذبات کے علم اگلنے والا۔

”جب تم لوگ کالج میں داخل ہوئے ہو..... اس وقت میں اونچی اڑانوں میں تھا سٹاف روم میں میری باتیں سن کر Extension سے چمٹے ہوئے پروفیسر دنگ رہ جاتے میں علم کے بل بوتے پر ایک بڑا حسین و جمیل فرعون بن گیا تھا اندر سے مجھے کسی کی پروا نہ تھی۔“

”اب ہے..... سر۔“

”ہاں ہے..... اپنی تھیوری کی..... یاد ہے رزق حرام کی تھیوری۔“

”خدا کے لیے اسے دوبارہ نہ دہرانے لگ پڑیں۔“

”نہیں اسکی چند راں ضرورت نہیں میں اپنی کتاب چھاپنے کے لیے امریکہ کے ایک پبلیشر سے بات کر رہا ہوں رزق حرام کی تھیوری پر تم سے بات ہوگی لیکن بزبان انگریزی ہوگی۔“

”پھر سر جب ہم داخل ہوئے تب؟“

چاندنی عادت ہے جب کبھی راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہوں وہ کسی نہ کسی درخت کی اوٹ سے نکل آتا ہے۔ اور کسی پھا پھا کلنی کی طرح ساری باتیں چوری چوری سنتا رہتا ہے اس وقت بھی پورا چاند وارث روڈ پر نہ جانے کیوں اٹلا ہو گیا تھا اور ایک کوٹھی کی تیسری منزل سے پورا نکلا ہوا ہماری باتیں سنے جا رہا تھا۔ ایسی لڑکی کی طرح جو اپنے باپ کی موجودگی میں اپنے منگیتر کی رنگین Slides نہیں دیکھ سکتی اور آدھا دروازہ کھول کر اندھیرے میں اپنے چند رماں کو دیوار کی سطح سے ٹمٹا دیکھتی ہے۔

”اتنے سارے علم کے باوجود..... اتنی بے اعتنائی دکھانے پر بھی وہ سبھی شاہ میرے دل میں گھستی چلی گئی میرے دل میں اگر علم کا تکبر اتنا نہ ہوتا تو شاید میں اسے لے اڑتا لیکن علم خود ایک حجاب ہے میرا خیال تھا کہ وہ میرے سامنے زانو ٹیک دے گی لیکن ابھی میں اپنے علم کو آگ نہیں لگا سکا تھا کہ آفتاب درمیان میں کود آیا۔ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کوئی عورت پسند کرتی ہے..... تھانا.....“

”تھا..... سر.....“ میں ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم سب حیران تھے کہ..... کہ سبھی شاہ اچانک کالج کیوں چھوڑ گئی اور آفتاب نے اس سے شادی کیوں کی..... یہ بات تمہارے لیے معصوم تھی.....؟“

”اب بھی ہے۔“

”وجہ میں تھا..... میں برا آدمی نہیں ہوں۔ devil نہیں ہوں مائی ڈیرسٹو ڈنٹ..... لیکن اتنے سارے علم کے باوجود میں اپنے Emotions پر قابو نہ پاسکا..... ان دنوں میں اس قدر شدید حسد کا شکار ہو گیا کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے..... آفتاب مجھ سے بہت متاثر تھا میں طالب علموں کو متاثر کیے بغیر اپنی نوکری کو حلال ہی نہیں سمجھتا۔“

”مجھے یاد ہے سر..... وہ سارا وقت آ کی مالا جپتا تھا۔“

”جیسے تم..... مجھ سے متاثر ہو..... سہیل نے دھواں چھوڑ کر کہا..... لیکن تم دونوں مجھ سے نہیں میرے علم سے متاثر تھے۔“

”بس دو شامیں آفتاب نے میرے ساتھ ہوٹل میں گزاریں اور پھر اسے سبھی سے محبت ہو رہی ہوگی لیکن وہ سبھی سے شادی پر رضامند نہ رہا..... میں نے اسے بدل کر دیا سبھی سے۔“

”آپ نے..... آپ وجہ تھے.....“ مجھے وہ ساری باتیں یاد آرہی تھیں جو شادی کے دن آفتاب نے مجھ سے تالاب کنارے کی تھیں وہ ساری گفتگو پر و فیسر سہیل

سے..... تھی

”ہاں میں ہی وجہ بنا..... میں..... سبھی میری طرف چروع چروع میں مائل تھی لیکن آفتاب کو میں نے یقین دلادیا کہ وہ کسی ایک مرد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی سبھی میں محبت تو تھی وفا نہیں تھی۔“

”یہ آپ نے کیا کیا؟..... وہ تو سر سے پاؤں تک وفا تھی سر..... اس نے تو آفتاب کے لیے جان دے دی۔“

سہیل نے بالوں میں ہاتھ پھیر کر کہا..... ”ہاں یہ میں نے کیا کیا قیوم..... بہت دیر میں اس guilt میں مبتلا رہا لیکن اب نہیں..... بہت سے راستے کھلے ہیں مجھ پر اس احساس جرم کا دروازہ کھلنے کی وجہ سے..... بہت کچھ عطا کیا ہے مجھے اس guilt نے۔ اب میں علم کا تعاقب حکم اور انکساری سے کرتا ہوں پہلے میں اسے تلوار کی طرح استعمال کرتا تھا۔ میں کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا مجھے طبقاتی احساس کمتری نہ تھا چہرہ مہرہ بھی قابل قبول تھا..... اس لیے یہ احساس کمتری پیدا نہ ہو سکا..... شکر ہے جوانی میں guilt کا زہر رگوں میں اتر گیا ورنہ اپنے عہد کا پورا شیطان ہوتا مجھے بھی اس guilt نے بڑی مار دی ہے۔“

ہم دونوں چپ ہو گئے بہت دیر چپ رہے۔

”

پتہ نہیں آفتاب کا کیا حال ہے؟ وہ کہا پہنچا ہے اگر کبھی وہ تمہیں مل جائے تو مجھے امریکہ خط ضرور لکھنا میں چاہتا ہوں کہ وہ خوش رہے اتنے علم کی وجہ سبب تو خوش نہیں رہ سکے۔“

”کب جا رہے ہیں آپ واپس؟“

”پڑوسوں ایک مہنے کی تو چھٹی تھی۔“

”اتنی جلدی۔“

اس نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا..... ”یا روقت کی حیثیت کیا ہے؟..... نہ گزرنا چاہیے تو گزرا نہیں جاسکتا گزرنا چاہیے تو یوں..... جاتا ہے یوں۔“

میں آخری بار ان کا چہرہ دیکھا اور بولا..... ”کیا آپ کو علم نہ تھا کہ آپ دو زندگیوں سے کھیل رہے ہیں؟ اتنے سارے فلسفے..... اتنے سارے علم کے باوجود۔“

”ہاں اتنے سارے علم کے باوجود میں اپنے فعل پر قادر نہ تھا..... یہ علم کا سب سے بڑا المیہ ہے میرا نہیں۔“

میں کار سے اتر اتو اس نے پاتھ بڑھا کر کہا..... ”قیوم ہاتھ نہیں ملاؤ دے آخری بار.....؟“

میں گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... ”سر..... سر مائی ڈارلنگ سر۔“
”یقین ماننا اس گناہ کے علاوہ میری سلیٹ بالکل پاک ہے..... اور اب مجھے اس گناہ پر افسوس بھی نہیں..... شاخیں جب تک کاٹی نہ جائیں درخت تن آور نہیں ہوتا.....“

ہم دونوں دیر تک ہاتھ ملائے ٹھہرے رہے پھر اس نے پورے زور سے Accelerator کو دبایا اور چاندنی رات میں گرداڑا تا وارث روڈ سے باہر نکل گیا۔ اس وقت گاڑی تیز چلانے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔!

جس وقت میں روشن کی پھوپھی کے گھر سے اکلا روشن میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔

”پھر جی؟۔“

”تم فکر نہ کرو میں خود افتخار کو لینے ایئر پورٹ جاؤں گا۔“

”اچھا جی۔“

میں کئی دنوں بعد روشن سے ملنے پھوپھی کے گھر گیا تھا۔

وہ میرے پیچھے چلی آرہی تھی اور میں پیچھے دیکھ بغیر اینگل آرن کے سفید

پھانک کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”میں سوچتی تھی جی کہ..... کہ میں بھی چلتی ائر پورٹ آپ افتخار کو کیسے پہچان سکیں

گے۔“

یکدم مجھے خیال آیا کہ واقعی میں افتخار کو کیسے پہچان سکوں گا؟

”آپ تکلیف نہ کریں میں پھوپھی جان کی کار میں وہاں پہنچ جاؤں گی وقت پر۔“

“

افتخار اپنے گھر والوں کو اطلاع دینے بغیر پندرہ دنوں کی چھٹی پر آ رہا تھا خطوں میں

اتنی بات طے پا گئی تھی کہ وہ اچانک آئے گا اور کراچی سے ہمیں ٹیکس دے کر مطلع کر

دے گا۔ اس کے بعد کچھ قانونی کام تھے۔ یعنی افتخار کا روشن کے ساتھ نکاح اور میرا

روشن کو طلاق دینا یہ سارے کام نبھانے کے بعد افتخار کو اپنے گھر موچی دروازے

طلے جانا تھا مجھے اپنے گھر ساندہ کلاں میں اور افتخار کی روانگی تک روشن کو وہیں پھوپھی

کے گھر ٹھہرنا تھا۔ ساری سکیم میں گھرگی پھوپھی شامل تھی لیکن بار بار اس کا تقاضا ہوتا

کہ کہیں بات نکل نہ جائے وہ روشن کی مدد کرنے کو تیار تھی بلکہ مغربی فلمیں دیکھ دیکھ کر

اسے حالات میں بڑا مزہ اور excitement کا موقع مل رہا تھا لیکن وہ موچی

دروازے والے رشتے داروں سے ڈرتی بھی تھی۔ اس لیے تمام معاملے کو چوری

چھپے نبھانے کے درپے تھی۔

جس وقت افتخار کو لینے ایئر پورٹ پہنچا کراچی جانے والی سواریاں انکوائری سے

لے کر اندر جانے والے چھوٹے دروازے تک بھری پڑی تھیں گولے کے ہار پہنے

ہوئے پردیسی اور ان کی برقعہ پوش دار عورتیں..... کراچی سے آنے والی سواریوں کو

خوش آمدید کہنے اور ساتھ لے جانے والے لوگ..... گرمی کے باوجود سمر سوٹ پہنے ہوئے بزنس مین فیشن ایبل لڑکیاں اور ٹینٹی بکس اٹھائے ہوئے عورتیں بیورو کریٹ اور ان کے سمسوناٹیٹ کے بیگ شلوار قمیض کے عوامی لباس میں نوجوانوں کا سر پھر ایک طبقہ..... یونیفارم میں ٹاکی پھیرنے والی عورتیں سیکوریٹی کے افسر، سفید وردیوں والے پائیلٹ ہری شلوار آتشی گلابی قمیض اور پرنٹ کے دوپٹوں میں اترتی ہوئی ایئر ہوسٹس، ائر پورٹ دیکھنے کا شوق رکھنے والے بچے نمائشی جسم دکھانے والی ڈپلپتلی لڑکیاں سب جگہ لوگ ہی لوگ تھے۔

ایئر ہوسٹس لڑکیاں ان شہروں کے متعلق سوچتی نظر آتی تھیں جہاں سے وہ ابھی آئی تھیں اور جہاں کے لیے انہیں ابھی روانہ ہونا تھا بیورو کریٹ حسب عادت بار بار گھڑی دیکھ کر سامان کے tags کے متعلق سوچ رہے تھے فائلنگ، گھریلو الجھنیں سفر کا شیڈول ان کے ذہن اور چہرے پر سوار تھا پائیلٹ سفید موروں کی طرح اتر اہٹ سے چل رہے تھے انہیں اپنی اہمیت کا احساس تھا کہ ان کے بغیر کوئی جہاز کہیں جانے کا اہل نہیں عورتوں کو گرمی لگ رہی تھی میک اپ کی تہہ تلے برقعوں کے اندر بیلٹ والی شلواروں میں پیڈ والی باڈوسوں کے اندر مردوں کو تھری پیس سوٹوں کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی پھنسی ہوئی ٹائی اور لاسک والے انڈروئیر کی وجہ سے کوٹ کی بگلوں کے نیچے اور کلائی پر بندھی ہوئی ٹین لیس سٹیل کی گھڑی تلے پسینہ آ رہا تھا سب جگہ لوگ تھے۔ ہر انسان کے ساتھ کچھ وقتی کچھ طبقاتی کچھ اس کی عمر کے حساب سے جکڑنے والے مسائل تھے کوئی آدمی آزاد نہ تھا۔

ان ہی میں ایک روشن بھی تھی جس جنگلے کے پار مسافروں کے سوائے اور کوئی نہیں جاتا وہاں روشن بھی تھی جنگلے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اس نے بڑھے ہوئے پیٹ کو چھپانے کے لیے ٹانے کی سفید چادر ایسے اوڑھ رکھی تھی کہ پیٹ اور بھی نمایاں ہو گیا تھا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ زرد تھا اور اب دونوں گالوں پر چھائیاں دھبوں کی

صورت نظر آتی تھیں۔

”میں نے پتہ کر لیا ہے فلائیٹ وقت پر آرہی ہے۔“ میں نے روشن کے قریب آکر کہا۔

وہ چپ رہی۔

”مبارک ہو۔“

اس نے نظریں جھکا لیں۔

”اب کیا ہوگا۔“

کچھ دیر کے بعد اس نے بغیر ٹکا ہیں اٹھائے کہا۔

”تم باہر چل کر ہوائی جہاز اترتے دیکھنا چاہتی ہو۔“

”نہیں جی باہر بہت گرمی ہے.....“ اس نے رومال سے اپنے ہونٹوں کے مالائی والا حصہ کو پونچھا۔

”اچھا تو یہیں انتظار کر لیں.....“

اس وقت انا ونسمنٹ ہوئی کہ کراچی سے آنے والا ڈی سی ٹن لینڈ کر گیا ہے ہم دونوں عمارت سے باہر نکلنے لگے۔

”اب کیا ہوگا جی؟.....“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر پھر کہا۔

میں نے سگریٹ سلگایا لمبا کش لیا اور کہا..... ”تمہارا نکاح ہوگا اور کیا ہوگا۔“

”ہاں جی وہ تو ٹھیک ہے پر.....“

ہم دونوں آہستہ آہستہ بیرونی راستے کی طرف چلنے لگے۔ وہ بار بار چہرہ پونچھ رہی تھی۔

”آپ کئی دن سے آئے نہیں.....؟“ روشن نے سوال کیا۔

”صبح میں ریڈیو سیشن چلا جاتا ہوں اور شام کو.....“ میں چپ ہو گیا۔

”اور شام کو؟۔“

”شام کو سائیں جی کی طرف۔“

میں نے روشنی کو یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ میں ہر روز باقاعدگی کے ساتھ سائیں جی کے پاس جاتا ہوں پھر سائیں جی مجھے ساتھ لیکر ٹیلوں کی اوٹ میں چلے جاتے ہیں وہاں سائیں جی کی قبر میں بیٹھ کر ہم دونوں گھنٹہ بھر پاس انفاس کرتے رہتے ہیں۔ پھر عشاء کی نماز کے بعد سائیں جی قبر میں بیٹھ کر تلاوت شروع کر دیتے ہیں اس وقت میں ان کے پاس نہیں پوتا۔ لیکن قبر کے دہانے پر بیٹھا پرہتا ہوں مجھے آخری سیڑھی پر بیٹھ کر خالی الذہن ہونے کی پریکٹس کرنی پڑتی ہے..... تہجد کے وقت تک مجھے جنگل کی طرف سے لاکھوں آوازیں آتی ہیں پھر فجر کے بعد اتنی خاموشی ہونے لگتی ہے کہ اپنے دل کی ڈھڑکن بھی گھڑی کی ٹک ٹک جیسی سنائی دیتی ہے سارے مسام کھڑے رہتے ہیں نتھنوں میں کئی قسم کی خوشبو آتی ہے اور لاگتا ہے کہ عین گدی کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ اپنے پھڑ پھڑا رہا ہے میں نے ان پروں کا ذکر سائیں جی سے کیا تو وہ بولے..... ”دیکھو بیٹا پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ دیوانے ہو جاؤ گے عموماً یہ موت کے پروں کی آواز ہوتی ہے اگت تم موت کے حضور خوف زدہ نہ ہو تو وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔“

”لیکن سائیں جی پروں کی آواز مجھے ذکر کرنے نہیں دیتی۔“

”تم کو معلوم نہیں اس وقت فرشتے آسمانوں سے اترتے ہیں کچھ فرشتوں کو رزق تقسیم کرنا ہوتا ہے..... کچھ فرشتے خوشیاں بانٹنے نکلتے ہیں کچھ اسرار درموز سکھانے آتے ہیں نسل انسانی کو حکمت الہی سے شناسا کرنے بھی کئی یہاں آتے ہیں موت کا فرشتہ اپنی سواریوں کو تکتے کے لیے نکلتا ہے تم کو مڑ کر نہیں دیکھنا ورنہ ختم ہو جاؤ گے۔“

”اچھا سائیں جی.....“ ان باتوں کا ملکا قاتوں کا ذکر روشن سے بالکل بیکار ہے وہ مجھ سے ایک قدم پیچھے چل رہی تھی۔

ہم دونوں ادھر آگے جہاں ٹیکسی سٹینڈ ہے اور کراچی آنے والی سواریاں اترتی

ہیں چونکہ ڈی سی ٹن آیا تھا اس لیے سواریاں میلے کی طرح اتریں بہت انتظار کے بعد سامان پہنچا اور لوگ لدے پھندے رخصت ہونے لگے۔ دوہی مسقط کویت اور سعودی عرب سے آنے والے ماؤ لوگوں کا عجیب عالم تھا ان کے ہاتھوں میں ریڈیو ٹیپ ریکارڈر گلے میں کیمرے جسم پر فرنگی جیکٹیں، بازوؤں سے لٹکتی ترمیس اور خوبصورت کمبل کلائی پر کئی کئی گھڑیاں تھیں وہ باہر کے ملکوں میں کام کرنے کی وجہ سے خود اعتمادی کا ڈھیر نظر آتے تھے اور انہیں اپنے رشتہ دار خوشامدیوں کی طرح آگے بڑھ بڑھ کر سلام کر رہے تھے۔

بہت بعد میں افتخار آیا۔ وہ بھی جلد پلٹ لوگوں کی طرح سامان سے لدا ہوا تھا۔ جب وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے اس کے ہاتھ سے تھرموس پکڑ لی اور کیمرہ اس نے روشن کے گلے میں لٹکا دیا وہ بہت خوش تھا۔

”آپ نے بہت تکلیف کی..... میں خود پہنچ جاتا۔“

”کوئی بات نہیں۔“

روشن اور میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور وہ ہم دونوں سے کچھ ہڑ کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا جس وقت میں ٹیکسی والے سے جھگڑا کرنے لگا تو افتخار نے فوراً مدافعت کی..... ”کتنے پیسے مانگ رہا ہے۔؟“

”یہ ساتھ گلبرگ ہے اور یہ بیس روپے مانگ رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں سر کل چھ سات ریال کی تو بات ہے چلیں۔“

میں شرمندہ ہو گیا۔ ہم تینوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے وہ میرے اور روشن کے قانونی رشتے کو مد نظر رکھ کر آگے بیٹھا..... سارے راستے ایک بار بھی اس نے روشن کی طرف نہیں دیکھا۔ بلکہ پیچھے منہ کر کے صرف مجھ سے باتیں کرتا رہا۔

”میچ ریکارڈ میں اپنے چھوٹے بھائی کے لیے لایا ہوں اس نے مجھے کئی خط لکھے

تھے..... یہ دیکھئے بالکل Latest فیشن ہے Stero ہے میں نے کہا ایک بار لے

جانا ہے اچھا لے جانا چاہیے قیمت کی میں نے کبھی پروا نہیں کی..... یہاں تر موس کی کیا قیمت ہے۔“

میں نے اندازے سے تر موس کی قیمت بتائی۔

”مجھے تو اسی ریال میں ملی..... یہ دیکھئے..... ایسے پانی نکلتا ہے“ اس کے کہنے پر..... میں نے تر موس کی مکینکل ٹوٹی دبا کر دیکھی۔

”پہلے میں یوشیکا کا کیمرہ لانے لگا تھا۔ پھر خیال آیا پولورائیزڈ ٹھیک ہے فٹ تصویر کھینچو فٹ تیار ہو جائے۔ آپ ایسے ہی رہیں میں آپ کو دیکھاتا ہوں ابھی۔“ اس نے روشن کے گلے سے کیمرہ اتار کر چلتی گاڑی میں تصویر کھینچی۔ تصویر کیمرہ سے نکلتے ہی تیار تھی آہستہ آہستہ اس کے رنگ گہرے ہونے لگے۔ پھر اس نے وہ تصویر مجھے پکڑادی۔

شادی کے بعد روشن کے ساتھ یہ میری پہلی فوٹو تھی۔

تصویر میں روشن گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔

”سمال ہے.....“ میں نے حیرت سے کہا..... ”ابھی تصویر کھینچی اور فوراً کیمرے میں ہی Develop بھی ہوگئی۔“

”اب تو جی جدے سارے لوگ Instant کیمرہ خریدتے ہیں یہاں پر اس کا نیگٹو مل جائے گا۔“

”معلوم کرنا پڑے گا..... شاید ملتا ہو..... شاید نہ ملتا ہو.....“ میں نے لجاجت سے کہا۔

گھر پہنچ کر ہم دونوں سعودی عرب کی دولت، بیرونی ممالک سے اس کے سیاسی تعلقات، پاکستان کی اور جدہ کی قیمتوں کا موازنہ مغربی کلچر کا اسلامی ممالک میں انتراح اسلامی قدروں کی بے حرمتی اسرائیل کی ویسٹ بنک کے معاملے میں ڈھٹائی اور پی ایل او کی باتیں دیر تک کرتے رہے۔ پھوپھی جان خصوصاً گلبرگی

خاتون تھیں اور چٹی ان پڑھ تھیں محض اپنی دولت کی وجہ سے گفتگو میں شریک رہیں
روشن سارا وقت خاموش تھی۔

شام کی چائے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو سب چپ ہو گئے۔

”پھر اب؟.....“ نو جوان پلی پلائی پھوپھی نے سوال کیا۔

روشن نے لحظہ بھر کو نگاہیں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

”اب تو مجھے فاروق صاحب سے بات کرنا پڑے گی.....“ پھوپھی بولی۔

”تو ابھی تک آپ نے ان سے بات نہیں کی.....“ افتخار نے خوفزدہ ہو کر سوال

کیا۔

”نہیں کی تو ہے..... کی تو ہے..... لیکن اب پوری طرح

arrangement کرنی پڑے گی ناں؟“

”اگر کسی نے مجھے ایئر پورٹ پر دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی.....“ افتخار نے

ناک میں انگلی پھیر کر کہا۔

”نہیں کل ہی سب کچھ ہو جانا چاہیے..... پھوپھی نے اپنے سونے کے چوڑے

پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا..... کیوں قیوم؟“

”جیسے آپ کہیں۔“

میں کئی دنوں سے جانتا تھا کہ افتخار روشن کو لے جانے کے لیے آرہا ہے لیکن پھر

بھی مجھے محسوس ہوا کہ سب کچھ بہت آناً فاناً ہو رہا ہے۔

”آپ کسی وکیل سے مل کر طلاق کے قانونی کاغذ تیار کروالیں۔ ایک دو دن

میں۔“

یکدم روشن کا چہرہ پہلے سے زیادہ پیلا ہو گیا اور اس کی چھائیاں نمایاں ہو کر

چہرے پر پھیل گئیں۔

”دیکھئے ناں قیوم صاحب..... یہ بہت بڑا قدم اٹھا رہی ہے روشن..... ہمارے

خاندان میں پہلے ایسے کبھی نہیں ہوا اگر موچی دروازے یہ خبر پہنچ گئی تو کہرام مچ جائے گا روشن کی ماں تو زہر کھالے گی۔“

”اس وقت میں روشن کا ضامن ہوں..... میرا خیال ہے کوئی اور صورت ممکن نہیں“

”پھر بھی بھائی مختار بات نہ نکلے.....“ اس نے افتخار کو مخاطب کر کے کہا۔
”دیکھئے میں تو آپ کے پاس ہوں آپ چاہے زنجے پاؤں میں ڈال کر مجھے باندھ رکھیں باقی قیوم صاحب مالک ہیں..... یہ اگر کسی سے بات کرنا چاہیں تو میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔“

”آپ ان کی طرف سے بے فکر رہیں“ پہلی بار روشن نے جواب دیا۔
جب نکاح کی تفصیلات طے پا گئیں تو یکدم روشن کی پھوپھی بولیں..... لیکن روشن ایک لاجھن میری بھی ہے..... میں نے تمہاری دل و جان سے مدد کی ہے تم تو جدہ میں آرام کرو گی عیش کرو گی گھر والوں سے مجھے ہی بھگتنا پڑے گا..... تمہارے بعد۔

روشن کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔
”آپ فرمائیں آپ کی کیا لاجھن ہے..... آپ کی لاجھن کو بھی ہم خلاص کریں گے۔“ افتخار نے کہا۔

”بس جس وقت نکاح ہو جائے افتخار اپنے گھر چلا جائے اور روشن قیوم کے ساتھ چلی جائے کسی کو علم نہ ہو کہ نکاح میرے گھر میں ہوا ہے.....“ پھوپھی نے چہرے کو کاغذی رومال سے پونچھ کر کہا۔

”لیکن کبھی نہ کبھی تو یہ بھید کھلے گا.....“ افتخار بولا۔
”ہاں کبھی نہ کبھی تو ٹھیک ہے لیکن جب تک روشن پاکستان میں ہے یہ بات نہیں کھلنی چاہیے۔“

”میں قیوم صاحب کے ساتھ چلی جاؤں گی.....“ روشن نے مری ہوئی آواز میں کہا..... ”کیوں قیوم صاحب؟“

”تھیک ہے..... بالکل۔“

”خلاص..... خلاص..... اب کل تک یہ ٹاپک بند.....“ افتخار نے خوش دلی سے کہا۔

ساتھ ہی اس نے اپنی کلائی سے بندھی ہوئی چھ گھڑیوں میں سے ایک گھڑی اتار کر میری طرف بڑھائی..... ”قیوم صاحب یہ گھڑی باند لیں Digital گھڑی ہے سر بالکل نیوڈیزائن کی۔“

”مجھے گھڑی کی ضرورت نہیں..... یہ دیکھئے یہ بندھی ہوئی ہے..... شکریہ“

میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر جدہ ایئر پورٹ کی باتیں سنتا رہا..... اور پھر رخصت ہو گیا۔

سائیں جی اس روز ڈیرے پر موجود نہیں تھے۔ میں بھی جانتا تھا کہ مغرب کے بعد وہ کہاں ہوتے ہیں کئی دن سے میں ٹوٹا ٹوٹا بکھرا ہوا ان کے پاس پہنچتا قبر میں بیٹھ کر پاس انفاس کے وقت مجھ سے کئی غلطیاں ہو جاتیں لیکن سائیں جی جھڑکنے والے آدمی نہ تھے وہ مجھے شاید مابعد کا سچا مالک سمجھ کر میری رہبری کر رہے تھے لیکن میں تمام تر موت کے شکنجے میں تھا میرے..... تمام خواب جاگتے کی سوچیں میرے خیالی خواب موت کے متعلق ہوتے کبھی کبھیں موت سے اس درجی خائف ہو جاتا کہ بیٹھے بیٹھے میرا سرا وجود پسینے میں بھیگ جاتا اور میری پتلیاں خوف سے گھومنے لگتیں میں نے ریڈیو سٹیشن پر اچانک استعفیٰ داخل کر دیا تھا۔ اب مجھ سے موٹر سائیکل نہ چلتی تھی مجھے لگتا تھا کہ اگلے موٹر پر اچانک میں کسی بس ٹیکسی یا کار سے بھڑ جاؤں گا روشن کو لاق سینے کے بعد بھی اس کا تمام سامان میرے گھر میں موجود تھا

بھائی مختار اور صولت بھابھی کچھ نہ جانتے تھے روشن کے گھر والوں کو معلوم نہ تھا کہ ان کی بیٹی کو طلاق ہو گئی ہے

اس روز سائیں جی کے پاس پہنچتے پہنچتے میرا سانس اکھڑا ہوا تھا۔
”آ جاؤ اندر.....“ قبر میں سے آواز آئی۔

سیڑھیوں کے باہر جوتیاں اتار کر میں اندر چلا گیا اگر جی کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک اور باریش بزرگ سائیں کے پاس بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے اس نورانی بزرگ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

آج سائیں جی جسم اور روح کے اعتبار سے بہت چھوٹے لگ رہے تھے۔
موت سے بہت ڈرتے ہو؟..... نئے باریش بزرگ نے سوال کیا۔
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”فنا کے بغیر بقا کے آرزو مند ہو؟.....“
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”موت انسان کی محسن ہے..... نہ تو اس زندگی کو کتنی پائیداری ہوتی جس میں حزن و ملال کے سوا کچھ نہیں.....“ نورانی بزرگ بولے
”جی.....“

سفید ریش والے بزرگ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔
”ہمجارے ساتھ چلو گے؟“

میں نے اپنے سائیں جی کی طرف دیکھا وہ آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔
”کہاں جی؟.....“ میں نے سوال کیا۔

”کہاں پوچھنے والا تیار نہیں ہوتا..... باہر چل کر بیٹھو.....“

”جاؤ.....“ سائیں جی نے آہستہ آہستہ سے کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔
میں عشاء کی نماز تک باہر بیٹھا رہا لیکن قبر کے اندر سے کوئی آواز نہ آئی پھر جنگل

کی طرف سے گیدڑوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ اور جب آسمان پر ٹیڑی بولی
تو قبر سے آواز آئی۔

”یہاں آؤ۔“

میں ڈرتا اندر چلا گیا۔

سائیں جی اکیلے بیٹھے تھے قبر میں سوندھی مٹی کی خوشبو تھی اور اکلوتی موم بتی میں
سائیں جی کے تین سائے دیوار پر پڑ رہے تھے۔

”بیٹھو.....“

میں دو زانو بیٹھ گیا۔

”آج تم نے بہت بڑا موقع گنوا دیا پیر و مرشد کے ساتھ چلے جاتے تو عاقبت
سنور جاتی۔“

”میں ڈر گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے..... اب اگلی جمعرات کو یہیں اس لڑکی کا دیدار ہوگا جس کا تم نے
ذکر کیا ہے اگر چوک گئے تو ساری عمر کے لیے مجذب ہو جاؤں گے حواس قائم رکھے تو
اس سے فیض حاصل ہوگا..... تیار ہو.....“

”جی تیار ہوں۔“

”دیکھ لو عرفان اور دیوانگی میں بس ایک حواس کا فرق ہوتا ہے..... حواس قائم
رہیں تو عرفان ندر ہیں تو دیوانگی تیر ہو۔“

”جی تیار ہوں۔“

نکاح بہت خاموشی کے ساتھ ہوا اس کے بعد افتخار اپنے گھر موچی چلا گیا۔ اور
روشن میرے ساتھ ساندہ کلاں آگئی۔ وہ اور میں سارا رستہ خاموش رہے۔ گھر پہنچتے
ہی اسے قے شروع ہو گئی بار بار وہ غسل خانے جاتی اور واپس آخر نڈھال لیٹ

جاتی۔ میں بھابھی صولت کو اس کی حالت کی متعلق کچھ بنانا چاہتا تھا۔ میں روشن کو بتائے بغیر ڈاکٹر سے دوا لینے چلا گیا۔

پھر ہم دونوں فروغی کے علاوہ کوئی بات نہ ہوئی۔ کچھ ویزے اور پاسپورٹ کی باتیں سامان چھوڑنے اور رکھنے کے امور کچھ بدنامی کے خدشات کبھی کبھی ماں باپ اور پاکستان چھوڑنے کا غم زیرہ ذکر رہا۔ لیکن قفل دونوں طرف سخت لگا تھا۔ دوسرے دن مغرب کے وقت روشن کو افتخار کے ساتھ جدہ روانہ ہونا تھا اپنے گھر والوں سے افتخار نے جدہ واپس جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میرے گھر میں سوائے میرے اس حقیقت سے کوئی آگاہ نہیں تھا۔

یہ روشن کی میرے گھر میں آخری رات تھی ہم دونوں کے پانگوں میں ڈیڈھنٹ کا فاصلہ تھا لیکن وہ اور میں دم سادھ چپ کیٹے تھے پتہ نہیں کیا سوچتے ہوئے مجھے نیند آگئی پھر مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے بازو پر برف کی قاش رکھ دی۔ میں نے آنکھیں کھولیں روشن میرے پلنگ پر بیٹھی تھی اس کا بھاری پیٹ اس کی گود میں تھا اور ٹھنڈی انگلیاں میرے بازو پر تھیں۔

”کیا بات ہے روشن؟“

”میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی..... شاید کل وقت نہ ملے۔“

آنسو اس کی آنکھوں سے بلا تکان گر رہے تھے۔

”آپ بڑے اچھے آدمی ہیں اگر آپ میرے بچے کو قبول کر لیتے تو..... تو میں

یہاں سے کبھی نہ جاتی۔“

زندگی میں پہلی بار ایک ٹھنڈا جھونکا میرے بند دل میں گھس آیا۔

”تم..... تم یہاں رہنا چاہتی ہو میرے پاس۔“

”آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں۔ آپ نے مجھے سب کچھ دیا اور پلٹ کر

کچھ بھی نہیں مانگا.....؟“

”صرف احسانات؟.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

یکدم اس کی آنکھوں کے جھر نے بند ہوئے۔

”اگر..... اگر میں تم کو نہ جانے دوں روشن تو..... تو افتخار کو بھلا سکو گی؟“

اس نے نظریں جھکا لیں..... ”جی نہیں..... یہ ممکن نہیں۔“

میں نے آخری بار کسی کو زخم عطا کرنے کی کوشش کی اور نا کام رہا۔

”پھر یہاں رہنے کا فائدہ؟ حاصل یہاں رہنے سے۔“

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟..... دیکھنا..... دیکھیے ناں میں یہاں رہ سکتی ہوں

ساری عمر آپ کے پاس..... لیکن افتخار کو نہیں بھلا سکتی حالانکہ..... وہ آپ کی جوتیاں

جیسا بھی نہیں۔“

میں نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی گندے نالے کی متعفن ہوا کے کی طرح میرے

جڑے پر پڑی اور گزر گئی۔

”سوجاؤ..... یہ باتیں فضول ہیں..... ایسی باتوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔“

کچھ سڑکیں جب شہر سے باہر نکلتی ہیں تو کافی فاصلے تک چکی اور مضبوط نظر آتی

ہیں۔ پھر ان کے کنارے بھرے بھرے ہونے لگتے ہیں جا بجا گڈھے نظر آتے ہیں

اور پکی سڑک کچے راستے بدل جاتی ہے ایسا راستہ جو بارش میں کیچڑ اور دلدل میں

بدل جاتا ہے کچھ دور جا کر یہ کچا راستہ جھاڑیوں میں کھیتوں کے دہانے پر ختم ہو جاتا

ہے یہ سڑکیں کسی گھر کسی شہر کسی محلے کو نہیں جاتیں بس یوں ہی شہر چھوڑ کر دم سا چھوڑ

دیتی ہیں۔

میں بھی ایک ایسی ہی سڑک تھا۔ شادی سے نکل کر نہ جانے مجھے کہاں جانا تھا؟

اس وقت مجھے روشن میں سیمی، عابدہ، امتل اور جانے کون کون نظر آ رہا تھا سامنے بیٹھی

ہوئی گا بھن عورت سے میری کوئی جان پہچان نہ تھی ساری عمر میں نے عورتوں کے

ادھ کھلے دروازوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندروالوں نے کبھی آواز دے

کرنہ بلایا۔

”آپ کیا سوچتے ہوں گے۔“ روشن بالآخر بولی۔

”میں کچھ نہیں سوچتا روشن..... کبھی کبھی صرف اتنا کہ کاش تم نے مجھے ایک رات دھوکے میں رہنے دیا ہوتا..... کاش صرف ایک رات کے لیے کسی کا جسم کسی کا دل ایک وقت میں میرا ہوتا۔“

”آپ رو رہے ہیں جی؟“

روشن نے اپنا دوپٹہ اٹھا کر میری گال سے لگا دیا۔

”میں کیا کرتی جی میرا دل کا ہے۔ میرا جسم میں اس کی روح پل رہی ہے میں آپ سے کیسے جھوٹ بولتی۔“

مجھے اہل نے یہ نہیں بتایا تھا کہ باکرہ لڑکی ذہنی طور پر باعصمت ہی نہیں ہوتی۔ سچی بھی ہوتی ہے کاش اس نے صرف ایک رات کے لیے مجھے جھوٹ کی زندگی بسر کرنے دی ہوتی۔

”میں..... آپ جیسے اچھے انسان کو کیسے اتنا بڑا..... فریب دے سکتی تھی؟.....“

وہ چپ ہو کر اپنے پلنگ پر جا بیٹھی۔

میں نے تکتے پر سر ڈال دیا لیکن نہ میں ساری رات سویا نہ اس نے آنکھ بند کی چونکہ ہم میں قانوناً اور شرعاً کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے ہم انسانی کشش کے تحت ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ جیسے کسی جہاز کے باسی جہاز برو ہونے کے بعد کسی جزیرے میں رہنے لگیں اور نسل قوم مذہب کی تمام زنجیریں ٹوٹ کر انہیں نئے رشتوں میں پروئے لگیں۔

میں نے اسے آہستہ آہستہ اپنے گاؤں کے متعلق بتایا کیسے چندرا کی آبادی کلر کے ہاتھوں بے آباد ہوئی کیتوں کھلیانوں کی سفیدی کیسے ہریاول چاٹ گئی۔ اور ڈھور ڈنگر انسان سب چندرا چھوڑ کر چلے گئے پھر میں..... اسے عزیز گاتن کے متعلق

اس کی ماں کی زندگی کے متعلق ایسی تفصیل سے باتیں سنانے لگا کہ میں خود حیران رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے وہ تفصیلات معلوم ہیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے روشن..... کیا بد دعا سے بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔“

”ہاں جی..... اجڑ جاتی ہیں۔“

پہلی بار روشن سے بات کرنا بہت آسان تھا وہ پہلو کے بل کہنی ٹیک کر اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کا پیٹ تہہ کیے ہوئے تکیے کی طرح اس کے سینے کی طرف جڑھا ہوا تھا۔

”میں ایک دفعہ سکول سے لوٹی تو میری باجی ایک خط پڑھ رہی تھیں۔ میں نے خط کے متعلق پوچھا تو انہوں نے مجھے نہ بتایا بلکہ خط چھپا دیا..... کبھی کبھی کتنا تجسس پیدا ہو جاتا ہے انسان میں..... بھلا مجھے کیا ملنا تھا خط سے..... لیکن آخر میں نے خط تلاش کیا اور پڑھا..... وہ خط میرے خالو کا تھا..... وہ خط ایسا تھا جو انہیں باجی کو لکھنا نہیں چاہیے تھا..... مجھے خط پڑھنے کے بعد اسے وہیں چھپانا چاہیے تھا..... باجی جانتی اس کا کام جانتا..... لیکن میں نے خط پکڑ کر امی کو دے دیا..... امی نے ابو کو بتایا..... ابو نے خالو کو طلب کیا..... باجی بے چاری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دھری گئی..... دیکھتے دیکھتے اس کا نکاح کر دیا گیا۔ جس روز وہ رخصت ہوئی ہے مجھے کبھی وہ دن نہیں بھولتا..... باجی میرے کمرے میں آئی اور بولی..... کاش کبھاء تیرے ساتھ بھی ایسا ہو..... تو بھی شادی کہیں کرنا چاہے ہو کہیں جائے..... میں نے ڈرتے ڈرتے کہا تو کیا آپ خالو جان سے شادی کرنا چاہتی تھیں؟“

”خالو جان گئے بھاڑ میں..... مجھے ان سے کیا لینا ہے؟..... جہاں بھی میں چاہتی تھی وہاں تو تو نے نہیں ہونے دی ناں کم بخت!..... اللہ تجھے بدلہ دے..... آپ کا کیا خیال ہے..... دو بہن کی بد دعا زیادہ لگتی ہے کہ کنواری کی.....؟“

ہم دونوں کافی دیر تک ایسے ہی سوال ایک دوسرے سے پوچھتے رہے پھر میں

نے اسے اپنی ماں کی موت کے متعلق بتایا..... یسی کا سرا واقعہ سنایا، اتل کے قتل کی داستان سنائی..... لیکن ابا کے متعلق میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا..... میں اپنے بابا گدھ کی یادوں کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا تھا..... مجھے لگتا کہ اس کی گمشدگی یا موت میری اپنی گمشدگی ہے میں اس کے ساتھ ہی کہیں کھو گیا تھا کہیں ختم ہو گیا تھا۔

آخری بار جب میں نے ابا کو دیکھا وہ تیسری منزل پر اس مٹی کے پاس کھڑا تھا جس میں سے کبھی دھواں نکلتا تھا۔

کیا وہ عشق لا حاصل سے دیوانہ ہوا؟..... کیا وہ چا چا غلام کے ساتھ مل کر رزق حرام کھانے کا مرتکب ہوا؟..... کیا اسے موت کے انتظار نے پاگل کیا؟

ایئر پورٹ پر افتخار موجود تھا روشن کاسوٹ کیس اٹھائے ہم دونوں اس کے پاس پہنچے۔ اس وقت اس نے سادہ شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور اس کے جسم پر کوئی سامان نہ تھا اناؤنسمنٹ سے پہلے ہی وہ دونوں ادھر چلے جانا چاہتے تھے۔ کیونکہ کسی نہ کسی واقف کے مل کانے کا خطرہ تھا۔

جنگلے کے پاس پہنچ کر افتخار نے سادگی اور خلوص سے ہاتھ ملایا اور بولا

”آپ نے میری بہت مدد کی ہے سر..... میں آپ کا شکر گزار ہوں..... کوئی اور ہوتا تو.....“

وہ چپ ہو گیا سعودی عرب کی کمائیاں جدے کے بازار پر دیس کی ایک اور Frequency کی اندگی اس کے دل کو مکمل طور پر مجبور نہ کر سکی تھی۔

”اگر آپ..... عمرہ کرنا چاہیں تو جی خادم کے پاس رہیں ڈیڈھ گھنٹے کا تو راستہ ہے جدہ سے..... بڑی اچھی ایئر کنڈیشنڈ بس چلتی ہے الشریکہ العربیہ القتل راستے میں صرف ایک بار رکتی ہے میں ٹکٹ بیچھ دوں گا آپ ٹکٹ کی فکر نہ کریں آپ بس آنے کا ارادہ کریں۔“

روشن چپ تھی اس کا چہرہ آج سو جا ہوا تھا اور چھائیاں گہری لگ رہی تھیں
”انشاء اللہ.....“ بہت آہستہ روشن بولی۔

”انشاء اللہ.....“ میں نے اس سے بھی آہستہ کہا۔

”میں تو مہینے میں ایک دو عمرے کھڑکا لیتا ہوں..... آپ ضرور آئیں یہ میرا ایڈریس
ہے..... آپ صرف مجھے لکھ دیں..... کب آنا چاہتے ہیں ٹکٹ پہنچ جائے گی۔
میرے پاس دو کمروں کا گھر ہے غسل خانہ سادی زندگی ہے آپ enjoy کریں
گے۔“

”اچھا۔“

اندر جانے سے پہلے افتخار نے مجھے جھپی ڈالی اور میرے کندھے کرچوم کر بولا
”مجھے بڑا افسوس ہے سر لیکن.....“

اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ روشن کابیگ اٹھا کر جلدی سے
جنگلے کے اس پار چلا گیا۔

روشن کھڑکی رہی کچھ لمحے کچھ سیکنڈ متذبذب حیران..... دکھ میں بھیگی ہوئی۔
ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہمیں کیسے ایک دوسرے کو الوداع کہنی چاہیئے پھر وہ اندر کی
طرف مڑی اور پلٹی..... یکدم ہم دونوں بغل گیر ہو گئے اس کا پیٹ درمیان میں حائل
نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے ہونٹ اس کے سر پر پیوست کر دیے اور اس کے آنسو میری
قمیض میں جذب ہونے لگے۔

یہ کل دس بارہ سیکنڈ کا واقعہ ہوگا۔ لیکن اس کے جسم کا قرب عرصہ تم کیرے ساتھ رہا
میرے ہونٹ اس کے سر کو کتنی ہی دیر چومتے رہے شاید میں بھی ہوائی جہاز کی
سیڑھیوں پر اس کے ساتھ تھا۔

پھر اس نے آخری بار ہاتھ ہلایا ہوئی جہاز کے پیٹ میں گھس گئی۔ اس کے بعد
افتخار نے اپنی اور اس کی سیٹ تلاش کی ہوگی اسے کھڑکی کی جانب بٹھایا ہوگا۔ اس

کے پیٹ کا خیال کر کے بلٹ باندھی ہوگی۔ شاید اس کی کھڑکی سے جنگلے کے ساتھ کھڑے لوگوں کا ہجوم بھی نظر آ رہا ہوگا۔ لیکن اب افتخار کا بالوں بھرا بازو انیر ہوٹس کی اناؤنسمنٹ کے بعد آخری سگریٹ بجھاتے ہوئے اسے چھو رہا ہوگا۔ پلین کے اندر سندھی نوک میوزک سنتے ہوئے تمام مسافر ہوا کے لیے بنائے ہوئے Setducts کر رہے ہوں گے۔ افتخار نے بھی ہوا کا رخ روشن کی طرف کر دیا ہوگا۔

ٹھنڈی ہوا..... افتخار نئی منزل..... ہمیشہ ٹھنڈی ہوا کا تازہ جھونکا..... ایک نئی منزل کی ایئر ٹکٹ..... زخم کتنی جلدی مندمل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ اور پھر یہ تو کوئی زخم نہ تھا!

انیر پورٹ سے مجھے سیدھے سائیں جی طرف جانا تھا..... طے تھا کہ اس جمعرات کو میں سیسی سے ملوں گا..... سائیں جی دو دن پہلے سارا معاملہ طے کر چکے تھے اور وہ مجھ سے ملنے پر رضامند تھی مجھے اس سے ملنے پر صرف ایک سوال پوچھنا تھا اس سوال کو میں کئی طور پر ذہن میں ترتیب دے چکا تھا..... ”سیسی! اب تو تم مجھے اور آفتاب کو بہتر طور پر جانتی ہو تاؤ اگر اب تمہیں ہم دونوں میں سے کسی کو پسند کرنا ہو تو کسے منتخب کرو گی؟“

جس وقت میں سائیں جی کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا اندر ہی اندر میں سیسی کے جواب سے خوفزدہ تھا کیا وہ اسی طرح نیلی جینز پہن کر بازو پر کینوس کا تھیلا لٹکائے آئے گی؟ کیا اب اس کا جواب وہی ہوگا جو زندگی میں تھا کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ شاید مصری عورتوں کے احرام کی طرح وہ ایک سفید لبادے میں ہوگی سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی اور چہ..... شاید وہ میرے سوال کا جواب دینا پسند نہ کرے؟

سائیں جی کے ڈیرے پر مکمل خاموشی تھی اندر باہر کوئی نہ تھا صرف مغرب کی نماز کے بعد کا اندھیرا ساری جگہ چھایا تھا دیرے سے پار سائیں جی کی قبر اب مجھے بلا

رہی تھی میں آہستہ آہستہ ادھر چلنے لگا ایک بات بار بار دل میں آڑی تھی جسے میں دہانا چاہتا تھا۔ اگر سب سے وہی جواب دیا جو وہ زندگی بھر دیتی آئی تھی پھر؟

جس وقت میں سائیں جی کی قبر سے کچھ فرلانگ دور پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ اس طرف سے کچھ لوگ آ رہے ہیں یہ لوگ ٹکڑیوں میں چپ چاپ میرے پاس سے گزرتے گئے میں نے کسی کو سلام نہ کیا، نہ ہی کوئی مجھ سے مخاطب ہوا..... اندھیرے میں کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ سب کون ہیں سائیں جی کی قبر سے کوئی ادھار فرلانگ ادھر بالکل خاموشی چھا گئی یہ جگہ ہمیشہ سے ایسی تھی لیکن تب مجھے اسی خاموشی سے خوف آنے لگا اونچے اونچے ٹیلے پر آنے زمانے کے ایسے جانوروں سے مشابہ نظر آئے جواب صفحہ ہستی پر موجود نہیں ہیں۔

جس وقر میں قبر کے پاس پہنچا تو ایک کتے نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہیں دور بین کیا۔

قبر کے اند کو دھنسی ہوئی تھی اور نیچے اترنے والی سیڑھیاں غائب تھیں قبر کے اوپر تازہ مٹی کا دھیر تھا میں نے قبر کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ اندر جانے کے تمام راستے مسدود تھے اور قبر ایسے لگتی تھی جیسے ابھی ابھی بنائی گئی ہو۔ پھر قریب ہی سے کہیں سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے غور سے دیکھا ایک جھاڑی کے پاس سائیں جی کا کاص مرید منہ پر ہاتھ رکھے رونے کی آواز روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ..... قبر کو کیا ہوا اللہ دتے؟“ میں نے پاس جا کر پوچھا۔

”بند ہو گئی.....“

”کیسے کیسے؟“

”سائیں جی کل شام اندر عصر کی نماز پڑھ رہے تھے..... قبر دھنس گئی..... ہم نے..... ہم نے اسے کھولا نہیں غائبانہ نماز جنازہ پڑھا دی یہی حکم تھا سائیں جی کا..... ایسے ہی فرما دیا تھا پیر مرشد نے..... انہیں تو وصال ہو گیا..... لیکن ہم کہاں

جائیں ہم کہاں جائیں سائیں جی..... کہاں جی کہاں۔“

مرید دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

مجھے یوں لگا تازہ قبر کی متی ایک بار پھر اندر کی طرف دھسنے لگی۔

”دیکھو..... قبر دھنس رہی ہے دھنس رہی ہے قبر.....“

مرید نے چیخ ماری اور ڈیر کے طرف بھاگنے لگا۔

میں چپ چاپ جھاڑی کے پاس بیٹھا ترہا قبر آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگی پھر مٹی اندر کی طرف دھسنے لگی اور تھوڑی دیر بعد جہاں پہلے قبر تھی وہاں ایک گڑھا پڑ گیا..... میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ اتنے میں آسمان پر ایک کالی گدھ تاروں بھرے آسمان پر لمبے لمبے چکر لگانے لگی آہستہ آہستہ..... پہلے وہ دائروں میں اترتی رہی پھر اس نے آتھ کے ہندسے جیسی اڑانیں اختیار کر لیں اندھیرا بہت ہو چکا تھا لیکن کالی گدھ صاف نظر آ رہی تھی دھنسی ہوئی قبر سے نگاہیں اٹھا کر میں نے غور سے اس کو دیکھنا شروع کیا۔

دور دور تک پھیلا ہوا تاروں بھرا آسمان اور ایک کالی گدھ جو پر اران میں نیچے اتر رہی تھی آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں فاسفورس جل رہی تھی دو ٹھنڈے ٹھنڈے بلب بغیر پر پھڑپھڑائے چہرہ نیچے کیے کالی گدھ دھنسی ہوئی قبر کی طرح اتر رہی تھی..... انچ انچ ملی میٹر..... آہستہ آہستہ۔

میں شہر کے مشہور سکائی ٹرسٹ کے کلنک سے باہر نکل رہا تھا کہ مجھے آفتاب سڑک پر نظر آیا وہ لمبی سیاہ کار سے اتر رہا تھا ہم دونوں بے ساختگی سے بغلگیر ہوئے..... اور درخت کے نیچے کھڑا ہو کر باتیں کرنے لگے۔ پھر یکدم جیسے آفتاب کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ بھاگ کر کارتک گیا پچھلا دروازہ کھول کر اس نے ایک دس سال کے بچے کو باہر نکالا بچہ سہا ہوا اور کمزور تھا اس کا سر باقی دھڑ سے اور آنکھیں چہرے سے بہت بری

تھیں آفتاب نے اسے بازو سے پکڑ کر سڑک کر اس کرانی اور پھر مجھ سے مکا طب ہو کر بولا..... ”میں ذرا سے ویٹنگ روم میں بٹھا آؤں تم مت جان..... پلیز۔“ جن آفتاب واپس لوٹا تو اس کا چہرہ پہلے سے بھی پریشان تھا۔
 ”کیا تم مستقل طور پر پاکستان آگئے ہو؟.....“ میں نے سوال کیا۔
 ”وہاں یا روہاں Hsndicaped بچے کے ساتھ گزارا مشکل تھا۔“
 ”کیا مطلب؟“

اس کے بیٹے میں کچھ ایسی بات تھی جسے دیکھ کر میں پہلے سے ہی گھبرا گیا تھا۔
 ”میرا بیٹا افرایم ذہنی طور پر کچھ نارمل نہیں ہے..... وہاں لندن میں میڈیکل سہولتیں تو بہت تھیں لیکن وہاں کی تعلیم کلچر..... رنگ و نسل کا امتیاز..... وہاں اتنی ساری Adjustment ایکل بچہ کیسے کر سکتا ہے۔“
 ”ہوا کیا ہے بچے کو.....“

”اسے کو اب آتے ہیں..... یہ..... عجیب عجیب کو اب دیکھتا ہے پہلے یہ موٹا تازہ تھا پھر..... ان خوابوں کی وجہ سے اس کا وزن گھٹنے لگا..... آدھا آدھا گھنٹہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا رہتا..... ہے ڈاکٹر کہتے تھے کہ یہ Catatonic حالت ہے“
 آفتاب کی آواز اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

”افرایم کہا ہے کہ اس نے چاند کو دو ٹکڑے پوتے دیکھا ہے..... وہ اپنے آپ کو..... دنیا کا نجات دہندہ سمجھتا ہے..... کبھی کبھی وہ فر فر عربی بولنے لگتا ہے..... کبھی عبرانی میں باتیں کرتا ہے..... میں..... اس کے خوابوں سے تنگ آ گیا ہوں قیوم..... وہ کہتا ہے کوئی فرشتہ اسے پھل کھلانے آتا ہے۔“

تنے کے ساتھ آفتاب نے یوں ٹیک لگا لی جیسے جسم کا بوجھ اس کے لیے اٹھانا ناممکن ہو۔

”یہ سب کس چیز کی سزا ہے؟..... کیا مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے کیا میرے

باپ داد کے گناہ نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے۔“

کیا واقعی باپ داد کے گناہ Gene mutation کی صورت میں افرایم پر اثر انداز ہوئے تھے کیا اس کے آبا اجداد نے کیا آفتاب نے کبھی رزق حرام سے اپنے Genes کی ساخت کو اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ آنے والی نسلوں میں دیوانہ پن ظاہر ہونے لگا تھا؟

چھوٹا سا افرایم دیوانگی کو ورثے میں لایا تھا؟
وہ عشقِ لا حاصل کے نتیجے کے طور پر تو دیوانہ نہ ہوا تھا؟
جستجو کے آثار بھی اس کی دیوانگی کا باعث نہ تھے۔
پھر پھر؟

کیا موت کا خوف چھوٹے سے بچے کو ہوسکتا ہے؟
ہم دونوں خاموش کھڑے رہے۔

”یہ کس بات کی سزا ہے قیوم بتاؤ..... تم ہماری جماعت میں سب سے ذہین تھے
بتاؤ یہ کس جرم کی سزا مل رہی ہے مجھے؟“
ہم دونوں پھر خاموش ہو گئے۔

”تمہارا کیا خیال ہے کیا بد دعا میں اتنا اثر ہے.....“ آفتاب نے مجھ سے سوال کیا۔

”نہیں سیمی ایسی نہیں تھی.....“ میں نے اسے تسلی دی

اس وقت وہ زرد روٹڑ کا کلنک سے باہر نکلا اور برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑا ہو کر آسمان کو تنکے لگا اس کا چہرہ آنکھوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا اور سر جسم کے تناسب سے بہت بڑا تھا وہ چھوٹا سا لڑکا عجیب طور پر سیمی سے مشابہ تھا.....

”اب یہ اسی طرح کھڑا رہے گا آدھا گھٹنہ پونا گھٹنہ سارا دن۔“

میں نے آفتاب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا..... ”آفتاب جو لوگ

اپنے آپ کو نارمل سمجھتے ہیں انہیں دیوانگی سے بہت ڈر لگتا ہے..... میں بھی نارمل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ اس جسم کے ساتھ مادی زندگی بسر کرنے کا یہی آسن طریقہ ہے..... اسی لیے یہاں آتا ہوں کلنک پر..... لیکن دیوانگی نے انسانیت کو سب کچھ عطا کیا ہے..... ہر دیوانے آدمی نے..... دیوانگی کی ایک اور جہت ہے..... صرف ہم کو اس کا اور اک نہیں ہے..... جس طرح جسم کی بیماری سے ہم خوفزدہ ہوتے ہیں تو ہسپتال کو دوڑتے ہیں ڈاکٹروں کی طرف بھاگتے ہیں..... روح جب لنگڑی لولی ہوتی ہے تو ہم ایسے ہی خوف زدہ ہوتے ہیں حالانکہ جب روح Boundry کر اس کر جاتی ہے تو انسانیت کے لیے یہی دیوانہ پن رحمت بن جاتی ہے..... میں اس سارے دائرے پر گھوم چکا ہوں..... یقین مانو آفتاب..... ہر دیوانگی پاگل پن نہیں ہوتی نہیں ہوتی..... نہیں ہوتی ہر دیوانہ آدمی ننگ انسان نہیں ہوتا۔“

”تھینک یو تھینک یو..... تھینک یو۔“

”جس طرح بیماری موت کی وادی میں اترتی ہے..... جسم ریخت کا شکار ہو کہ اسرار کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے ایسے ہی دیوانگی..... انتہا کی ہو تو عرفان کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے پھر مادہ شکل میں بیکار ہو جاتا ہے..... تم اعتبار کرو تمہارا افرایم پاگل نہیں یہ ہے ایک اور سمت میں دیکھ سکتا ہے اس کی وہ کھڑکیاں کھل رہی ہیں..... جو عام صحت مکند نارمل آدمی میں بند ہوتی ہیں..... یہ دونوں ابروؤں کے درمیان میں سے دیکھ سکتا ہے تم اسے عرب کے صحراؤں میں لے جاؤ..... وہاں اس کے لیے بہت کچھ ہے..... اسے شیر سے مشابہ جبل النور کے سامنے لے جانا..... یہ تمہیں اس پہاڑ کو دیکھتے ہی وہ سب کچھ بتا دے گا..... جو کوئی ماہر نفسیات آج تک نہیں بتا سکا..... جو کوئی سائنس دان سوچ بھی نہیں سکا..... چاہو تو اسے رفتہ رفتہ سیڑھی سے اتار کر عام پاگل خانے میں..... ان پاگلوں کے ساتھ بند کر دینا جو مادی دنیا پر بوجھ ہیں

ہو سکے تو اسے..... اسے وہاں لے جانا جہاں لوہے کے ہم شکل پہاڑ ہیں سارے
 میں عصر کے وقت گلابی ہوا چلتی ہے..... خدا کے لیے یقین کرو جسم کی بیماری دو قسم کی
 ہوتی ہے ایک بیماری وہ ہے جو..... جسم کو لاغر ق نحیف کرتی ہے دوسری بیماری سے
 شفا یاب ہونے پر انسان دو گنا تندرست ہوتا ہے اور دیر تک تندرست رہتا ہے
 جیسے جسم میں تازہ خون شامل ہو گیا ہو..... دیوان پن بھی دو طور کا ہے یک پاگل پن
 کی وہ قسم ہے جس سے روح قلب دماغ سب کمزور ہوتے ہیں..... دوسرا دیوانہ ہن
 وہ ہے..... جس سے روح میں توانائی آتی ہے وہ ایک ہی جست میں کئی کئی منزلیں
 پار کرتی ہے..... خدا کے لیے مجھ پر یقین کرو..... تمہارے بیٹے کا دیوانہ دوسری قسم
 ہے..... میرا ایمان ہے۔“

اس وقت افرایم ہم دونوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد تھا
 آفتاب نے میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے کہا..... ”اسے دورہ پڑنے والا ہے میں جانتا
 ہوں۔“

”وہ دیکھئے ابو وہ دیکھے آپ کو گنبد نظر نہیں آتا..... آنٹی اقبال نے جو ساڑھی امی کو
 دی تھی اس کا رنگ کا..... Greenish blue..... ابو آپ کو نظر نہیں آتا وہ گنبد
 اس کے Done کے نیچے چودہ طاق ایک طرف..... اور..... وہ دیکھے ابو اکبوتر
 اڑ رہے ہیں مدینے کی سڑکوں پر لوگ بھاگ رہے ہیں اس گنبد کی طرف..... روسی
 امریکی..... افریقی..... اذان ہو رہی ہے ابو..... آپ کو لوگ بھاگتے ہوئے نظر نہیں
 آتے؟ کیا آپ واقعی اذان کی آواز نہیں سن سکتے..... وہ دیکھے..... چار موزن ایک
 وقت میں اذان دے رہے ہیں..... آپ نہیں سن سکتے کیا؟“

”یہ بچہ مدینے شریف گیا ہے؟“

آفتاب نے نفی میں سر ہلایا۔

”ہم لندن سے سیدھے یہاں آ رہے ہیں۔“

”وہ دیکھئے ابو وہ..... ابو..... دیکھیے کون اتر رہا ہے چاند سے؟“ ہم دونوں نے چاند کی طرف دیکھا عصر کے وقت کا پھیکا چاند آسمان پر گرم سم بیٹھا تھا جیسے افرایم نے اس کا کوئی بہت بڑا بھید فاش کر دیا ہو۔

اس وقت کنک کی عمارت کے پیچھے سے اذان کی آواز فیڈ ان ہونے لگی آفتاب نے جیب سے رو مال نکال کر اپنی آنکھوں پر دھسے لیا افرایم کچھ دیر کانپتا رہا اور پھر منہ کے بل سجدے میں گر گیا۔

افرایم خوابوں کی آخری سیڑھی پر سر بسجود تھا۔

میں پاگل پن کی پہلی اور اسفل ترین سیڑھی پر محبوب کھڑا تھا۔

اور ہم دونوں کے درمیان انسان کا مسئلہ ارتقاء کھنچی کمان کی مانند تناہو تھا انسان کو اینب نارمل سے سو پر نارمل تک پہنچنے کے لیے جانے ابھی کس کس منزل سے گزرنا ہے؟

ختم شد